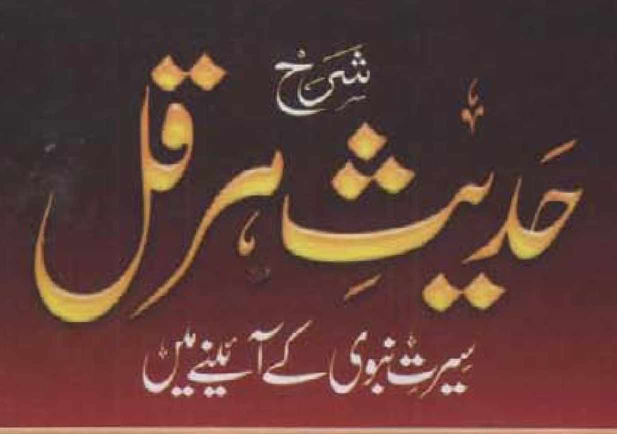


شرح

محدث العصر حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ

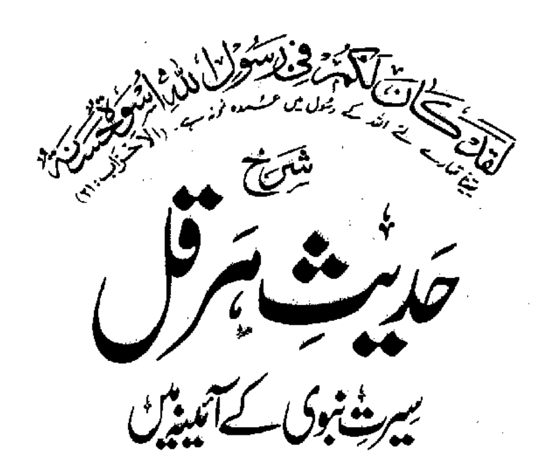
فضیلۃ الشیخ مولانا عبداللہ ناصر رحمانی حفظہ اللہ



تقدیم

فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ





شرح

محدث العصر حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ — فضیلۃ الشیخ عبداللہ ناصر رحمانی حفظہ اللہ

تقدیم

فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف





نام کتاب

شرح

حدیثِ ہرقل

سیرتِ نبوی ﷺ کے آئینہ میں

شرح

محدث العصر حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ

فضیلۃ الشیخ عبداللہ ناصر رحمانی حفظہ اللہ

تقدیم

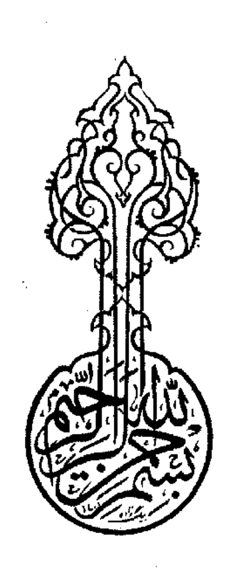
فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف



کمپوزنگ	محمد سفیان
طبع اول	مئی 2009ء
تعداد	1100
قیمت	

ناشر: ام القریٰ پبلی کیشنز

کمشنر روڈ فتو منڈ، گوجرانوالہ فون: 0333-8110896, 0321-6417723



فہرس

شرح حدیث ہرقل از محدث العصر حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

سیرت نبوی ایک ایسی دلآویز داستان ہے، جو اپنی رعنائی اور پہنائی کے ساتھ ساتھ پند و نصائح کا ایک حسین مرقع ہے، جس کا مطالعہ کرنے سے ایک طرف اگر عقائد و افکار کو جلا حاصل ہوتی ہے، تو دوسری طرف زندگی گزارنے کے لیے ایک متعین راہ اور قابلِ رشک سیرت و کردار کی طرف رہنمائی ملتی ہے، خصوصاً کسی مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر رشد و ہدایت کا کوئی اور نمونہ اور بدیل نہیں ہوسکتا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الأحزاب: ٢١]

''بلاشبہ یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ہمیشہ سے اچھا نمونہ ہے۔''

چنانچہ اسی اہمیت کے پیشِ نظر ابتدائے اسلام سے عصر حاضر تک سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اصحاب علم و قلم نے سیرت النبی جیسے کثیر الجہۃ موضوع پر دقائق و معارف سے پُر عظیم الشان قلمی ورثہ چھوڑا ہے، جس میں سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا اور ایک مثالی زندگی گزارنے کے لیے انتہائی مفید اور رہتی دنیا تک کار آمد تعلیمات کو اجاگر کیا گیا۔ جزاهم الله خير الجزاء۔

زیرِ نظر کتاب بھی اسی مبارک سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کے کردار کی عظمت اور سیرت کی رفعت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، لیکن اس کتاب کی انفرادیت اور امتیازی پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے کردار اور سیرت کی عظمت کی گواہی دینے والے دو سخت ترین دشمن اور کافر تھے، بلکہ أئمة الكفر!

جس سے سیرت نبوی کا اعجاز نمایاں طور پر ابھر کر ہمارے سامنے آتا اور ہمیں اپنے کردار اور اعمال کی اصلاح کی دعوت دیتا ہے۔

زیر نظر کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے:

۱۔ پہلا حصہ فضیلۃ الشیخ علامہ عبداللہ ناصر رحمانی ﷾ کی شرح وتفسیر پر مشتمل ہے، جو انہوں نے جامع مسجد اہلحدیث بوہرہ پیر کراچی میں جمعہ کے آٹھ خطبات میں بیان فرمائی، اس شرح کا سب سے امتیازی پہلو یہ ہے کہ ایک طرف اگر حدیث ہرقل میں مذکور نبی ﷺ کی صفات اور تعلیمات پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے، تو دوسری طرف انہی صفات وتعلیمات کی روشنی میں عصر حاضر میں مسلمانوں کے اندر رائج فکری اور عملی کج رویوں کو ہدفِ تنقید ٹھہرا کر اصلاحِ احوال کی دعوت دی گئی ہے، جس میں پڑھنے والے کو اپنی کوتاہیوں کا احساس اور اصلاح کی دعوت نظر آتی ہے۔

۲۔ دوسرے حصہ میں محدث العصر حضرت حافظ محمد محدث گوندلوی ﷫ کی بیان کردہ شرح وتفصیل ہے، جو انہوں نے طلبائے علم کو صحیح بخاری پڑھاتے ہوئے بیان فرمائی، جو اپنے اندر بیش قیمت علمی نکات اور تحقیقی جواہر سموئے ہوئے ہے۔

دونوں حصوں میں اگرچہ ایک ہی حدیث کی تشریح بیان کی گئی ہے، لیکن حیرت انگیز حد تک ''ہر گلے را بوئے دیگر است'' کے مصداق جدا جدا نکات اور الگ الگ مباحث دیکھنے کو ملتے ہیں، جس سے دونوں شخصیات کے علم وفضل کی گیرائی اور گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جزاهم الله خيرا وجعله في ميزان حسناتهم.

اس کتاب کی ترتیب وتزئین میں مندرجہ ذیل امور کو مدنظر رکھا گیا ہے:

۱۔ کتاب میں مذکور آیات کی ترقیم اور بیشتر احادیث وآثار کی مختصر تخریج کی گئی ہے۔

۲۔ ذیلی عناوین کا اہتمام کیا گیا ہے۔

۳۔ کتاب کے دوسرے حصے میں آیات کا ترجمہ ہماری طرف سے اضافہ کردہ ہے۔

۴۔ تمام امور کو انتہائی دقت اور محنت سے حوالہ قرطاس کیا گیا ہے۔

آخر میں ہم ان تمام حضرات کے شکر گزار ہیں، جنہوں نے اس کتاب کی تکمیل میں کسی طرح بھی حصہ لیا، خصوصاً:

۱۔ فضیلۃ الشیخ عبداللہ ناصر رحمانی ﷾، جنہوں نے نہ صرف اپنی تقاریر کی کتابت و اشاعت کی اجازت دی، بلکہ اپنے علمی اور دعوتی مشاغل سے وقت نکال کر اس پر نظر ثانی کی، بہترین مقدمہ لکھا اور مفید آراء و تجاویز سے نوازا، جس سے کتاب کی تکمیل زیادہ بہتر طور پر ممکن ہوئی۔

۲۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف ﷾، جنہوں نے بیش قیمت علمی و تصنیفی مصروفیات سے فرصت نکال کر اس کتاب پر مقدمہ لکھا، کتاب کے مکمل مسودہ پر نظر ثانی فرمائی اور انتہائی مفید آراء سے نوازا، جو ہماری حوصلہ افزائی کا باعث بنیں۔

علاوہ ازیں اس کتاب کے کسی مرحلہ پر جس بھائی نے ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے، ہم اس کے مشکور ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے شارحین، ناشرین اور قارئین کو اجر جزیل عطا فرمائے اور قیامت کے دن ان کی نجات کا بہترین وسیلہ بنائے۔ آمین یا رب العالمین

وصلى الله وسلم على محمد وعلىٰ آله وصحبه أجمعين .

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

زیرِ نظر کتاب ایک ٹکٹ میں دو مزے کی مصداق ہے، یعنی بیک وقت ایک ہی موضوع پر دو فاضل شخصیات کے افکارِ عالیہ یا ایک ہی حدیث کی اپنے اپنے انداز سے دو نابغۂ عصر کی شرح وتفسیر کا یہ نادر مجموعہ ہے۔

موضوع ہے رسول اللہ ﷺ کی سیرت و شخصیت اور حدیث ہے جو اہل علم میں حدیثِ ہرقل کے نام سے مشہور ہے۔

ہرقل رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں روم کا فرماں روا (بادشاہ) تھا، جو اس وقت عیسائیوں کی بہت بڑی سلطنت اور ایک عظیم سپر پاور طاقت تھی، رسول اللہ ﷺ نے مختلف بادشاہوں اور فرماں رواؤں کے نام خطوط تحریر فرمائے تھے، جن میں ان کو قبولِ اسلام کی دعوت دی تھی اور نہایت جامع الفاظ میں ان کو بتلایا تھا کہ اگر وہ دنیا میں عزت وسرخروئی اور اُخروی فوز وفلاح چاہتے ہیں، تو اسلام کے حصارِ عافیت میں آ جائیں اور اسلام کے دامن سے وابستہ ہو جائیں۔

"اَسلِمْ ، تَسلَمْ" اسلام قبول کرلو، سلامت رہو گے!

اسی دعوتِ اسلام پر مبنی رسول اللہ ﷺ کا مکتوبِ گرامی شاہِ روم ہرقل کو بھی پہنچا، وہ عالم فاضل شخص تھا، محض ایک حکمراں ہی نہیں تھا، تورات وانجیل کی تعلیمات و تفصیلات سے بھی باخبر تھا، دوسطری مکتوبِ گرامی کو پڑھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا اور اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہوگیا۔

اتفاق سے انہی ایام میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی قیادت میں، جو اس وقت کافر اور رسول اللہ ﷺ کے دشمن تھے، مکے سے ایک تجارتی قافلہ شام کے علاقے میں گیا، ہرقل کو جب یہ معلوم ہوا کہ مکے سے، جو مہبطِ وحی اور مرکزِ رسالت تھا، ایک قافلہ اس کے ملک میں آیا ہوا ہے، تو اس نے اس موقعے کو غنیمت سمجھا اور تفتیش و تحقیق کے لیے اس قافلے کو اپنے دربار میں بلوا لیا اور قافلے کے سربراہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کی بابت نہایت اہم استفسارات کیے، جن کے جوابات حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے دیے، استفسار کرنے والا ہرقل بھی کافر تھا اور جواب دینے والے ابو سفیان بھی اس وقت کافر اور اسلام کے شدید دشمنوں میں سے تھے۔

یہ استفسارات اور جوابات کیا تھے؟ اور ہرقل پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ یہی حدیث ہرقل ہے، جس کی تفصیل قارئینِ کرام اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

اس کی شرح و تفصیل کرنے والے دو حضرات ہیں، ایک ہیں پروفیسر عبداللہ ناصر رحمانی حفظہ اللہ بانی و شیخ الحدیث المعہد السلفی (گلستانِ جوہر کراچی) جو اپنے وقت کے بلند پایہ خطیب، داعیٔ کبیر، مسندِ محدثین کے صحیح وارث اور صاحبِ علم و فضل یگانۂ روزگار شخصیت ہیں۔ متعنا اللّٰه بطول حياته وبارك في جهوده وعمره!

حدیث ہرقل کی شرح و تفسیر میں پہلا مضمون انہی کا ہے، جو دراصل جمعے کے خطبات ہیں، جن کو عزیز گرامی حافظ شاہد محمود فاضل مدینہ یونیورسٹی سلّمہ اللہ تعالیٰ نے کیسٹوں کے سینوں سے کاغذ کے سفینوں پر منتقل کیے ہیں۔

دوسرا مضمون جو اس حدیث کی شرح میں ہے، حضرت العلام، استاذ الاساتذہ حضرت حافظ محمد محدث گوندلوی قدس اللّٰه روحه ونور ضريحه کے درسی افادات

پر مشتمل ہے، حضرت محدث گوندلوی رحمہ اللہ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں، وہ بھی اپنے وقت کے عظیم محدث، بلند پایہ محقق، یادگارِ محدثین اور آیة من آیاتِ اللہ تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی خوبیوں اور کمالات اور بے مثال حافظے سے نوازا تھا، حلقۂ درس بھی بڑا وسیع تھا، اس وقت کے اکابر علمائے محققین، شیوخ الحدیث اور اصحابِ علم و فضل کی اکثریت انہی کی فیض یافتہ ہے۔ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ وَرَحِمَهُ !

ان دونوں حضرات کے مضامین کے بارے میں مجھ جیسے کم مایہ اور بے بضاعت کا کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، تاہم اتنا ضرور عرض ہے کہ دونوں مضامین دقائق و حقائق اور علوم و معارف کا ایسا گنجینہ اور علمی نکات و لطائف کا ایسا خزینہ ہے کہ شاید و باید!

اس اعتبار سے یہ کتاب عوام و خواص، خطباء و مدرسین اور دیگر اہل علم و تحقیق سب کے لیے نہایت مفید اور لائق مطالعہ ہے، علاوہ ازیں یہ سیرتِ طیبہ کا ایک ایسا دل آویز تذکرہ ہے، جو دو کافروں کے بیانات و اعترافات پر مبنی ہے، جو یقیناً "اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ" کے مصداق ہمارے آقا و پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی افضلیت و اکملیت کے آئینہ دار ہیں۔

حافظ صلاح الدین یوسف

مدیر شعبۂ تحقیق و تالیف دارالسلام، لاہور

ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ ۔ مطابق اپریل ۲۰۰۹ء

مقدمہ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على أشرف الأنبياء والمرسلين، وعلى آله وصحبه ومن اقتدى بهديه ونهج بنهجه وسن بسنته إلى يوم الدين. أما بعد!

زیر نظر کتاب درحقیقت ایک عظیم الشان حدیث کی شرح پر مشتمل ہے، یہ حدیث، حدیثِ ہرقل کے نام سے معروف ہے، جس کا متن خاصہ طویل اور عظیم الفوائد ہے، اس حدیث سے بہت سے قواعد اور اصول کا استخراج کیا گیا ہے، اس کے مضامین کی کثرت کی ایک بہت بڑی دلیل یہی ہے کہ امیر المؤمنین فی الحدیث امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ نے اسے اپنی صحیح میں بہت سے مقامات پر کاملاً یا تقطیعاً ذکر فرمایا ہے اور ہر مقام پر مستقل باب قائم کرکے ایک نئے مسئلے کا استخراج فرمایا ہے۔

چنانچہ یہ حدیث صحیح بخاری میں "باب بدء الوحی" میں مذکور ہے، اس کے علاوہ کتاب الجہاد میں، پھر کتاب التفسیر میں دو مقامات پر مذکور ہے، نیز نیز کتاب الشهادات، كتاب الجزية، كتاب الأيمان والنذور، كتاب العلم، كتاب الأحكام، كتاب المغازي، كتاب الخبر الواحد، اور كتاب الاستئذان میں مستقل تراجم کے تحت موجود ہے۔ کتاب الأدب میں بھی دو مرتبہ اس حدیث کو ذکر فرمایا ہے۔

یہ حدیث دیگر بہت سے فوائد کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی بعثتِ مبارکہ کے ابتدائی حالات کا ذکر کرتی ہے، نیز رسول اللہ ﷺ کی دعوت اور اس سے

متعلق بہت سے محاسن، ثمرات اور نتائج پر بحث کرتی ہے، اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے بہت سے خلقِ حسنہ، جن میں دعوت میں صبر و عزیمت اور استقامت بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں، کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اور ان تمام خلقِ حسنہ کی گواہی خود کفار نے دی اور ہرقل کے انتہائی جامع تبصروں نے آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے محاسن کو چار چاند لگا دیئے۔ والفضل ما شهدت به الأعداء !

اس حدیث سے نشرِ دین اور غلبۂ دین کے تعلق سے بہت سے زریں قواعد و فوائد حاصل ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر رسول اکرم ﷺ کا مکتوبِ گرامی بنامِ ہرقل بہت سے علم پر مشتمل ہے، اس مختصر سے نامۂ مبارک نے ہرقل کے ایوان میں لرزہ طاری کر دیا اور ہرقل اپنے تمام تر شکوہ و جلال کے باوجود اس کے رُعب و ہیبت سے کپکپا اٹھا، نیز اس عظیم المرتبت حدیث سے یہ نکتہ بھی بوضوحِ تمام حاصل ہوتا ہے کہ ہدایت و ضلالت کا پورا معاملہ خالقِ کائنات کے ہاتھ میں ہے۔ من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادي له!

محدث العصر، استاذ العلماء حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ جو جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ میں ایک مدتِ مدید شیخ الحدیث کے منصبِ جلیل پر فائز رہے ہیں اور یہ جماعت اہل حدیث کی ایک روشن اور نہایت ہی مبارک تاریخ ہے، جس کا سلسلہ نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ پر محیط ہے، حافظ صاحب رحمہ اللہ کے کچھ دروس ریکارڈ کیے گئے، جنہیں اسلامک پبلشنگ ہاؤس کے تحت نہایت محنت سے ترتیب دے کر بنام ''درسِ صحیح بخاری'' زیورِ طباعت سے آراستہ کیا گیا، یہ مطبوع حصہ آغازِ کتاب یعنی ''بدء الوحی'' سے لے کر '' باب الدين النصيحة لله ولرسوله'' تک ہے۔

چھ سو پچاس صفحات پر مشتمل یہ کتاب علوم و معارف کا ایک خزانہ ہے، مسلکِ محدثین کی ترجمانی اور شبہاتِ مبتدعین کی بیخ کنی کا بڑا نادر اور حسین مرقع ہے، حافظ

صاحب رحمہ اللہ کے تبحرِ علمی اور حفظ و اتقان کا تذکرہ، سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، کاش صحیح بخاری پر آپ کے دروس مکمل ریکارڈ ہوجاتے، تو علماء وطلابِ علم کو انتہائی مبارک اور نفیس متاعِ علم حاصل ہوجاتی۔ قدر اللّٰه وما شاء فعل!

ہمارے انتہائی فاضل بھائی حافظ شاہد محمود حفظہ اللہ، جنہیں اللہ تعالیٰ نے خدمتِ حدیث کے تعلق سے بڑا نفیس ذوق عطا فرمایا ہے، نے ان دروس میں سے حدیثِ ہرقل پر حافظ صاحب رحمہ اللہ کی مکمل تقریر وتشریح کو برائے طباعت منتخب کیا، تاکہ اس حدیث کے فوائد عامۃ الناس تک پہنچائے جاسکیں، یہ اسلوب ان کے اخلاص اور محبتِ منہجِ سلف صالحین کا مظہرِ اُتم ہے۔

بندہ نے جامع مسجد رحمانیہ، بوہرہ پیر کراچی میں جمعہ کے چند خطبات میں حدیثِ ہرقل کی اپنی محدودسی بضاعتِ علمی کی روشنی میں تشریحات پیش کی تھیں، ان کی ریکارڈ شدہ کیسٹیں غالبًا بھائی محمد حسن صاحب نے حافظ شاہد محمود تک پہنچا دیں اور انہوں نے انہیں سننے کے بعد شاملِ اشاعت کرنے کا پروگرام بنا لیا، میرے ان خطبات کی حافظ صاحب رحمہ اللہ کے دروس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وأین الثریٰ من الثریا!

تاہم اس امید کے پیشِ نظر کے شاید ہماری تقاریر کا کوئی جملہ کسی کے دل میں اتر جائے اور اس کی منفعت و ہدایت کا کام کر جائے، ہم نے ان خطبات کی طباعت کی اجازت دے دی۔

حافظ شاہد محمود حفظہ اللہ میرے بہت زیادہ شکر و امتنان کے مستحق ہیں، جنہوں نے اسلوبِ خطابت کو اسلوبِ تحریر کے قالب میں ڈھالا اور بیشتر نصوص کی تخریج بھی کر دی۔ فجزاه اللّٰه عنا وعن المسلمين خير الجزاء!

ان دروس و تقاریر کی طباعت میں جن جن دوستوں کا کسی بھی اعتبار سے تعاون شامل ہے، سب کے لیے اخلاصِ نیت اور عنداللہ قبولِ حسن کی دعا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ اس کتابِ نافع کا نفع عام فرما دے اور ہمیں اپنے پیارے پیغمبر محمد ﷺ کی احادیثِ مبارکہ کے خدام کے زمرہ میں شامل فرما لے۔ روز افزوں یہ تمنا و خواہش بڑھتی جا رہی ہے کہ اللہ رب العزت روزِ حشر طلبۃ الحدیث کے قدموں میں جگہ عطا فرما دے۔

اللهم آمين. وصلى الله على نبينا محمد، وعلىٰ آله وصحبه أجمعين!

وكتبه/ عبدالله ناصر الرحماني

مستهل ربيع الثانی ١٤٣٠ھ

مسنون خطبہ

«إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَ نَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ وَ شَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَ كُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ»

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُونَ ○ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ○ يُّصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ○

---

① آل عمران: ۳/۱۰۲۔ ② النساء: ۴/۱۔ ③ الاحزاب: ۳۳/۷۰۔۷۱۔

④ صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب خطبته ﷺ فی الجمعة: ۶/۱۵۳۔ ابوداؤد، کتاب السنة، باب فی لزوم السنة۔ نسائی، کتاب صلاۃ العیدین باب کیف الخطبة۔ ابن ماجه، باب اجتناب البدع والجدل۔ دارمی، باب اتباع السنة۔ مسند احمد: ۴/۱۲۶۔۱۲۷۔

”بلاشبہ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، ہم اس کی تعریف کرتے ہیں اس سے مدد مانگتے ہیں اور اسی سے بخشش مانگتے ہیں۔ ہم اپنے نفسوں کے شر اور اپنی بداعمالیوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے اپنے در سے دھتکار دے اس کے لیے کوئی رہبر نہیں ہو سکتا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ معبود برحق صرف اللہ تعالیٰ ہے، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔“

حمد وصلوٰۃ کے بعد یقیناً تمام باتوں سے بہتر بات اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور تمام طریقوں سے بہتر طریقہ محمد ﷺ کا ہے اور تمام کاموں سے بدترین کام وہ ہیں جو (اللہ کے دین میں) اپنی طرف سے نکالے جائیں، دین میں ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی اور ہر گمراہی کا انجام جہنم کی آگ ہے۔

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔“

”اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور (پھر) اس جان سے اس کی بیوی کو بنایا اور (پھر) ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیں اور انہیں (زمین پر) پھیلایا۔ اللہ سے ڈرتے رہو جس کے ذریعے (جس کے نام پر) تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتوں (کو قطع کرنے) سے ڈرو (بچو)۔ بے شک اللہ تمہاری نگرانی کررہا ہے۔“

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ایسی بات کہو جو محکم (سیدھی اور سچی) ہو، اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح اور تمہارے گناہوں کو معاف فرمائے گا اور جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔“



متن حديث هرقل

"حدثنا أبو اليمان الحكم بن نافع، قال: أخبرنا شعيب، عن الزهري، قال: أخبرني عبيدالله بن عبدالله بن عتبة بن مسعود، أن عبدالله بن عباس أخبره أن أبا سفيان بن حرب أخبره أن هرقل أرسل إليه في ركب من قريش، وكانو تجاراً بالشام، في المدة التي كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ماد فيها أبا سفيان وكفار قريش، فأتوه وهم بإيلياء، فدعاهم في مجلسه، وحوله عظماء الروم، ثم دعاهم، ودعا بترجمانه.

فقال: أيكم أقرب نسباً بهذا الرجل الذي يزعم أنه نبي؟ فقال أبو سفيان: فقلت: أنا أقربهم نسباً، فقال: أدنوه مني، وقربوا أصحابه، فاجعلوهم عند ظهره، ثم قال لترجمانه: قل لهم: إني سائل هذا عن هذا الرجل، فإن كذبني فكذبوه، فوالله لولا الحياء من أن يأثروا علي كذباً لكذبت عنه.

ثم كان أول ما سألني عنه أن قال: كيف نسبه فيكم؟ قلت: هو فينا ذو نسب، قال: فهل قال هذا القول منكم أحد قط؟ قبله قلت: لا، قال: فهل كان من آبائه من ملك؟ قلت: لا، قال: فأشراف الناس اتبعوه أم ضعفاؤهم؟ فقلت: بل ضعفاؤهم، قال: أيزيدون أم ينقصون؟ قلت: بل يزيدون، قال: فهل يرتد أحد منهم سخطة لدينه بعد أن يدخل فيه، قلت: لا، قال: فهل كنتم تتهمونه بالكذب قبل أن يقول ما قال؟ قلت: لا، قال: فهل يغدر؟ قلت: لا، ونحن منه في مدة لا ندري ما هو فاعل فيها؟ قال: ولم تمكني كلمة أدخل فيها شيئاً غير هذه الكلمة.

قال: فهل قاتلتموه؟ قلت نعم، قال: فكيف كان قتالكم إياه؟ قلت: الحرب بيننا وبينه سجال، ينال منا وننال منه، قال: ما ذا يأمركم؟ قلت: يقول:

اعبدوا الله وحده، ولا تشركوا به شيئاً، واتركوا ما يقول آباؤكم، ويأمرنا بالصلاة والصدق والعفاف والصلة، فقال للترجمان: قل له: سألتك عن نسبه، فذكرت أنه فيكم ذو نسب، فكذلك الرسل تبعث في نسب قومها، وسألتك هل قال أحد منكم هذا القول؟ فذكرت أن لا، فقلت: لو كان أحد قال هذا القول قبله، لقلت: رجل يأتسي بقول قيل قبله، وسألتك هل كان من آبائه من ملك؟ فذكرت أن لا، قلت: فلو كان من آبائه من ملك، قلت: رجل يطلب ملك أبيه.

وسألتك هل كنتم تتهمونه بالكذب قبل أن يقول ما قال؟ فذكرت أن لا، فقد أعرف أنه لم يكن ليذر الكذب على الناس، ويكذب على الله، وسألتك أشراف الناس اتبعوه أم ضعفاؤهم؟ فذكرت أن ضعفاءهم اتبعوه، وهم أتباع الرسل، وسألتك أيزيدون، أم ينقصون؟ فذكرت أنهم يزيدون، وكذلك أمر الإيمان حتى يتم، وسألتك أيرتد أحد سخطة لدينه بعد أن يدخل فيه؟ فذكرت أن لا، وكذلك الإيمان حين تخالط بشاشته القلوب، وسألتك هل يغدر فذكرت أن لا، وكذلك الرسل لا تغدر.

وسألتك بما يأمركم، فذكرت أن تعبدوا الله، ولا تشركوا به شيئاً، وينهاكم عن عبادة الأوثان، ويأمركم بالصلاة والصدق والعفاف، فإن كان ما تقول حقاً فسيملك موضع قدميّ هاتين، وقد كنت أعلم أنه خارج، لم أكن أظن أنه منكم، فلو أني أعلم أني أخلص إليه، لتجشمت لقاء ه، ولو كنت عنده لغسلت عن قدميه، ثم دعا بكتاب رسول الله صلى الله عليه وسلم الذي بعث به دحية إلى عظيم بصرى، فدفعه إلى هرقل فقرأه، فإذا فيه: بسم الله الرحمن الرحيم، من محمد عبدالله ورسوله إلى هرقل عظيم الروم، سلامٌ على من اتبع الهدى، أما بعدُ: فإني أدعوك بدعاية

الإسلام، أسلم تسلم، يؤتك الله أجرك مرتين، فإن توليت فإن عليك إثم الأريسيين و ﴿ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ [آل عمران: ٦٤]

قال أبو سفيان: فلما قال ما قال، وفرغ من قراء ة الكتاب، كثر عنده الصخب، وارتفعت الأصوات، وأخرجنا، فقلت لأصحابي حين أخرجنا: لقد أمِر أمر ابن أبي كبشة، إنه يخافه ملك بني الأصفر، فما زلت موقناً أنه سيظهر حتى أدخل الله علي الإسلام، وكان ابن الناطور صاحب إيلياء، وهرقل سقفاً على نصارىٰ الشام، يحدث أن هرقل حين قدم إيلياء أصبح يوماً خبيث النفس، فقال بعض بطارقته: قد استكرنا هيئتك، قال ابن الناطور: وكان هرقل حزاء ينظر في النجوم.

فقال لهم حين سألوه: إني رأيت الليلة حين نظرت في النجوم ملك الختان قد ظهر، فمن يختتن من هذه الأمة؟ قالو: ليس يختتن إلا اليهود، فلا يهمنك شأنهم واكتب إلى مداين ملكك، فيقتلوا من فيهم من اليهود، فبينما هم على أمرهم أتي هرقل برجل، أرسل به ملك غسان، يخبر عن خبر رسول الله صلى الله عليه وسلم، فلما استخبره هرقل، قال: اذهبوا فانظروا أمختتن هو أم لا ؟ فنظروا إليه، فحدثوه أنه مختتن، وسأله عن العرب، فقال: هم يختتنون، فقال هرقل: هذا ملك هذه الأمة قد ظهر، ثم كتب هرقل إلى صاحب له برومية، وكان نظيره في العلم، وسار هرقل إلى حمص، فلم يرم حمص حتى أتاه كتاب من صاحبه يوافق رأي هرقل على خروج النبي صلى الله عليه وسلم وأنه نبي، فأذن هرقل لعظماء الروم في دسكرة له بحمص، ثم أمر بأبوابها فغلقت، ثم اطلع فقال: يا معشر الروم! هل لكم في الفلاح والرشد، وأن يثبت ملككم؟ فتبايعوا هذا النبي،

فحاصوا حيصة حمر الوحش إلى الأبواب، فوجدوها قد غلقت، فلما رأى هرقل نفرتهم، وأيس من الإيمان، قال: ردوهم علي، وقال: إني قلت مقالتي آنفا أختبر بها شدتكم على دينكم، فقد رأيت، فسجدوا له ورضوا عنه، فكان ذلك آخر شأن هرقل." رواه صالح بن كيسان ويونس و معمر عن الزهري.

ہم کو ابو الیمان حکم بن نافع نے حدیث بیان کی، انہیں اس حدیث کی شعیب نے خبر دی، انہوں نے زہری سے یہ حدیث سنی، انہیں عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود نے خبر دی کہ عبداللہ بن عباس سے ابوسفیان بن حرب نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ہرقل (شاہ روم) نے ان کے پاس قریش کے قافلے میں ایک آدمی بلانے کو بھیجا اور اس وقت یہ لوگ تجارت کے لیے ملک شام گئے ہوئے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا، جب رسول اللہ ﷺ نے قریش اور ابوسفیان سے ایک وقتی عہد کیا ہوا تھا۔

جب ابوسفیان اور دوسرے لوگ ہرقل کے پاس ایلیا پہنچے، جہاں ہرقل نے دربار طلب کیا تھا، اس کے گرد روم کے بڑے بڑے لوگ (علماء، وزراء و امراء) بیٹھے ہوئے تھے، ہرقل نے ان کو اور اپنے ترجمان کو بلوایا، پھر ان سے پوچھا کہ تم میں سے کون شخص مدعی رسالت کا زیادہ قریبی عزیز ہے؟ ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں بول اٹھا کہ میں اس کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار ہوں، (یہ سن کر) ہرقل نے حکم دیا کہ اس (ابوسفیان) کو میرے قریب لا کر بٹھاؤ اور اس کے ساتھیوں کو اس کی پیٹھ کے پیچھے بٹھا دو، پھر اپنے ترجمان سے کہا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں ابوسفیان سے اس شخص (یعنی محمد ﷺ) کے حالات پوچھتا ہوں، اگر یہ مجھ سے کسی بات میں جھوٹ بول دے، تو تم اس کا جھوٹ ظاہر کر دینا۔ (ابوسفیان کا قول ہے کہ) خدا کی قسم! اگر مجھے یہ غیرت نہ آتی کہ یہ لوگ مجھ کو جھٹلائیں گے، تو میں آپ ﷺ کی نسبت ضرور غلط گوئی سے کام لیتا۔

خیر پہلی بات جو ہرقل نے مجھ سے پوچھی، وہ یہ کہ اس شخص کا خاندان تم لوگوں میں کیسا ہے؟ میں نے کہا وہ تو بڑے اونچے عالی نسب والے ہیں، کہنے لگا اس سے

پہلے بھی کسی نے تم لوگوں میں ایسی بات کہی تھی؟ میں نے کہا: نہیں، کہنے لگا، اچھا اس کے بڑوں میں کوئی بادشاہ ہوا ہے؟ میں نے کہا، نہیں، پھر اس نے کہا، بڑے لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ہے یا کمزوروں نے؟ میں نے کہا، نہیں، کمزوروں نے، پھر کہنے لگا، اس کے تابعدار روز بڑھتے جاتے ہیں، یا کوئی ساتھی پھر بھی جاتا ہے؟ میں نے کہا نہیں، کہنے لگا، کیا اپنے اس دعوائے (نبوت) سے پہلے کبھی (کسی بھی موقع پر) اس نے جھوٹ بولا ہے؟ میں نے کہا، نہیں اور اب ہماری اس سے (صلح کی) ایک مقررہ مدت ٹھہری ہوئی ہے، معلوم نہیں وہ اس میں کیا کرنے والا ہے؟

(ابوسفیان کہتے ہیں) میں اس بات کے سوا اور کوئی (جھوٹ) اس گفتگو میں شامل نہ کر سکا، ہرقل نے کہا، کیا تمہاری اس سے کبھی لڑائی بھی ہوئی ہے؟ ہم نے کہا کہ ہاں، بولا پھر تمہاری اور اس کی جنگ کا کیا حال ہوتا ہے؟ میں نے کہا، لڑائی ڈول کی طرح ہے، کبھی وہ ہم سے (میدان جنگ) جیت لیتے ہیں اور کبھی ہم ان سے جیت لیتے ہیں، ہرقل نے پوچھا، وہ تمہیں کس بات کا حکم دیتا ہے؟ میں نے کہا، وہ کہتا ہے کہ صرف ایک اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور اپنے باپ دادا کی (شرک کی) باتیں چھوڑ دو اور ہمیں نماز پڑھنے، سچ بولنے، پرہیز گاری اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔ (یہ سب سن کر) پھر ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا کہ ابوسفیان سے کہہ دے کہ میں نے تم سے اس کا نسب پوچھا، تو تم نے کہا کہ وہ ہم سے عالی نسب ہے اور پیغمبر اپنی قوم میں عالی نسب ہی بھیجے جایا کرتے ہیں، میں نے تم سے پوچھا کہ (دعوی نبوت کی) یہ بات تمہارے اندر اس سے پہلے کسی اور نے بھی کہی تھی؟ تو تم نے جواب دیا کہ نہیں، تب میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ اگر یہ بات اس سے پہلے کسی اور نے کہی ہوتی، تو میں سمجھتا کہ اس شخص نے بھی اسی بات کی تقلید کی ہے، جو پہلے کہی جا چکی ہے، میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے بڑوں میں کوئی بادشاہ بھی گزرا ہے؟ تو تم نے کہا کہ نہیں، تو میں نے (دل میں) کہا کہ ان کے بزرگوں میں سے کوئی بادشاہ ہوا ہوگا، تو میں کہہ دوں گا کہ وہ شخص (اس بہانہ) اپنے آباء واجداد کی بادشاہت اور ان کا ملک

(دوبارہ) حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور میں نے تم سے پوچھا کہ اس بات کے کہنے (یعنی پیغمبری کا دعوی کرنے) سے پہلے تم نے کبھی اس پر دروغ گوئی کا الزام لگایا ہے؟ تم نے کہا کہ نہیں، تو میں نے سمجھ لیا کہ جو شخص آدمیوں کے ساتھ دروغ گوئی سے بچے، وہ اللہ کے بارے میں کیسے جھوٹی بات کہہ سکتا ہے؟

اور میں نے تم سے پوچھا کہ بڑے لوگ اس کے پیرو ہوتے ہیں، یا کمزور آدمی؟ تم نے کہا کمزوروں نے اس کی اتباع کی ہے، تو (دراصل) یہی لوگ پیغمبروں کے متبعین ہوتے ہیں اور میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے ساتھی بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں؟ تم نے کہا کہ وہ بڑھ رہے ہیں اور ایمان کی کیفیت یہی ہوتی ہے، حتی کہ وہ کامل ہوجاتا ہے اور میں نے تم سے پوچھا کہ آیا کوئی شخص اس کے دین سے ناخوش ہو کر مرتد بھی ہوجاتا ہے؟ تم نے کہا نہیں، تو ایمان کی خاصیت بھی یہی ہے، جن کے دلوں میں اس کی مسرت رچ بس جائے، وہ اس سے لوٹا نہیں کرتے، اور میں نے تم سے پوچھا کہ آیا وہ کبھی عہد شکنی کرتے ہیں؟ تم نے کہا نہیں، پیغمبروں کا یہی حال ہوتا ہے، وہ عہد کی خلاف ورزی نہیں کرتے، اور میں نے تم سے کہا کہ وہ تم سے کس چیز کے لیے کہتے ہیں؟ تم نے کہا کہ وہ ہمیں حکم دیتے ہیں کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور تمہیں بتوں کی پرستش سے روکتے ہیں، سچ بولنے اور پرہیز گاری کا حکم دیتے ہیں، لہٰذا اگر یہ باتیں جو تم کہہ رہے ہو، سچ ہیں، تو عنقریب وہ اس جگہ کا مالک ہوجائے گا کہ جہاں میرے یہ دونوں پاؤں ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ (پیغمبر) آنے والا ہے، مگر مجھے یہ علوم نہیں تھا کہ وہ تمہارے اندر ہوگا، اگر میں جانتا کہ اس تک پہنچ سکوں گا، تو اس سے ملنے کے لیے ہر تکلیف گوارا کرتا، اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اس کے پاؤں دھوتا۔

ہرقل نے رسول اللہ ﷺ کا وہ خط منگوایا، جو آپ نے دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ حاکم بصریٰ کے پاس بھیجا تھا اور اس نے وہ ہرقل کے پاس بھیج دیا تھا، پھر اس کو پڑھا تو اس میں (لکھا تھا):

اللہ کے نام کے ساتھ جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے، اللہ کے بندے اور

اس کے پیغمبر محمد (ﷺ) کی طرف سے یہ خط ہے، شاہ روم کے لیے، اس شخص پر سلام ہو جو ہدایت کی پیروی کرے، اس کے بعد میں آپ کے سامنے دعوت اسلام پیش کرتا ہوں، اگر آپ اسلام لے آئیں گے، تو (دین و دنیا میں) سلامتی نصیب ہوگی، اللہ آپ کو دوہرا ثواب دے گا، اور اگر آپ (میری دعوت سے) روگردانی کریں گے، تو آپ کی رعایا کا گناہ بھی آپ ہی پر ہوگا، اور اے اہل کتاب! ایک ایسی بات پر آجاؤ، جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب بنائے، پھر اگر وہ اہل کتاب (اس کتاب سے) منہ پھیر لیں تو (مسلمانو!) تم ان سے کہہ دو کہ (تم مانو یا نہ مانو) ہم ایک خدا کے اطاعت گزار ہیں۔

ابوسفیان کہتے ہیں: جب ہرقل نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا اور خط پڑھ کر فارغ ہوا، تو اس کے اردگرد بہت شور وغوغا ہوا، بہت سی آوازیں اٹھیں اور ہمیں باہر نکال دیا گیا، تب میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابوکبشہ کے بیٹے (آنحضرت ﷺ) کا معاملہ تو بہت بڑھ گیا۔ (دیکھو تو) اس سے بنی اصفر (روم) کا بادشاہ بھی ڈرتا ہے! مجھے اس وقت سے بات کا یقین ہوگیا کہ حضور ﷺ عنقریب غالب ہو کر رہیں گے، حتیٰ کہ اللہ نے مجھے مسلمان کر دیا۔

(راوی کا بیان ہے کہ) ابن ناطور ایلیاء کا حاکم ہرقل کا مصاحب اور شام کے نصاریٰ کا لاٹ پادری بیان کرتا تھا کہ ہرقل جب ایلیاء آیا، ایک دن صبح کو پریشان اٹھا، تو اس کے درباریوں نے دریافت کیا کہ آج ہم آپ کی حالت بدلی ہوئی پاتے ہیں۔ (کیا وجہ ہے؟) ابن ناطور کا بیان ہے کہ ہرقل نجومی تھا، علم نجوم میں وہ پوری مہارت رکھتا تھا، اس نے اپنے ہم نشینوں کو بتایا کہ میں نے آج رات ستاروں پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ ختنہ کرنے والوں کا بادشاہ ہمارے ملک پر غالب آ گیا ہے۔ (بھلا) اس زمانہ میں کون لوگ ختنہ کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہود کے سوا کوئی ختنہ نہیں کرتا، سو ان کی وجہ سے پریشان نہ ہوں، سلطنت کے تمام شہروں میں یہ حکم لکھ بھیجئے کہ وہاں جتنے یہودی ہوں، سب قتل کر دیئے جائیں۔

وہ لوگ انہی باتوں میں مشغول تھے کہ ہرقل کے پاس ایک آدمی لایا گیا، جسے شاہ غسان نے بھیجا تھا، اس نے رسول اللہ ﷺ کے حالات بیان کئے، جب ہرقل نے (سارے حالات) سن لئے تو کہا کہ جا کر دیکھو وہ ختنہ کئے ہوئے ہے یا نہیں؟ انہوں نے اسے دیکھا تو کہا کہ وہ ختنہ کیا ہوا ہے، ہرقل نے جب اس شخص سے عرب کے بارے میں پوچھا، تو اس نے بتلایا کہ وہ ختنہ کرتے ہیں، تب ہرقل نے کہا یہ ہی (محمد ﷺ) اس امت کے بادشاہ ہیں، جو پیدا ہو چکے ہیں، پھر اس نے اپنے ایک دوست کو رومیہ خط لکھا اور وہ بھی علم نجوم میں ہرقل کی طرح ماہر تھا، پھر وہاں سے ہرقل حمص چلا گیا، ابھی حمص سے نکلا نہیں تھا کہ اس کے دوست کا خط (اس کے جواب میں) آ گیا، اس کی رائے بھی حضور ﷺ کے ظہور کے بارے میں ہرقل کے موافق تھی کہ محمد ﷺ (واقعی) پیغمبر ہے۔

اس کے بعد ہرقل نے روم کے بڑے آدمیوں کو اپنے حمص کے محل میں طلب کیا اور اس کے حکم سے محل کے دروازے بند کر لئے گئے، پھر وہ (اپنے خاص محل سے) باہر آیا، اور کہا:

''اے روم والو! کیا ہدایت اور کامیابی میں کچھ حصہ تمہارے لیے بھی ہے؟ اگر تم اپنی سلطنت کی بقا چاہتے ہو، تو پھر اس نبی (ﷺ) کی بیعت کر لو اور مسلمان ہو جاؤ''!

(یہ سننا تھا کہ) پھر لوگ وحشی گدھوں کی طرح دروازوں کی طرف دوڑے (مگر) انہیں بند پایا، آخر جب ہرقل نے (اس بات سے) ان کی یہ نفرت دیکھی اور ان کے ایمان لانے سے مایوس ہوگیا، تو کہنے لگا کہ ان لوگوں کو میرے پاس لاؤ۔ (جب وہ دوبارہ آئے) تو اس نے کہا میں نے جو بات کہی تھی، اس سے تمہاری دینی پختگی کی آزمائش مقصود تھی، سو وہ میں نے دیکھ لی، تب (یہ بات سن کر) وہ سب کے سب اس کے سامنے سجدے میں گر پڑے اور اس سے خوش ہوگئے۔ بالآخر ہرقل کی آخری حالت یہ ہی رہی۔ ابو عبداللہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کو صالح بن کیسان، یونس اور معمر نے بھی زہری سے روایت کیا ہے۔

شرح حدیث ہرقل

از

فضیلۃ الشیخ علامہ عبداللہ ناصر رحمانی حفظہ اللہ

موضوع:

رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کے حوالے سے حدیث ہرقل ایک عظیم الشان حدیث ہے، جس میں اس وقت کے دو کافروں کی گفتگو اور سوال و جواب ہیں اور موضوع ہے: رسول اکرم ﷺ کی شخصیت، آپ کا کردار، آپ کی دعوت اور آپ کا مشن!

سوال کرنے والا بھی کافر ہے ہرقل بادشاہ روم اور جواب دینے والا بھی اس وقت کافر تھا ابو سفیان بن حرب! جو فتح مکہ کے موقع پر اسلام لے آئے۔ ان جوابات پر ہرقل کے تبصرے بھی موجود ہیں، چنانچہ یہ ایک عظیم الشان حدیث ہے، جو نبیٔ پاک ﷺ کی فضیلت، آپ کی شخصیت کی عظمت اور آپ کے کردار کی رفعت پر ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ کسی نے کہا ہے:

" الفضل ما شهدت به الأعداء "

اصل فضیلت تو وہ ہے، جس کی دشمن بھی گواہی دے!

ابتدائے حدیث:

یہ حدیث صحیح بخاری کے شروع " بدء الوحي " میں آتی ہے، اسے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے خود ابو سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، ابو سفیان رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ:

"أرسل إلينا هرقل في ركب قريش، و كانوا تجارا بالشام "

ہرقل نے ہماری طرف اپنے قاصد بھیجے، اس وقت ہم قریش کے قافلے میں ملک شام ہی میں موجود تھے۔

وہ قریش کے تاجروں کا قافلہ تھا، جو مکہ سے تجارت کی غرض سے شام آئے تھے، غزہ مقام پر ان کی ہرقل کے قاصدوں سے ملاقات ہوئی۔ ہرقل روم کے بادشاہ

کا نام ہے، روم کے بادشاہوں کا لقب ''قیصر'' ہوتا ہے، جیسا کہ فارس اور ایران کے بادشاہوں کا لقب ''کسریٰ'' ہوتا ہے۔

مکتوب نبوی:

اس نے اپنے قاصد کیوں بھیجے؟ دراصل رسول اکرم ﷺ نے ہرقل کو ایک خط لکھا تھا، نبی علیہ السلام کے صحابی دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ (جن کا یہ اعزاز ہے کہ جبرائیل امین جب انسانی شکل میں وحی لے کر آتے، تو دحیہ کلبی کی شکل میں آیا کرتے تھے) یہ خط لے کر والیٔ بصریٰ کے پاس گئے اور والیٔ بصریٰ نے یہ خط ہرقل تک پہنچا دیا، یہ خط کب لکھا گیا اور اس خط میں کیا لکھا تھا؟ یہ سب باتیں ان شاء اللہ اسی حدیث میں آگے آئیں گی۔

تو ابوسفیان کا کہنا ہے کہ اس وقت ہم بغرضِ تجارت ملک شام ہی میں موجود تھے:

"في مدة ماد فيها رسول الله ﷺ أبا سفيان و كفار قريش"

''یہ قافلہ اس مدت کے دوران شام میں گیا تھا، جس مدت کے دوران رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان اور کفار قریش سے صلح کی تھی۔''

صلح حدیبیہ:

یہ صلح حدیبیہ کی طرف اشارہ ہے، جو ٦ھ ہجری میں واقع ہوئی۔ جب نبی علیہ السلام عمرہ کی غرض سے مکہ گئے اور تقریباً پندرہ سو صحابہ آپ ﷺ کے ساتھ تھے، لیکن آپ ﷺ کو روک دیا گیا اور کفار قریش آپ ﷺ کے اور بیت اللہ کے درمیان حائل ہوگئے۔ یہ ایک الگ تفصیل ہے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ اور قریش کے درمیان ایک صلح ہوئی تھی، یہ صلح حدیبیہ کہلاتی ہے۔ اس صلح کی ایک شق یہ بھی تھی کہ ہم اب سے دس سال تک آپس میں کوئی جنگ نہیں کریں گے اور ایک دوسرے کے حلیفوں کے

خلاف نہ کسی کو اکسائیں گے اور نہ کسی کی مدد کریں گے، یہ ایک بنیادی شق تھی۔

چنانچہ اسی مدتِ صلح کے دوران یہ قافلہ مکہ سے شام کی طرف گیا، جب سے جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا، کفار قریش کے قافلے بند ہو چکے تھے اور تجارت موقوف ہو چکی تھی۔ ابوسفیان کا اپنا قول ہے: ''حبستنا الحرب'' کہ مسلمانوں کے ساتھ جنگوں نے ہمارا کچومر نکال دیا تھا اور ہم مفلوک الحال ہو چکے تھے۔

صلح حدیبیہ کے فوائد:

ادھر اسی دوران ثمامہ بن اثال مسلمان ہوگئے، انہوں نے عیسائیت کو چھوڑ دیا اور اسلام قبول کرلیا، ثمامہ رضی اللہ عنہ وہ شخص تھے، جو یمن سے ساری گندم خرید لیتے تھے اور پھر مختلف علاقوں میں سپلائی کیا کرتے تھے، مکہ میں بھی ثمامہ رضی اللہ عنہ ہی گندم بھیجتے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے مکہ کی ترسیل بند کردی،[1] اہل مکہ فاقوں کا شکار ہوگئے، وہ خود بھی صلح کی طرف آمادہ تھے، چنانچہ جوں ہی یہ صلح طے ہوگئی، تو اہل مکہ نے اپنا تجارتی قافلہ شام کی طرف بھیجا، یوں یہ صلح اہل مکہ کے لیے دنیاوی اعتبار سے ایک بہتری کا پیغام تھی اور اہل اسلام کے لیے، اہل مدینہ کے لیے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بھی یہ صلح ایک بہتری کا پیغام اور بنیاد تھی، مکہ والوں کے نزدیک اس لحاظ سے کہ ان کے تجارتی قافلے شروع ہوگئے، راستے پرامن ہوگئے اور صلح کا معاہدہ تحریر ہوگیا، اب انہیں اپنے کسی قافلے پر حملے کا خدشہ نہیں تھا اور مسلمانوں کے لیے بھی یہ صلح ایک نوید مسرت تھی، ایک عظیم خوشخبری اور بشارت تھی، جس کی کئی وجوہات ہیں، یہ وجوہات بڑی قابل غور ہیں، جس سے صحابہ کا منہج واضح ہوتا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: كتاب المغازي، باب وفد بني حنيفة و حديث ثمامة بن أثال، رقم الحديث (٤١١٤) نیز دیکھیں: فتح الباري (٨/٨٧)

فتح مبین:

صحیح بخاری میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

" تعدون أنتم الفتح فتح مكة، وقد كان فتح مكة فتحا، ونحن نعد الفتح بيعة الرضوان "[1]

تم لوگ فتح سے فتح مکہ مراد لیتے ہو، یہ درست ہے کہ وہ فتح ہے، لیکن ہم اصل فتح بیعت رضوان کو شمار کرتے ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے:

﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾ [الفتح:١]

یہ سورہ اور یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ سے لوٹ رہے تھے، یہ صلح تحریر ہو چکی تھی اور معاہدہ ہو چکا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ لوٹ رہے تھے،تب اس سورہ کا نزول ہوا اور اللہ پاک نے فرمایا کہ ہم نے آپ کو فتح مبین یعنی ایک بڑی بیّن، واضح اور عظیم الشان فتح عطا فرما دی۔

صلح حدیبیہ کے خصائص و امتیازات:

براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ تم لوگ اس فتح سے فتح مکہ مراد لیتے ہو، فتح مکہ بھی فتح ہے، لیکن " نحن نعد الفتح بيعة الرضوان " ہم تو اس فتح سے بیعت رضوان مراد لیتے ہیں۔

یہ صلح حدیبیہ، یہ حدیبیہ کا معاہدہ اور اس سے قبل نبی علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت، ہم اس فتح سے بیعت رضوان یعنی صلح حدیبیہ مراد لیتے ہیں، اس کی کئی وجوہات ہیں، ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان ہمارے عظیم مناقب میں شامل ہو گئی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[1] صحيح البخاري: كتاب المغازي، باب غزوة الحديبية، رقم الحديث (٣٩١٩)

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴾[الفتح:١٨]

اللہ تعالیٰ ان تمام مومنین سے راضی ہوگیا، جنہوں نے درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

یہ بیعت کیا تھی؟

" با یعناہ علی الموت "[1]

ہم نے حدیبیہ کے مقام پر نبی علیہ السلام کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی تھی۔

جب یہ افواہ اڑا دی گئی کہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے، تو ہم ایک ایک صحابی نے موت کی بیعت کی کہ یا تو پورے مکہ سے عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کا بدلہ لیں گے یا پھر ایک ایک کر کے جانیں قربان کر دیں گے، صحابہ کے اس جذبے، اس شجاعت اور اللہ اور رسول سے اس محبت کو دیکھ کر اللہ پاک نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہوگیا، جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔

صحابہ کا اخلاص:

﴿ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ ''اللہ نے جان لیا کہ ان کے دلوں میں کیا ہے۔''

یعنی ان کے دلوں کا ایمان، ان کے دلوں کی غیرت، ان کے ایمان کی پختگی، عقیدے کی صلابت، اللہ اور اس کے رسول کی محبت، جو دلوں میں پوشیدہ ہوتی ہے، آج اللہ تعالیٰ نے جان لی، آج جاننے کا معنی یہ ہے کہ بشکل ظہور جان لی، دلوں کی محبت اللہ جانتا ہے، لیکن آج عملی طور پر اور ظاہراً یہ محبت واضح ہوگئی اور انہوں نے اس محبت کا اپنے عمل سے اظہار کر دیا۔

---

[1] مسند أحمد (٥١/٤) صحيح البخاري: كتاب المغازي، باب غزوة الحديبية، رقم الحديث (٣٩٣٦)

نزولِ سکینت:

﴿ فَاَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ عَلَيۡهِمۡ ﴾ اللہ تعالیٰ نے ان کو سکینت دے دی۔
یعنی ایک عجیب فرحت، عقیدے کی پختگی، ایمان کا سرور، ایمان کی لذت، ایمان وعمل کی حلاوت اور مٹھاس اللہ تعالیٰ نے سب چیزیں عطا فرما دیں۔

اب ان کے ہاں ایمان اور عمل صالح پر کوئی چیز مقدم نہیں ہوگی، سب سے پہلے ایمان ہے، عمل صالح ہے، باقی یہ علائق، یہ رشتہ داریاں، دنیاوی امور، دنیاوی دولتیں یہ سب دنیا کا مال ہے، ان سب کی اصلیت کے سامنے اللہ تعالیٰ نے ایسی سکینت عطا فرما دی کہ اب ایمان ان کو ہر چیز سے بہتر معلوم ہوا۔

ایمان کی محبت:

﴿ وَحَبَّبَ اِلَيۡكُمُ الۡاِيۡمَانَ ﴾ [الحجرات: ۷] اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان کی محبت راسخ کر دی اور اسے ان کے دلوں میں جاگزیں کر دیا، یہ ایک عجیب اور عظیم فضیلت ہے کہ مستقل طور پر ان کے ایمان کی گواہی دے دی اور فرمایا:

﴿ وَاَثَابَهُمۡ فَتۡحًا قَرِيۡبًا ﴾ اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں فتح قریب عطا فرما دی۔

فتح قریب کیا ہے؟

یہ فتح خیبر ہے، کیونکہ اسی بشارت کی بنا پر حدیبیہ کے سفر کے چند دنوں بعد اللہ کے پیغمبر ﷺ نے خیبر کا قصد کیا، اور خیبر وہ سرزمین ہے جس کے مالک یہودی تھے، یہ اونچے اونچے مضبوط قلعوں، باغات اور کھیتوں کی سرزمین تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کے صلہ میں فتح خیبر دے دی اور مسلمانوں کو مالا مال کر دیا، ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

"ما شبعنا حتی فتحنا خیبر" [1]

فتح خیبر کے بعد ہی ہمیں پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوا۔

---

[1] صحیح البخاري: کتاب المغازي، باب غزوة خیبر، رقم الحدیث (٤٠٠٠)

صلح حدیبیہ کی برکات:

دیکھیں! یہ صلح حدیبیہ کتنی خیرات اور برکات کی باعث ہے کہ اللہ کی رضا اور صحابۂ کرام کے دلوں میں ایمان کی صداقت کا اعلان ہوگیا، اللہ تعالیٰ نے سکینت دے دی اور ایمان کی محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی، یہ ہے دین کی دولت! اور خیبر بھی عطا فرما دیا، یہ ہے دنیا کی دولت! غرضیکہ دین اور دنیا دونوں کی سعادتوں سے مالا مال کر دیا، صحابۂ کرام کے اس کردار کی بنا پر کہ انہوں نے کفار اور ان کے حلیفوں کے نرغے میں موت کی بیعت کی تھی، جنگی ساز و سامان نہیں تھا، کیونکہ وہ عمرہ کرنے آئے تھے، جنگ کرنے نہیں آئے تھے، اس کے باوجود کوئی پروانہ تھی اور نبی علیہ السلام کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی۔

یہ بیعت بذات خود ایک فضیلت ہے کہ اس بیعت کے صلہ میں اللہ رب العزت نے اپنی رضا اور اپنی محبت کا اعلان فرما دیا:

﴿ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ [التوبہ: ۷۲] اللہ تعالیٰ کی تھوڑی سی رضا پوری دنیا کی سب سے قیمتی دولت اور سب سے قیمتی اثاثہ ہے، یہ رضا عطا فرما دی اور پھر ایمان کی صداقت کا اعلان کر دیا:

﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴾ [الحجرات: ۱۵] ''یہی لوگ سچے ہیں۔''

صداقتِ ایمان کی شہادت:

ان کا منہج، ان کا عقیدہ، ان کی توحید، ان کا تعلق باللہ، ان کا تعلق بالرسول، ان کا تعلق بالآخرہ اور ان کی گفتار سب کی سب سچ پر قائم ہے، یہ ایک عظیم شہادت ہے۔ سچا انسان وہ ہوتا ہے، جو ظاہر اور باطن میں سچا ہو، کچھ لوگ ظاہر میں سچے ہوتے ہیں، لیکن باطن میں جھوٹے ہوتے ہیں، ان میں نفاق ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آج ان کو نفاق کی تہمت سے بری کر دیا، ان کے دلوں کی صداقت نکھر کر سامنے آ گئی ہے اور یہ ایک نوید مسرت ہے۔

صحابہ کرام اور خشیت الٰہی:

ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ ایک بہت بڑے تابعی ہیں، فرمایا کرتے تھے:

" أدركت نحوا من ثلاثين من أصحاب رسول الله ﷺ كلهم يخاف النفاق على نفسه "❶

میں تقریباً تیس صحابہ کرام سے ملا ہوں، ہر صحابی کو میں نے ڈرتے ہوئے پایا، کس سے ڈرتے تھے؟ کہیں ہم منافق تو نہیں ہوگئے؟ کہیں ہم میں نفاق تو نہیں آ گیا؟ یہ ان کی تواضع تھی۔ یہ دنیا کے خزانے، دنیا کی محبتیں اور دنیا کے اونچے اونچے کاروبار ان کو یاد آتے کہ اللہ نے ہمیں تو یہ سب عطا فرما دیے ہیں، جو ہم سے کہیں افضل تھے، وہ تو اس حال میں دنیا سے گئے کہ ان کو کفن تک نصیب نہیں ہوا، ان کے ترکہ میں کل ایک چادر ہوتی، اتنی چھوٹی کہ چہرہ ڈھانپتے تو پاؤں ننگا ہوجاتا اور پاؤں ڈھانپتے تو سر ننگا ہوجاتا۔

خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کا سفر آخرت شروع ہوا، نزع کا عالم ہوا، بیٹوں نے یہ سمجھ لیا کہ ابا کا انتقال ہونے والا ہے، وہ ان کے کفن کی تیاری کر رہے تھے کہ وہ کفن ان کو نظر آ گیا، فرمایا: "ولكن حمزة لا كفن له"

میرا کفن موجود ہے۔ سید الشہداء امیر حمزہ کو تو کفن بھی نصیب نہیں ہوا۔ یہ باتیں سوچ کر رویا کرتے تھے کہ اگر یہ دنیا کی دولتیں کسی بہتری کا معیار ہیں، تو امیر حمزہ رضی اللہ عنہ اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ہم سے بہتر تھے، ان کو تو کفن تک نصیب نہیں ہوا!

چنانچہ وہ سمجھتے کہ دنیا کی اوقات، خزانے اور یہ دولتیں شاید اس بناء پر ہم کو مل گئیں کہ جو تھوڑی بہت نیکیاں ہم نے کی ہیں، ان کا صلہ دنیا میں دے کر فارغ کر دیا

---

❶ صحيح البخاري تعليقا (١/ ١١)، مع الفتح تعظيم قدر الصلاة (٢/ ٦٣٤)

گیا ہے۔ لگتا ہے کہ ہم میں نفاق آ گیا ہے، ہم تبدیل ہو گئے، وہ اس بات کو سوچ کر روتے تھے، یہ ان کی تواضع تھی، حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ جس شخص میں تقویٰ کا معیار جس قدر اونچا ہوگا، اسی قدر اس میں اللہ کا خوف اور ڈر بھی زیادہ ہوگا۔

تقویٰ کا معیار:

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

" إنكم لتعلمون أعمالا هي أدق في أعينكم من الشعر، وكنا نعدها على عهد النبي ﷺ من الموبقات "[1]

تم آج ایسے گناہ کرتے ہو کہ وہ گناہ تمہارے نزدیک ایسے ہیں، جیسے ناک پر مکھی بیٹھے اور اس کو اڑا دیا جائے، بس ختم! مکھی بیٹھی اور اڑ گئی، وہ گناہ تمہارے نزدیک بال سے بھی باریک ہیں، جب کہ پیغمبر ﷺ کے دور میں ہم ایسے گناہوں کو پہاڑ سمجھتے تھے، تم ان گناہوں کو بالوں سے باریک سمجھتے ہو، ہم ان گناہوں کو پہاڑوں سے بھی بوجھل سمجھتے تھے۔ صحابہ میں درحقیقت یہ تقویٰ موجود تھا۔

اس لیے اللہ نے آج ان کے دلوں کی صداقت کا اعلان کر دیا:

﴿ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ ان کے دلوں میں کیا ہے؟ اللہ نے جان لیا۔ یہ ہے دین کی شہادت اور دین کی فضیلت!

﴿ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴾ اور اللہ نے اس کے بدلے میں فتح قریب بھی دے دی، یعنی فتح خیبر! دنیا کا بڑا مال ہاتھ میں آیا، تقریباً ایک ششماہی کی فصل اسّی لاکھ کلو مدینے پہنچتی تھی۔ اس فتح خیبر کے بعد دنیا کی دولتیں مل گئیں اور پیٹ بھر کے کھانا نصیب ہوا۔ اس طرح دنیا بھی بن گئی، دین بھی بن گیا اور ایمان کی گواہی بھی آ گئی۔

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الرقاق، باب ما يتقى من محقرات الذنوب، رقم الحديث (٦١٢٧)

اصل فتح:

براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اس لیے صلح حدیبیہ کو فتح قرار دیتے ہیں کہ اصل فتح، فتح مکہ نہیں، اصل فتح صلح حدیبیہ ہے، اس کی چند وجوہات ہیں:

۱۔ بیعت رضوان اور بیعت رضوان کے نتیجے میں اللہ رب العزت کے اعزازات اور اللہ تعالیٰ کی شہادت۔

۲۔ فتح خیبر

اور تیسری چیز یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے نتیجے میں راستے پر امن ہوگئے۔

اس سے پہلے راستے پرخطر تھے اور لوگ ڈرتے تھے۔اسلام دور دور تک پہنچ چکا تھا، لیکن بہت تھوڑے لوگوں میں اسلام قبول کر کے مدینے آنے کی ہمت تھی، لوگ اپنے اسلام کو چھپائے بیٹھے تھے، جب صلح حدیبیہ کا اعلان ہوگیا، تو یہی لوگ اپنے گھروں سے نکل کر فوج درفوج مدینے آنے لگے۔صلح کے اس عرصے میں بے شمار لوگ آئے، گویا دعوت کا راستہ ہموار ہوگیا۔اصل جو دین ہے وہ دعوت ہے، دس سال کے لیے جنگ موقوف ہوگئی اور دعوت کا راستہ کھل گیا۔لوگوں تک اسلام پہنچ چکا تھا، لیکن وہ ڈرتے تھے، اپنے گھروں میں محصور تھے کہ گھر سے باہر نکلیں گے، تو کفار قریش کے جاسوس جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں، یہ روک لیتے ہیں، پریشان کرتے ہیں، بلکہ مارتے ہیں، لوٹتے ہیں، اس لئے لوگ اپنے گھروں میں ڈر کر بیٹھے ہوئے تھے، لیکن جب اس صلح کی خبر آگئی، تو اب لوگ جوق در جوق گھروں سے نکل کر اسلام قبول کرنے مدینے پہنچ رہے ہیں۔

دعوت دین میں وسعت:

اس عرصے میں کتنے لوگ مسلمان ہوئے؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ چھ ہجری میں جب نبی علیہ السلام حدیبیہ کے لیے گئے، تو آپ کے ساتھ پندرہ سو صحابہ

تھے اور اس کے دو سال بعد آٹھ ہجری میں جب کفار نے معاہدہ توڑ دیا، پھر اللہ کے پیغمبر علیہ السلام نے کفار قریش پر حملہ کر دیا اور مکہ فتح ہوا، تو اس سفر میں پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ دس ہزار مجاہدین تھے، یعنی آج سے دو سال پہلے پندرہ سو تھے اور دو سال کے بعد دس ہزار ہو گئے۔ لوگوں کا اسلام قبول کر کے مدینے آنا اور جوق در جوق اسلام میں داخل ہونا، یہ صرف دعوت کا نتیجہ ہے۔

تو صحابہ کہتے ہیں کہ یہ اصل فتح ہے، کیونکہ ہماری دعوت کا راستہ کھل گیا ہے اور لوگ اپنے گھروں سے نکل کر مدینے آرہے ہیں اور مدینے کی حدود وسیع ہو رہی ہیں۔

کسی کافر کا اسلام قبول کرنا:

اسی لیے پیغمبر علیہ السلام کا فرمان ہے:

" إسلام رجل واحد أحب إلي من قتل ألف كافر "[1] کہ ایک شخص کا اسلام قبول کرنا، میرے نزدیک ایک ہزار کافر کو قتل کرنے سے بہتر ہے۔

یعنی میری تلوار سے ایک ہزار کافر قتل ہوں، اس سے بہتر ہے کہ میری دعوت سے ایک کافر اسلام قبول کر لے، قتل ہو کر کافر نے جہنم میں جانا ہے اور اسلام قبول کر کے جنت میں جانا ہے اور یہ چیز بہتر اور افضل ہے۔ اس لیے سب سے اونچا مقام دعوت دین کا مقام ہے۔

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک کافر کسی غزوہ میں لڑ رہا تھا، مسلمانوں کو شہید کر رہا تھا، اس کی اسامہ بن زید سے مڈبھیڑ ہوگئی، دونوں کی تلواروں کا تبادلہ ہوا، آخر اسامہ بن زید اس پر کنٹرول پانے میں کامیاب ہو گئے، تلوار کے ساتھ اس پر وار

---

[1] رواہ ابن إسحاق في المغازي (الروض الأنف: ١/ ٣٠١، فتح الباري: ٧/ ٣٧٠)

کرنے لگے، تو اس نے " لا إله إلا الله "کلمہ پڑھ لیا، آپ نے اس کو قتل کر دیا، نبی علیہ السلام کو خبر ہوئی تو کہا: اسامہ! اس نے لا إله إلا الله پڑھ لیا، اللہ کی توحید کو مان لیا، تم نے اس کے باوجود اسے قتل کر دیا؟ اسامہ رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! اس نے تو صرف بچنے کے لیے کلمہ پڑھا تھا، وہ اس سے پہلے میرے کئی دوستوں اور کئی مسلمانوں کو شہید کر چکا تھا اور مجھ پر بھی حملہ آور ہو چکا تھا، وہ تو میں اس پر کنٹرول پانے میں کامیاب ہوگیا، ورنہ وہ میرا کام بھی تمام کر دیتا، اس نے تو جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا تھا!

فرمایا:" أشققت عن قلبه" کیا تو نے اس کے دل کو چیر کر دیکھ لیا تھا؟

اس کا سینہ شق کر کے دیکھا تھا کہ اس نے دل سے کلمہ پڑھا ہے یا اوپر سے پڑھا ہے؟ تمہیں کس نے بتایا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا:"یا أسامة! كيف تصنع بلا إله إلا الله إذا جاء ك يوم القيامة " [1]

اے اسامہ! جب قیامت کے دن اللہ کا دربار قائم ہوگا اور تم اللہ کے سامنے کھڑے ہوگے، اگر اس کا کلمہ تمہارے سامنے آ گیا، تو تم کیا جواب دو گے؟

اے اسامہ! اس کے کلمے کا کیا کرو گے؟ اے اسامہ! اس کے لا إله الا الله کا کیا جواب دو گے؟ تین بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔یعنی اس دعوت کی کس قدر اہمیت ہے کہ فرمایا اس حساس موقع پر بھی اس کے کلمہ پڑھنے کو قبول کرلو، اس کو چھوڑ دو اور اس پر وار نہ کرو!

کفار کی عہد شکنی:

چنانچہ فرمایا:﴿ إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا ﴾ [الفتح: ١]

---

[1] صحیح مسلم: كتاب الإيمان، باب تحريم قتل الكافر بعد أن قال لا إله إلا الله، رقم الحديث (٩٧) مسند أحمد (٥/٢٠٧)

اس آیت میں فتح مبین سے مراد صلح حدیبیہ ہے۔ کیونکہ ہماری دعوت کے راستے کھل گئے اور لوگ جوق در جوق آرہے ہیں، اسلام کی پوری تاریخ میں اتنے لوگ مسلمان نہیں ہوئے، جتنے ان دو سالوں میں ہوئے، وجہ یہ کہ صلح حدیبیہ فتح مکہ کی تمہید بن گئی، کیونکہ کفار کی فطرت اور جبلت کیا ہے؟ کفار تو عہد شکن ہیں، یہ اپنے عہد پر قائم نہیں رہتے، قرآن کہتا ہے:

﴿لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ﴾ [التوبة: ١٢] ''ان کو اپنے عہد کا کوئی پاس نہیں''۔

اپنے مفاد کی خاطر وہ اپنے میثاق کو توڑ دیتے ہیں۔ یہ دس سال کا معاہدہ تھا، لیکن دو سال بھی اس پر قائم نہ رہ سکے، تھوڑی سی معیشت بحال ہوئی، تو پھر ان کو مستی سوجھی۔ انہوں نے مسلمانوں کے حلیفوں کے خلاف اپنے حلیفوں سے تعاون بھی کیا اور فوجی اور عددی طاقت بھی فراہم کی، نبی علیہ السلام کو خبر مل گئی، آپ نے صحابہ سے کہا کہ تیار ہو جاؤ، آپ نے سمت کا تعین بھی نہیں کیا۔ یہ ایک لمبی کہانی اور لمبا قصہ ہے ۔پھر اسی نتیجے میں آپ نے مکہ پر حملہ کیا اور مکہ فتح ہوا اور سوائے دس افراد کے سب لوگ اسلام میں داخل ہوگئے۔ چنانچہ یہ صلح حدیبیہ فتح مکہ کی تمہید بن گئی کہ کفار اپنے عہد کا پاس نہ کر سکے، انہوں نے عہد توڑا اور جونہی عہد شکنی ظاہر ہوئی ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہلت دیے بغیر ان پر حملہ کر دیا اور مکہ فتح ہوگیا۔

صلح حدیبیہ کی اہمیت:

ان کئی وجوہات کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صلح حدیبیہ کو اصل فتح مبین قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ صلح حدیبیہ کی بدولت صحابہ کی عظمت، ان کی فضیلت اور ان کی منقبت ظاہر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کے حال اور ان کے ایمان کی صلابت کو عیاں فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو سکینت دے دی، اپنی رضا کا اعلان کر دیا اور فتح

خیبر کی صورت میں دنیاوی اعتبار سے مالا مال کر دیا۔ دعوت کا راستہ بھی ہموار کر دیا، دعوت بحال ہوگئی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوگئے، پھر یہ صلح حدیبیہ فتح مکہ کی تمہید اور مقدمہ بن گیا۔ لہٰذا اصل فتح مبین صلح حدیبیہ ہے، ابوسفیان نے کہا:

”في المدة التي ماد فيها رسول الله ﷺ كفار قريش“

یہ شام کی تجارت کا واقعہ اس مدت کے دوران ہوا، جس مدت میں رسول اللہ ﷺ نے کفار قریش سے صلح کی تھی۔

تو صلح کی مدت دس سال کی تھی، اسی دوران یہ قافلہ مکہ سے نکلا اور شام پہنچا اور اسی دوران ہرقل کو نبی علیہ السلام کا خط مل گیا۔

مکتوب نبوی کا اثر:

اس نے خط پڑھ کر یہ الفاظ کہے: ”لم أسمع بمثله“ اس جیسا خط میں نے آج تک دیکھا اور نہ سنا ہے، اتنی جامع عبارت اور تحریر میں اتنا استغناء! یہ آپ آگے ملاحظہ کریں گے، اس نے کہا کہ جاؤ! میرے ملک شام کی ایک ایک اینٹ کو کرید کر دیکھو اور ایسے شخص کو لاکر میرے سامنے پیش کرو، جو اس خط لکھنے والے کو جانتا ہو، یہ کون ہے؟ محمد (ﷺ) کون ہے؟ میں اس کے بارے میں کچھ معلومات چاہتا ہوں، اس خط کو پڑھ کر اس پر ہیبت طاری ہوگئی تھی۔ چنانچہ ہرقل کے قاصد شام میں پھیل گئے، انہی میں سے کچھ غزہ میں بھی گئے، جہاں ان کو اطلاع ملی کہ یہاں مکہ کا ایک تجارتی قافلہ آیا ہے، اس قافلے میں تیس افراد شریک تھے، چنانچہ وہ ان سب کو گھیر کر ایلیاء مقام پر لے گئے، جہاں ہرقل موجود تھا۔

ہرقل ایلیاء میں:

”ایلیاء“ عبرانی زبان کا لفظ ہے، جس کا معنی بیت اللہ یا بیت المقدس ہے،

ایلیاء ان کے ہاں ایک مقدس جگہ تھی۔ روایتوں میں یہ بات موجود ہے کہ جب شام کی فوجوں نے کسریٰ شاہ ایران کی فوجوں کو شکست دی، تو ہرقل اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے ایلیاء آیا، وہ چل کر بیت المقدس میں آیا تھا،[1] یہ چلنا ایک شکریہ تھا، اس مقام پر بیٹھنا اللہ کا شکر ادا کرنا تھا، یہ مقام جو ان کے ہاں دین کے تقدس کی جگہ تھی، ہرقل یہاں آیا اور ہرقل کے ساتھی ان تیں قریشیوں کو گھیر کر اس کے پاس لے آئے۔

مجلس کا آغاز:

" فدعاهم في مجلسه، وحوله عظماء الروم "

ہرقل نے ان تیں قریشیوں کو اپنی مجلس میں بلا لیا، جو اس کی خاص نشست تھی، ہرقل کے اردگرد روم کے علماء، امراء، عظماء اور روم کے سردار بیٹھے ہوئے تھے، ان کے بڑے بڑے پادری، بطارقہ اور قسیسین بیٹھے ہوئے تھے اور پورا دربار اس وقت قائم تھا۔

" ثم دعاه ودعا بترجمانه " ہرقل نے ابوسفیان کو قریب کر لیا اور اپنے ترجمان کو بھی بلا لیا، کیونکہ ہرقل کی زبان عبرانی تھی، وہ عربی نہیں جانتا تھا۔ اس نے اپنے ترجمان کو بلا لیا کہ تم میری عبرانی کا عربی میں ترجمہ کرو اور اس کی عربی کا عبرانی میں ترجمہ کر کے مجھے پیش کرو، تا کہ میں بات کو سمجھ سکوں۔

دعوت دین کے لیے غیر مسلموں کی زبان سیکھنا:

اس وقت عبرانی زبان معروف تھی ۔رسول اللہ ﷺ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: " تعلم السريانية " تم عبرانی زبان سیکھ لو، تا کہ ہماری دعوت کے کام آئے اور ہم عبرانی میں دعوت دے سکیں، بعض اوقات عبرانی زبان کے قاصد ہمارے پاس آتے ہیں، تم ان کی بات کا ترجمہ کر سکو اور بعض اوقات عبرانی خطوط میرے پاس

[1] دیکھیں: فتح الباري (١/ ٣٤)

آتے ہیں، تم ان خطوں کو پڑھ کر مجھے سنا سکو۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے سترہ دن میں عبرانی زبان سیکھ لی۔ [1]

ایک اہم نقطہ:

یہاں بھی ایک نقطہ ہے، اس پر توجہ کیجئے، وہ نقطہ یہ ہے کہ اس وقت عبرانی زبان کا طوطی بولتا تھا، جیسے آج انگریزی زبان کا طوطی بولتا ہے، اس وقت عبرانی زبان کی شہرت تھی، جیسے آج انگریزی زبان کی شہرت ہے، لیکن پیغمبر علیہ السلام نے تمام اہل مدینہ کو نہیں فرمایا تھا کہ سب کے سب عبرانی زبان سیکھ لو، سب کے سب اس مذہب کی طرف لپکو، اس کو پڑھو اور اعلیٰ سے اعلی فیسیں دے کر پڑھو! آج ہم میں کیا کسر نفسی آگئی ہے؟ ہم نے اپنے آپ کو اپنے مقام سے گرا دیا ہے، ہم پر انگریزی زبان کی ہیبت طاری ہے، ہمارا بچہ اونچے اونچے سکول میں انگریزی پڑھے، یہ ہمارے لیے سرمایۂ فخر ہے، یہ سرمایۂ فخر ہے کہ قعر ذلت؟

نبی علیہ السلام کا استغناء دیکھو! نبی علیہ السلام کی شان دیکھو! روم ایک عظیم طاقت ہے، یہ امریکہ اس کے مقابلے میں کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں! آج کا امریکہ، آج کا روس، آج کا چائنہ اور آج کا ہندوستان اکٹھا کر دیا جائے، تو کوئی روم کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا، لیکن پیغمبر علیہ السلام کا استغناء اور شان بے نیازی دیکھو، یہ نہیں کہ اس زبان کو سب ہی سیکھیں، اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے اس کو پڑھیں، نہیں! فرمایا کہ زید صرف تم سیکھو، سیکھنے کی ضرورت یہ ہے کہ ان کے قاصد آتے ہیں، خط آتے ہیں، تم

---

[1] سنن أبي داود: كتاب العلم، باب رواية حديث أهل الكتاب، رقم الحديث (٣٦٤٥) سنن الترمذي: كتاب الاستئذان، باب ما جاء في تعليم السريانية، رقم الحديث (٢٧١٥) وقال الترمذي: " هذا حديث حسن صحيح " مسند أحمد (٥/ ١٨٦) صحيح ابن حبان (١٦/ ٨٤)

اس کا ترجمہ کر سکو اور بعض کفار کو عبرانی میں دعوت دے سکو۔ یہ کیا بات ہوئی کہ پوری قوم ایک طرف لگی ہوئی ہے!

رزق کے خزانے اللہ کے ہاتھ میں ہیں:

میرے بھائیوں اور دوستو! اللہ پاک نے فرمایا:

﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ [البقرة: ١٩٥]

''اپنے ہاتھوں کو ہلاکت کی طرف نہ ڈالو۔''

اللہ پاک کا فرمان ہے کہ اپنی اولاد کو فاقے کے ڈر سے قتل نہ کرو، [1] یہ انگریزی کیوں پڑھاتے ہیں؟ تاکہ یہ کل کچھ کمانے کے لائق ہو سکیں، ورنہ یہ بھوکے مر جائیں گے۔ یہ بھی اس آیت کی تفسیر ہے کہ فاقے کے ڈر سے اپنے بچوں کو قتل نہ کرو کہ آج انگریزی پڑھ لیں، اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیں، تو کل یہ کچھ کمانے کے قابل ہو جائیں گے۔ کیا تم رب العالمین ہو گئے ہو؟ رب العالمین تو اوپر ہے، رزق کے خزانے تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں، یہ فیصلے تمہارے ہاتھ میں نہیں۔ تم اپنی اولاد کی بہتری کا سوچو اور ان کی بہتری دینی مدارس میں ہے، یونیورسٹی، کالجوں اور سکولوں میں نہیں!

انگریزی تعلیم کی طرف پوری قوم لگی ہوئی ہے، یہ کونسا منہج ہے؟ منہج تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف دعوت و حکمت کی خاطر اپنے ایک صحابی کا انتخاب کیا تھا، یہ نہیں کہ پوری قوم کو لگا دیا اور پوری قوم کے بچوں کو لگا دیا کہ سب کے سب پڑھو، یہ ترقی کی زبان ہے، آج روم کا طوطی بولتا ہے، روم نے فارس کو بھی شکست دے دی، وقت کی سپر پاور ہے، سبھی اس زبان کو حاصل کرو، نہیں! یہ استغناء ہے کہ ایک صحابی کو مامور کیا اور دعوت کے تقاضے اس سے پورے ہو گئے۔

---

[1] الإسراء: ١٥

ہماری اولاد کی بہتری کہاں ہے؟

آج اپنے بچوں کی بہتری چاہتے ہو، تو ان کو دین پڑھاؤ، یہ دین تمہارے مرنے کے بعد تمہارے کام آئے گا، انگریزی پڑھ کے ممکن ہے دنیا میں ترقی کر جاؤ، لیکن دنیا کی ترقی کا تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟ کچھ سوچو! تمہاری اور تمہاری اولاد کی بہتری کس چیز میں ہے؟ کالجوں کا ماحول دیکھو! یونیورسٹیوں کا ماحول دیکھو! مخلوط تعلیم دیکھو! پھر جان بوجھ کے اس بربادی، اس جہنم اور اس تندور میں اپنی اولاد کو کیوں جھونکتے ہو؟

یہ دینی مدارس درحقیقت ان کی تعلیم و تربیت کے قلعے ہیں، دنیا اور آخرت کے لیے ان کے محافظ ہیں، رزق کے خزانے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔تو یہاں یہ نقطہ موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عبرانی زبان کی تعلیم پر صرف ایک صحابی کو مامور کیا تھا۔

مکالمہ:

ہرقل کے پاس نبی ﷺ کا خط پہنچ چکا تھا، اس نے نبی ﷺ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ابوسفیان کو، جو ایک تجارتی قافلے کے ساتھ روم میں موجود تھے، اپنے دربار میں بلالیا، یہ کل تیس افراد تھے، جب وہ ہرقل کے دربار میں پہنچے، تو ہرقل نے پوچھا:

”أيكم أقرب نسباً بهذا الرجل الذي يزعم أنه رسول الله“

تم میں سے وہ شخص کون ہے، جو نسب کے اعتبار سے اس شخص کے سب سے زیادہ قریب ہے، جس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے؟

ابوسفیان نے کہا کہ میں ہوں۔ ہرقل کا یہ سوال اس کی ذہانت کی دلیل ہے، کیونکہ نسبی قرابت دوسروں کی بہ نسبت زیادہ معرفت کی دلیل ہے، کسی شخص کے بارے میں عام لوگ اس قدر نہیں جانتے، جس قدر رشتہ دار زیادہ جانتے ہیں، کیونکہ

وہ زیادہ سنجیدگی سے معلومات چاہتا تھا، لہٰذا اس نے پوچھا: تم میں سے سب سے زیادہ کس کا رشتہ قوی ہے اور نسب کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریبی کون ہے؟ ابو سفیان نے کہا کہ میں ہوں۔

نسب نامہ:

ابوسفیان کا کہنا ہے کہ اس وقت میں واحد شخص تھا، جو عبد مناف کی اولاد میں سے تھا، عبد مناف نبی ﷺ کا چوتھا دادا ہے، گویا ابوسفیان کا نسب نبی ﷺ کے نسب سے چوتھے دادے پر مل جاتا ہے، نبی ﷺ کا نسب اس طرح ہے:

''محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف۔'' عبد مناف نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا چوتھا دادا ہے، ابوسفیان کا نسب اس طرح ہے: ''ابوسفیان بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف!'' نبی ﷺ کے ساتھ ابوسفیان کا یہ رشتہ ہے۔

ہرقل کی فراست:

چنانچہ ہرقل نے حکم دیا کہ " أدنوه مني " اس شخص یعنی ابوسفیان کو میرے بالکل قریب بٹھا دو، یعنی اس میں شدت حرص ہے، وہ اس خط کو پڑھ کر یہ کہہ اٹھا تھا کہ اس جیسا خط میں نے آج تک نہیں دیکھا، چنانچہ ابوسفیان کو بالکل قریب بٹھا لیا اور کہا: "قربوا أصحابه " کہ جو اس کے قافلے کے دیگر ساتھی ہیں، انہیں بھی بالکل قریب بٹھا دو۔

"واجعلوهم عند ظهره" اور اس کے ساتھیوں کو اس کی پشت کے پیچھے بٹھاؤ، سامنے نہ بٹھاؤ، جب یہ بات کرے تو اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو دیکھ نہ رہا ہو، یہ بھی اس کی ذہانت ہے کہ بعض اوقات بندہ جھوٹ بولنے پر آتا ہے اور ساتھیوں کو

دیکھ رہا ہے، اسے معلوم ہے کہ میں جھوٹ بولنے لگا ہوں، تو ساتھیوں کو اشارہ کر سکتا ہے کہ تم یہ بات سن لو اور خاموش رہو۔ دوسری بات یہ کہ اگر وہ جھوٹ بولے گا اور ساتھیوں کا چہرہ سامنے ہوگا، تو ہوسکتا ہے کہ ساتھی شرما جائیں کہ ہم اپنے دوست کی تردید نہ کریں اور اپنے دوست کو نہ جھٹلائیں، چنانچہ اس طرح بٹھاؤ کہ دوران گفتگو ابو سفیان ان میں سے کسی کا چہرہ نہ دیکھے اور اس کے ساتھی ابوسفیان کا چہرہ نہ دیکھیں۔

یہ جھوٹ سے بچنے کا ایک بہت بڑا امکان پیدا کرنا ہے اور پھر ساتھ ہی ہرقل نے ابوسفیان کے ساتھیوں سے کہا: " إني سائل هذا الرجل " میں اس شخص (ابوسفیان) سے محمد (ﷺ) کے بارہ میں کچھ باتیں پوچھنے والا ہوں، کچھ سوال کرنے والا ہوں: "إن كذبني فكذبوه " اگر اس نے کوئی جھوٹ بولا، تو تم فوراً مجھے بتانا، اس کی نشاندہی اور اس کی تکذیب کرنا، ابوسفیان کا کہنا ہے:

" فوالله لو لا الحياء من أن يأثروا علي كذبا لكذبت عنه " اگر شرم و حیا نہ ہوتی، کس بات کی؟ کہ کل تاریخ میں میری طرف جھوٹ منسوب کیا جائے گا، تو میں ضرور جھوٹ بولتا۔ محمد ﷺ کی عداوت ہمارے سینوں اور دل و دماغ میں اس قدر رچ بس چکی تھی کہ اس کے لیے میں جھوٹ تک بولنے پر آمادہ تھا۔ لیکن یہ سوچ کر کہ اگر ہرقل کے دربار میں میری تکذیب ہوئی، تو ایک مستقل جھوٹ میرے نام پہ لگ جائے گا اور یہ بدنامی! مجھے شرم آ گئی، میں نے یہ طے کر لیا کہ جو بھی جواب دوں گا، سچا جواب دوں گا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جھوٹ کی تہمت یا جھوٹ کی شہرت کو اس جاہلی معاشرہ میں بھی واقعتاً برا سمجھا جاتا تھا، وہ بھی جھوٹ سے خائف تھے اور جھوٹ سے بچتے تھے، کیونکہ جھوٹ ایک برائی، ایک خامی اور ایک عیب تھا، یہ بات وہ اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے، حالانکہ وہ جاہلی معاشرہ تھا۔

جھوٹ کی مذمت:

اس سے جھوٹ کی برائی اور مذمت ثابت ہوتی ہے، اس لیے پیغمبر ﷺ کا فرمان ہے: " المؤمن لا يكذب " مومن سے توقع ہے کہ وہ ہر گناہ کرسکتا ہے، لیکن جھوٹ نہیں بول سکتا، ایک شخص اگر مومن ہے اور جھوٹ بھی بولتا ہے، تو اسے اپنے ایمان پر نظر ثانی کرنی چاہیے، کیونکہ مومن جھوٹ نہیں بول سکتا۔

"إياكم والكذب ، فإن الكذب يهدي إلى الفجور، وإن الفجور يهدي إلى النار "[1] جھوٹ سے بچو! اس لئے کہ جھوٹ گناہوں کا راستہ کھولتا ہے، ایک جھوٹ سے گناہوں کے کئی دروازے کھل جاتے ہیں اور بندہ بہت سے گناہوں میں ملوث ہوسکتا ہے اور جھوٹ جب گناہوں کے راستے کھولے گا، تو گناہوں سے جہنم کے کئی دروازے کھل جائیں گے، یعنی جھوٹ وہ گناہ ہے، جو بندے کے لیے جہنم کا راستہ ہموار کر دیتا ہے، فرمایا:

" ولا يزال المرء يكذب حتى يكتب عند الله كذاباً"

اور ایک شخص اپنی زندگی میں ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے، حتی کہ اللہ تعالیٰ یہ حکم دے دیتا ہے کہ اس شخص کو کذاب لکھ دو، اب وہ دنیا میں جتنا بھی معتبر ہو اور جھوٹوں کا سہارا لے کر جتنا بھی اپنا سکہ قائم کر لے، لیکن وہ آسمانوں میں کذاب ہوتا ہے، فرشتوں کی لسٹ میں کذاب ہوتا ہے، جس کے لیے بڑا بھیانک عذاب ہے، اس کا عذاب تو عالم برزخ سے شروع ہوجاتا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الأدب، باب قول الله تعالىٰ: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ وما ينهى عن الكذب، رقم الحديث (٥٧٤٣) صحيح مسلم: كتاب البر والصلة، باب قبح الكذب وحسن الصدق وفضله، رقم الحديث (٢٦٠٧) سنن أبي داود: كتاب الأدب، باب التشديد في الكذب، رقم الحديث (٤٩٨٩)

جھوٹ کا خوفناک انجام:

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ آپ نے ایک طویل خواب دیکھا، وہ خواب صحابہ کو سنایا، اس کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ فرشتے آپ کو ایک ایسے شخص کے پاس لے گئے، جو چت لیٹا ہوا ہے اور اس پر ایک شخص سوار ہے: " بیدہ کلوب من حدید " اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک نوک دار کڑا ہے، وہ کڑا اس کے منہ میں ڈالتا ہے اور اس کے منہ کو گدی تک چیرتا جاتا ہے، پھر اس کی ناک میں ڈالتا ہے اور ناک کو بھی گدی تک چیرتا ہے، پھر اس کی آنکھ میں گھونپ دیتا ہے اور اس کو بھی گدی تک چیر دیتا ہے، پھر بائیں طرف آجاتا ہے اور بائیں طرف بھی یہی سلوک کرتا ہے، جب وہ اپنے اس پورے عمل سے فارغ ہوتا ہے، تو اس کا چہرہ دوبارہ اپنی اصلی حالت میں آجاتا ہے، پھر وہ دوبارہ اس چیر پھاڑ کا عمل شروع کر دیتا ہے، یہ شخص چیخ اور چلا رہا ہے، اس کی چیخیں گونج رہی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: " سبحان اللہ ما ذنبہ " اس کا کیا گناہ ہے؟ اسے یہ سزا کیوں دی جا رہی ہے؟ جبریل امین فرماتے ہیں: "کان یکذب الکذبة " یہ جھوٹ بولا کرتا تھا اور اس کی جھوٹ میں ایک خاص نیت ہوتی تھی:

" يغدو من بيته فيكذب الكذبة، تبلغ الأفاق " [1]

اس کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اس کا یہ جھوٹ دنیا کے کونے کونے میں پہنچ جائے، اس کا یہ جھوٹ پھیل جائے، یہ جھوٹ وہی ہوتا ہے جو بندہ کسی کو اپنے کارنامے دکھانا چاہے، چاہے وہ جھوٹ ہی کیوں نہ ہو، اپنی شہرت چاہے، مال چاہے، جھوٹ بول بول کر اپنے آپ کو اونچا کروں، اپنی تنظیم کو اونچا کروں، تاکہ لوگوں سے مال بٹوروں، اس وعید کے زیادہ یہی شکار ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري: كتاب التعبير، باب تعبير الرؤيا بعد صلاة الصبح، رقم الحديث (٦٦٤٠)
صحيح مسلم: كتاب الرؤيا، باب رؤيا النبي صلى الله عليه وسلم، رقم الحديث (٢٢٧٥)

ہنسی مذاق میں جھوٹ بولنا:

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو شخص صرف لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے، فرمایا: قیامت کا دن ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کو جہنم میں ڈال دیں گے اور اس کے لیے جہنم کا ایک طبقہ ویل ہے، تین بار فرمایا[1] پھر وہ ویل میں ہی رہے گا، وہی اس کا ٹھکانا ہوگا، جہاں پر اس کو عذاب دیا جائے گا، اس عذاب سے کوئی مفر نہیں، یہ جھوٹ کا اتنا سخت انجام ہے، اللہ پاک نے فرمایا:

﴿ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴾ [آل عمران: ٦١]

''جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں، ان پر اللہ کی پھٹکار ہے۔''

اور یہ ایک بڑا تکلیف دہ موقف ہے کہ جھوٹا دنیا میں اللہ کی لعنتوں کا مستحق ہوتا ہے، مرتے ہی عذاب قبر میں جھونک دیا جاتا ہے اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب کا مستحق ہوگا۔

سچ کی فضیلت:

جب کہ سچ! یہ ایک منقبت اور فضیلت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" وعليكم بالصدق فإن الصدق يهدي إلى البر "

سچائی کو لازم پکڑو، سچائی کو اپنا لو، کیونکہ سچائی سے نیکیوں کے راستے کھلتے ہیں۔

''وإن البر يهدي إلي الجنة " ''نیکیاں انسان کو جنت میں پہنچا دیتی ہیں۔'' سچائی اس کی مفتاح ہے۔

" ولا يزال الرجل يصدق حتى يكتب عند الله صديقاً ."[2]

---

[1] مسند أحمد (٧٠٤/٥)

[2] صحيح البخاري: كتاب الأدب، باب قول الله تعالىٰ: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ وما ينهى عن الكذب، رقم الحديث (٥٧٤٣) صحيح مسلم: ←

اور بندہ دنیا میں ہر مقام اور ہر موقع پر سچ بولتا ہے، سچائی اس کا شیوہ بن جاتی ہے، اللہ تعالیٰ جب دیکھتا ہے کہ بندہ ہر مقام پر سچ بولتا ہے، تو فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس کو صدیق لکھ دو، میری لسٹ میں یہ بندہ صدیق ہے اور انبیاء کے بعد صدیقین کا مقام ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کو منہج کی صداقت دے دیتا ہے، اس کا عقیدہ سچا، نیت سچی، تعلق باللہ سچا، منہج سچا، دین کے ساتھ تعلق سچا، یہ سچائی اگر چند لوگوں کے اندر پیدا ہو جائے، تو وہ پوری دنیا میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔

غلبے کی اساس:

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"لن يغلب اثنا عشر ألفا من قلة إذا صبروا وصدقوا."[1]

میری امت کے افراد اگر بارہ ہزار ہو، تو پوری دنیا مل کر ان کو مغلوب نہیں کر سکتی، شرطیں دو ہیں: " إذا صبروا وصدقوا " وہ صبر کرنے والے اور سچے ہوں، گفتار کے سچے ہوں، عقیدے کے سچے ہوں، اللہ کے ساتھ ان کا بڑا راست اور سچا تعلق ہو، نبیٔ پاک ﷺ کے ساتھ سچا تعلق ہو، ان کے منہج میں صداقت ہو، اگر یہ صرف بارہ ہزار بھی ہونگے، یہ کفار کے جتھے، ان کی طاقتیں اور ان کی ایٹمی قوتیں انہیں مغلوب نہیں کر سکیں گی، سچائی اور صبر کی قوت اتنی بڑی قوت ہے کہ کوئی قوت اس پر غالب نہیں آ سکتی، یہی دنیا کے غلبے، حکمرانی اور قبر و آخرت میں کامیابی کا راز ہے اور افراد اگر جھوٹے ہوں، جتھوں کے جتھے لگ جائیں، جھوٹ ان کا منہج ہو، جھوٹ ان کا پروگرام ہو، تو یہ کثرت اور جتھے کسی کام کے نہیں ہیں۔

← كتاب البر والصلة، باب قبح الكذب وحسن الصدق وفضله، رقم الحديث (٢٦٠٧) سنن أبي داود: كتاب الأدب، باب التشديد في الكذب، رقم الحديث (٤٩٨٩)

[1] سنن أبي داود: كتاب الجهاد، باب فيما يستحب من الجيوش والرفقاء والسرايا، رقم الحديث (٢٦١١) سنن الدارمي (٢/٢٨٤) صحيح ابن خزيمه (٤/١٤٠) صحيح ابن حبان (١١/١٧)

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"إنما الناس كإبل مائة لا تكاد تجد فيهم راحلة"[1] لوگوں کی کثرت کی مثال تو ان سو اونٹوں کی سی ہے، جن کو آپ خریدیں، ایک زرِ خطیر خرچ کر کے ان کو پالیں پوسیں، کھلائیں پلائیں، لیکن جب تمہیں سواری کی حاجت ہو، تو کوئی بھی ان میں سواری کے قابل نہ ہو، ان کا کیا فائدہ ؟ یہ کثرت ! یہ جتھے! اور یہ اجتماعیت! لوگوں کی بھیڑ بھاڑ ! بوقت ضرورت دین کے کام کوئی نہیں آتا، تو یہاں منہج کی بڑی صداقت چاہیے۔

عہدِ جاہلیت میں جھوٹ سے نفرت:

لہٰذا صداقت اتنی بڑی منقبت ہے کہ کفارِ قریش بھی اس بات کو جانتے تھے، وہ خائف ہیں کہ ہماری طرف جھوٹ منسوب نہ ہو، ہم اس سے بچیں، چنانچہ ابوسفیان نے کہا کہ محمد ﷺ کی عداوت ہمارے دلوں میں اس طرح راسخ تھی کہ اگر مجھے ڈر نہ ہوتا کہ میں کوئی جھوٹ بولوں اور میرے ساتھی اس کی نشاندہی کر دیں، تو پھر تاریخ میں میرے نام پر وہ جھوٹ الاٹ ہو جائے، یہ تو میرے لئے بڑی ندامت اور ذلت کی بات ہوگی، لہٰذا بندہ بڑا سوچ سمجھ کر بولے، کسی موقع پر وہ جھوٹا قرار نہ پا جائے، کیونکہ جھوٹ کی یہ تہمت انتہائی بری تہمت ہے، ابوسفیان نے کہا کہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ایک لفظ بھی غلط نہیں کہنا، ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں کہنا، عداوت، غصہ بہت ہے اور کینہ بہت ہے، وہ سارے زخم ان کو یاد تھے، جو بدر میں انہیں پہنچے، ہمارے ستر سردار جنہیں میدان بدر میں قتل کر دیا گیا، ان میں سے ایک ایک یاد آ رہا تھا، لیکن میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ سچ بولنا ہے، جھوٹ نہیں بولنا۔

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الرقاق، باب رفع الأمانة، رقم الحديث (٦١٣٣) صحيح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب قوله صلى الله عليه وسلم: الناس كإبل مائة، لا تجد فيها راحلة، رقم الحديث (٢٥٤٧) مسند أحمد (١٣٩/٢)

ہرقل کا پہلا سوال:

اب یہ مجلس قائم ہوگئی، ہرقل کی ترتیب کے مطابق سب بیٹھ گئے، اس نے پہلا سوال کیا: " کیف نسبه فیکم؟ " پہلے یہ بتاؤ کہ محمد ﷺ کا نسب کیسا ہے؟ اس کے خاندان اور نسب کا کچھ تعارف کراؤ، کیونکہ یہ ایک بڑی قوی اساس ہے، خاندان کو دیکھا جائے گا، نسب کو دیکھا جائے گا۔ نبی ﷺ کا نسب تو آدم علیہ السلام تک معروف تھا، ابوسفیان نے کہا: " ھو فینا ذو نسب " اس کا نسب ہم میں بہت اونچا ہے اور اس کا خاندان بڑا اعلیٰ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم سے اولاد اسماعیل کو چن لیا، اولاد اسماعیل سے قریش کو چن لیا اور قریش میں سے بنو ہاشم کو چن لیا اور بنو ہاشم میں سے مجھے چن لیا۔ یہ پوری کائنات کے قریب چنا ہوا خاندان ہے اور چنے ہوئے خاندان میں سے چنی ہوئی شخصیت ہے۔ [1]

نسب کی اہمیت:

یہ اس دور کے کفار تھے، جنہیں خاندانی وجاہتوں اور نسب کا احساس تھا کہ یہ ہونا چاہیے، نسب نامے معلوم اور خالص ہونے چاہئیں، آج کے کفار تو اس بات کو معدوم کر چکے ہیں، آج یورپ میں ایسے بچے بہ کثرت ملتے ہیں کہ ان کے باپ کا علم نہیں، ایسے بچے بھی ہیں کہ ماں کا بھی علم نہیں، کتے کتی کا عمل ہوا، بچہ پیدا ہوا، کہیں پھینک کر چلے گئے، پتا ہی نہیں کون باپ ہے؟ کون ماں ہے؟ اور آج یورپ کے کفار کو ہماری اسی چیز پر حسد ہے کہ ہمارے خاندان معروف ہیں، ہمارا نسب معلوم ہے اور یہ ایک بڑی قوی اور اہم اساس ہے، جو ہرقل نے سب سے پہلے پوچھی کہ محمد (ﷺ) کا نسب کیسا ہے؟

---

[1] صحيح مسلم: كتاب الفضائل، باب فضل نسب النبي صلى الله عليه وسلم قبل النبوة، رقم الحديث (٢٢٧٦) المستدرك للحاكم (٩٧/٤)

معیارِ شرافت:

ان خاندانی وجاہتوں اور نسب کی عظمت سے بھی بات کی عظمت معلوم ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ یہ برادریاں اور برادری کی تقسیمیں یہ معیار شرافت نہیں، لیکن نسب کا محفوظ ہونا اور خالص ہونا یہ بھی ایک اعلیٰ شرافت ہے، باقی یہ برادریوں کی تقسیم کسی تفاضل کا معیار نہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

" لا فضل لعربي علي عجمي، ولا لعجمي علی عربي، ولا لأبيض علی أسود، ولا لأسود علی أبيض إلا بالتقویٰ."[1]

''کسی عربی کو عجمی پر، کسی عجمی کو عربی پر، کسی گورے کو کالے پر، کسی کالے کو گورے پر کوئی فوقیت نہیں، مدار فوقیت اور معیار برتری صرف تقویٰ، پرہیز گاری اور اللہ کا خوف ہے۔''

برتری کی بنیاد:

اللہ پاک نے ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ﴾ [الحجرات: ١٣]

اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز کون ہے؟ یہ برادریوں کی تقسیمیں نہیں کہ فلاں برادری اعلی اور فلاں برادری اللہ کے ہاں افضل ہے، نہیں! اللہ کے ہاں افضل وہ ہے، جو زیادہ پرہیز گار اور متقی ہو اور جس کا سینہ، جس کا عمل، کردار، منہج اور عقیدہ تقویٰ کے نور سے آراستہ ہو، اللہ کی فہرست میں وہ افضل، اعلیٰ اور برتر ہے اور اگر تقویٰ نہیں ہے، اللہ کا خوف نہیں ہے، عقیدہ درست نہیں ہے، توحید نہیں ہے، تو اللہ پاک نے ﴿ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ﴾ [البينه: ٦] کہا ہے، پھر وہ انسان چاہے کتنی

---

[1] مسند أحمد (٤١١/٥)

اونچی برادری کا ہو، وہ سب سے بدتر ہے، انسانوں ہی سے نہیں بلکہ غلاظت اور گٹر کے کیڑوں مکوڑوں سے بھی بدتر ہے، اب جس کے پاس توحید نہیں، ایمان نہیں، عقیدہ نہیں، تقویٰ نہیں، اللہ کے ساتھ تعلق نہیں، تو پھر چاہے وہ کسی بھی خاندان کا ہو، کسی بھی برادری کا ہو، کسی بھی قوم کا ہو، کسی بھی منصب پر ہو اور کتنی ہی دولت کا مالک ہو، فرمایا کہ وہ ﴿ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ﴾ ہے۔مخلوق میں بدترین انسان ہے۔

ہرقل کا تجزیہ:

چنانچہ ہرقل نے پوچھا کہ اس کا نسب کیسا ہے؟ ابوسفیان نے جواب دیا کہ " هو فينا ذو نسب " وہ بڑا عالی النسب اور بڑے عظیم نسب کا مالک ہے، ہرقل نے اس کا جواب دیا کہ ہاں یہ بات درست ہے، جو سچا نبی ہوتا ہے، وہ نسب والا ہوتا ہے، اس کے آباء و اجداد کی ایک بڑی مبارک لڑی ہوتی ہے، اس لحاظ سے کہ ان میں دنیوی اعتبار سے کوئی عیب نہیں ہوتا۔

اگر اس کا نسب اعلیٰ ہے، نسبی اعتبار سے وہ برتر ہے اور تم اس کی گواہی دیتے ہو، تو یہ ایک علامت پیدا ہوگئی کہ وہ سچا نبی ہے، اس نے کہا: " كذلك الأنبياء تبعث في نسب قومها " انبیاء بھی بڑے اونچے خاندان اور اعلیٰ نسب کے ہوتے ہیں، کوئی نبی ایسا نہیں ہوا کہ جس کے نسب میں کسی مقام پر کوئی انگلی اٹھا سکے کہ تمہارا باپ ایسا تھا، تمہارا دادا ایسا تھا، کوئی نبی ایسا نہیں گزرا، لہٰذا یہ اس کے سچا نبی ہونے کی ایک بڑی قوی علامت ہے، کیونکہ جو اللہ کے انبیاء ہوتے ہیں، اللہ کے رسول ہوتے ہیں، وہ بڑے اعلیٰ نسب کے مالک ہوتے ہیں۔

ہرقل کا دوسرا سوال:

دوسرا سوال یہ کیا کہ " هل قال هذا القول أحد منكم؟ " کیا تمہارے

خاندان اور برادری میں کسی نے اس سے قبل نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟ ابوسفیان نے جواب دیا: "لا " نہیں! ایسا کبھی نہیں ہوا، ہمارے خاندان میں یہ پہلا شخص ہے، جو نبی ہونے کا دعویدار ہے۔

ہرقل کا تبصرہ:

ہرقل نے کہا کہ بات اور بہتری کی طرف جارہی ہے، اگر کوئی ایسا شخص ہوتا: " قلت: تأسیٰ بقول قیل قبله " پھر میں کہتا کہ یہ شخص اسی دعویٰ کی نقل کر رہا ہے، جو آج سے پہلے اس کے باپ دادوں میں سے کسی نے کیا تھا۔

جب اس کے پورے خاندان میں کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا، نہ اس کے باپ نے، نہ دادا نے، نہ پردادا نے، تو یہ بات اس کے حق میں ہے کہ وہ اللہ کا سچا نبی ہے، اگر پوری برادری اور پوری قوم میں کوئی ایسا شخص ہوتا، جس نے کوئی ایسا دعویٰ کیا ہوتا، تو یہ بات کہی جاسکتی تھی کہ اُسی دعویٰ کی نقل میں اس دعویٰ کو اپنایا جارہا ہے اور وہی جراثیم اس شخص میں منتقل ہوگئے ہیں۔

ہرقل کا تیسرا سوال:

تیسرا سوال یہ ہے کہ " هل كان من آبائه من ملك؟ " اس کے خاندان اور اس کے آباء و اجداد میں کوئی بادشاہ ہوا تھا؟ تو ابوسفیان نے کہا " لا " نہیں، کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔

ہرقل کا تجزیہ:

ہرقل نے کہا کہ اگر ایسا ہوتا: " قلت: يطلب ملك أبيه " تو پھر یہ بات کہی جاسکتی تھی اور انگلی اٹھائی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے آباء اجداد کی بادشاہت طلب کر رہا ہے، وہ بادشاہت جو اس کے خاندان میں تھی، وہ اسی بادشاہت، اسی منصب اور وقار

کو طلب کر رہا ہے کہ میرا فلاں دادا بادشاہ تھا، تو میں بھی اسی مقام کو اور اسی لیڈری کو اپنے لئے حاصل کروں اور بڑا بن کر دکھاؤں، کوئی ایسی بات بھی نہیں، بقول تمہارے اس کے پورے خاندان میں کوئی بادشاہ نہیں اور نہ کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، اس اعتبار سے بھی اس کی شخصیت پر کوئی اعتراض نہیں۔

ہرقل کا چوتھا سوال:

چوتھا سوال یہ ہے کہ " أأشراف الناس اتبعوه أم ضعفاءهم؟ " اس کی اتباع کرنے والے کیسے ہیں؟ اشراف ہیں یا کمزور، کیا غریب اور لٹے پٹے لوگ ہیں؟

أشراف کا معنی:

"أشراف" شریف کی جمع ہے، لفظ "أشراف" دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک تو شریف کے معنی میں یعنی شریف ہو، عزت دار ہو اور مکارم اخلاق کو سمیٹنے والا ہو، اور ایک "أشراف" کا معنی متکبر، مغرور، دولت کے نشے اور اس کے گھمنڈ میں مبتلا ہے، یہاں "أشراف" کا یہی معنی ہے، کیونکہ یہاں "أشراف" بمقابلہ ضعفاء کے استعمال ہوا ہے، جب لفظ "أشراف" ضعفاء کے مقابلے میں استعمال ہو، تو اس کا معنی شریف کا نہیں، اس کا معنی مالدار اور مال کا گھمنڈ رکھنے والا اور طاقت کا غرور والا ہوتا ہے، تو ہرقل نے پوچھا کہ اس کی اتباع کرنے والے لوگ کیسے ہیں؟ کمزور لوگ ہیں؟ ٹھکرائے ہوئے لوگ ہیں؟ یا متکبر اور فخر میں مبتلا، گھمنڈ میں مبتلا، جن میں طاقت کا نشہ ہو، مال کا نشہ ہو، اس کے پیروکار کیسے ہیں؟ ابوسفیان نے کہا کہ " ضعفاء هم" اس کے پیروکار تو ضعفاء ہیں، کمزور ہیں، دھتکارے ہوئے لوگ ہیں، اکثریت ہمارے غلاموں کی ہے۔

ہرقل کا تبصرہ:

ہرقل نے جواب دیا: " هم أتباع الرسول " یہ نقطہ بھی اس پیغمبر کے حق میں

ہے، کیونکہ جب سے یہ نبوت کا سلسلہ شروع ہوا، یہ ایک طبعی امر ہے کہ انبیاء کے نزدیک ضعفاء اور کمزور ہی ہوتے ہیں اور پہلے کمزور ساتھ دیتے ہیں، جب أشراف کا نشہ ہرن ہوتا ہے اور ان کو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا عہدہ چھننے والا ہے اور یہ موچھیں نیچے ہونے والی ہیں، تو پھر وہ بھی کلمہ پڑھ لیتے ہیں، لیکن ابتداء میں یہ توفیق ضعفاء ہی کو ملتی ہے، تو یہ بات اس نبی کے حق میں ہے کہ عادتاً انبیاء کے أتباع کمزور ہی ہوتے ہیں۔

السابقون الأولون:

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"أنا سابق العرب، وبلال سابق الحبشة، وصهيب سابق الروم، و سلمان سابق فارس" [1]

اس پورے عرب میں سب سے پہلا مسلمان میں ہوں اور پورے روم میں پہلا مسلمان صہیب رومی اور پورے حبشہ میں پہلا مسلمان بلال حبشی اور پوری سلطنت فارس میں پہلا مسلمان سلمان فارسی ہے!۔"

یہ سب ضعفاء ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو مختلف قوموں اور أشراف کی غلامی کرنی پڑی، جن کو دین حق قبول کرنے پر ماریں کھانی پڑیں۔

سبقت کی اہمیت:

عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نبی علیہ السلام کے پاس آئے، اسلام کا ابتدائی دور ہے، آکر پوچھا کہ تم اللہ کے سچے نبی ہو؟ فرمایا کہ ہاں سچا نبی ہوں، پوچھا: "من اتبعك؟" اب تک کتنے لوگوں نے آپ کی اتباع کی ہے؟ فرمایا کہ صرف دو ہی ہیں: "عبد و حر"

[1] المستدرك (٣/ ٣٢١، ٤٥٤) اس کی سند ضعیف ہے، تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٦/٤٥٥)۔

ایک غلام ہے اور ایک آزاد ہے۔ ایک بلال حبشی اور ایک ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ! عمرو نے کہا کہ میں بھی اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں، فرمایا: " أنت لا تستطيع ذلك " عمرو! تم اسلام قبول کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، ابھی تم لوٹ جاؤ اور جب دیکھو کہ " إن أمري قد ظهر " میرا معاملہ غالب آچکا ہے اور اللہ نے کمزوری ختم کر دی اور یہ آزمائش کا دور ختم ہو چکا ہے، پھر تم آجانا اور اسلام قبول کر لینا، ان حالات میں تم میں طاقت نہیں ہے، تمہاری قوم تم کو پکڑ لے گی اور بڑی ایذائیں دے گی، حتی کہ ہو سکتا ہے تم ڈر کے مارے تکلیفوں سے ڈر کر رجوع کر لو اور چھوڑ دو، ابھی تم چلے جاؤ، عمرو کا کہنا ہے کہ کاش اس وقت میں نے اسلام قبول کر لیا ہوتا، تو " كنت رابع الإسلام " اس پوری کائنات میں چوتھا مسلمان میں ہوتا۔ [1]

غربتِ اسلام:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

" إن الإسلام بدأ غريباً، وسيعود كما بدأ غريبا، فطوبىٰ للغرباء " [2]

کہ اسلام کا آغاز غربت سے ہوا اور ایک وقت آئے گا، جس غربت سے اسلام شروع ہوا، اسی غربت میں لوٹ جائے گا، یعنی شروع میں تھوڑی تعداد میں کمزور لوگ آئے اور ایک وقت آئے گا، صرف کمزور لوگ رہ جائیں گے اور تھوڑی تعداد رہ جائی گی، چنانچہ یہ اسلام کا آغاز ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی استقامت:

بلال حبشی غلام ہیں، کتنی تکلیفیں سہنی پڑیں؟ قوموں نے مارا، گرم کوئلوں پر

[1] صحيح مسلم: كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب إسلام عمرو بن عبسة، رقم الحديث (٨٣٢) مسند أحمد (١١٢/٤)

[2] صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب بيان أن الإسلام بدأ غريبا، رقم الحديث (١٤٥)

گھسیٹا، نوکدار پتھروں پر گھسیٹا، رسی گلے میں باندھ کر قوم کے بچوں کے سپرد کر دیا جاتا کہ گھسیٹو اور جو چاہو سلوک کرو،، کھولتا ہوا پانی ڈالا جاتا، یہ "ضعفاء الناس " ہیں، لیکن زبان پر "اللّٰہ أحد" اللہ ایک ہے،[1] اللہ کی توحید کے نعرے اور اللہ کی توحید کا اقرار و اعتراف ہے، یہ ضعفاء کی شان ہے، امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں ایک دفعہ بلال سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ تمہاری کمر دیکھنا چاہتا ہوں، بلال نے کہا کہ یہ نیکی تو میں نے اللہ کے لیے کر رکھی ہے، مجھ پر کیا بیتی؟ میری کمر پر کیا گزرا؟ کسی کو دکھایا ہی نہیں، تاکہ یہ نیکی اللہ کی رضا کے لئے ہو، اللہ سے مجھے اس کا صلہ چاہیے، فرمایا کہ میں امیر المؤمنین تمہیں حکم دے رہا ہو، کہا کہ اگر امیر کا حکم ہے تو ٹھیک ہے، جب امیر عمر نے کمر کو ٹٹول کر دیکھا، تو امیر عمر جیسے بہادر انسان کی چیخ نکل گئی کہ یہاں تو صرف ہڈیوں کا ایک پنجرہ ہے اور گوشت نام کی کوئی چیز ہی نہیں!

ضعفاء الناس:

یہ " ضعفاء الناس " ہیں، ہرقل نے کہا: " هم أتباع الرسل " یہ بات درست ہے کہ ضعفاء ہی انبیاء کے اُتباع ہوتے ہیں، یہ دنیا کے مالدار، اصحاب نخوت، جو مختلف گھمنڈوں میں مبتلا ہوتے ہیں، یہ شروع میں اس پر آمادہ نہیں ہوتے، مگر جس کو اللہ توفیق دے، ابوبکر صدیق، عثمان غنی اور عمر بن خطاب جیسے افراد جو اپنی قوم کے معزز لوگ ہیں، ہم نے ان کو چن لیا، لیکن عام لوگ ضعفاء تھے، بلال حبشی، صہیب

---

[1] سنن ابن ماجه: المقدمة، باب فضل سلمان وأبي ذر والمقداد، رقم الحديث (١٥٠) مسند أحمد (١/ ٤٠٤) اس کی سند "حسن" ہے۔

رومی جنہیں بڑی کٹھن تکلیفیں سہنی پڑیں اور کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا، ہرقل کو دین کے مزاج کی کتنی معرفت اور شعور ہے؟ اس لئے ضعفاء کو قریب کرنا چاہیے، یہ انبیاء کے قریبی لوگ ہوتے ہیں، یہ سچے ساتھی ہوتے ہیں، اُشراف سچے ساتھی نہیں ہوتے۔

غریبوں کی برکت:

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: " فإنما ترزقون وتنصرون بضعفائكم "[1] تمہاری مدد کی جاتی ہے اور تمہیں رزق دیا جاتا ہے، تمہارے کمزوروں کی برکت سے، اگر مالدار کو رزق ملتا ہے، تو کمزوروں کی برکت سے ملتا ہے، اگر تمہاری مدد ہوتی ہے، تو کمزوروں کی برکت سے ہوتی ہے: " بدعوتهم و إخلاصهم وصلاتهم " ان کی دعاؤں کے نتیجے میں، ان کے اخلاص کی برکت سے اور ان کی نمازوں کی برکتوں سے، کمزوروں کی دعائیں لیا کرو، ان کو دھتکارا نہ کرو، ان کو دھتکارنا یہ ایک بڑا گراں معاملہ ہے اور اس کی بڑی مذمت کی گئی ہے۔

غرباء کی قربت:

کمزور آئیں، غریب آئیں، تو ان کو قریب کرو، ان کی عزت کرو، جیسے عمر بن خطاب کے دور میں ابوسفیان ان سے ملنے آئے، تو آپ چونکہ مشغول تھے، دربان سے کہا کہ انتظار کے لیے کہو، انتظار کے لیے بیٹھ گئے، حکیم بن حزام بھی ساتھ تھے، انتظار شروع کر دیا، تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی، دربان نے پوچھا: کون؟ کہا: بلال حبشی! دربان نے امیر المؤمنین کو خبر دی کہ بلال حبشی بھی آئے ہیں، عمر بن خطاب اپنا کام چھوڑ کر باہر آئے، بلال کا استقبال کیا اور استقبال کر کے اندر لے

---

[1] سنن أبي داود: كتاب الجهاد، باب في الانتصار برذل الخيل والضعفة، رقم الحديث (٢٥٩٤) سنن الترمذي: كتاب الجهاد، باب ما جاء في الاستفتاح بصعاليك المسلمين، رقم الحديث (١٧٠٢) وقال: " هذا حديث حسن صحيح "۔

گئے، امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ابوبکر صدیق کے بارے میں کہا کرتے تھے: " هذا سيدنا وأعتق سيدنا "[1] ابوبکر ہمارا سردار ہے اور اس نے ہمارے ایک سردار کو خرید کر آزاد کیا، کیونکہ انہوں نے بلال حبشی کو خرید کر آزاد کیا تھا۔

ابوسفیان نے کہا: امیر المومنین نے انصاف نہیں کیا، ہمیں بٹھا چھوڑا ہے اور ایک غلام کا استقبال کیا ہے، یہ امیر المؤمنین کا انصاف نہیں، حکیم بن حزام نے کہا: تم ناراض کیوں ہوتے ہو؟ امیر المومنین نے انصاف کیا ہے، تم یہ نہ دیکھو کہ تمہارا خاندان کیا ہے اور تم کس برادری کے ہو؟ یہ دیکھو کہ اسلام میں تقدم کس کو ہے؟ تمہیں یا بلال کو؟ بلال نے اسلام کب قبول کیا اور تم نے اسلام کب قبول کیا؟ بلال نے تب کیا، جب اسلام قبول کرنا ایک بڑی گالی تھی اور جو اسلام قبول کر لیتا، اسے انگاروں پر گھسیٹا جاتا، تکلیفیں دی جاتیں، ان کو آریوں سے چیرا جاتا اور تم نے تو اسلام تب قبول کیا جب مکہ فتح ہوگیا، علاقہ چھن گیا، گھروں پر قبضے ہوگئے، چودھراہٹیں ختم ہوگئی، مونچھیں نیچی ہوگئیں، تب تم نے اسلام قبول کیا، بلکہ حکیم بن حزام نے کہا: اے ابو سفیان! کل جب قیامت کا دن ہوگا، بلال حبشی کو اللہ بلائے گا، تو اللہ پر بھی اعتراض کرو گے؟ یا اللہ! یہ کیسی تقسیم ہے؟ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: " المؤذنون أطول الناس أعناقا يوم القيامة " [2] قیامت کے دن موذنوں کی گردنیں سب سے اونچی ہونگی اور بلال حبشی تو کعبۃ اللہ کے موذن اور مسجد نبوی کے مؤذن ہیں اور پوری زندگی اللہ کے نبی کے امر سے یہ خدمت انجام دیتے رہے۔[3]

---

[1] صحيح البخاري: كتاب فضائل الصحابة، باب مناقب بلال بن رباح مولىٰ أبي بكر رضي الله عنهما، رقم الحديث (٣٥٤٤)

[2] صحيح مسلم: كتاب الصلاة، باب فضل الأذان وهرب الشيطان عند سماعه، رقم الحديث (٣٨٧)

[3] مسند أحمد (٩٥/٤، ٩٨)

غرباء کی فضیلت:

تو ہرقل اس نقطے کو خوب سمجھتا تھا: " هم أتباع الرسول" کہا کہ واقعتاً جو انبیاء کے اُتباع ہوتے ہیں، سچے پیروکار کمزور ہی ہوتے ہیں اور اسلام ان کمزوروں ہی سے شروع ہوتا ہے:

" إن الإسلام بدأ غريباً و سيعود كما بدأ غريباً فطوبى للغرباء "[1]

اسلام غربت سے شروع ہوا، جس غربت سے شروع ہوا، اسی غربت میں لوٹ جائے گا، پس خوشخبری ہو تمام غرباء کے لیے!

یہ کمزور لوگ، یہ ضعفاء، یہ غرباء ان کے لیے بشارتیں ہیں، خوشخبریاں ہیں، اللہ کے ہاں ان کے لیے کیا کچھ ہے؟ یہ اللہ جانتا ہے، تو یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان کو قریب کیا جائے، ضعفاء اور کمزوروں کو دھتکارا نہ کرو، انہیں دیکھ کر ماتھے پر بل نہ آئیں، بشرطیکہ وہ سچے عقیدے کے حامل ہوں، سچے مسلمان ہوں اور مخلص ہوں، تو ان کی عزت اور خدمت کی جائے۔

ضعفاء کی مجالست:

یہ انبیاء کا منصب اور انبیاء کا منہج ہے کہ انبیاء کے قریب بھی یہی لوگ ہوتے ہیں۔

اس لئے فرمان نبوی ہے کہ " ابغوني في ضعفائكم "[2] مجھے اپنے کمزوروں میں تلاش کیا کرو۔ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی بھی یہ خواہش تھی کہ اسی طرح کے لوگوں میں بیٹھیں، کیونکہ یہ لوگ مخلص ہوتے ہیں۔ ان علماء اور دعاۃ کے لیے یہ ایک تنبیہ

---

[1] صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب بيان أن الإسلام بدأ غريبا، رقم الحديث (١٤٥)

[2] سنن أبي داود: كتاب الجهاد، باب في الانتصار برذل الخيل والضعفة، رقم الحديث (٢٥٩٤) سنن الترمذي: كتاب الجهاد، باب ما جاء في الاستفتاح بصعاليك المسلمين، رقم الحديث (١٧٠٢) وقال: " هذا حديث حسن صحيح "۔

ہے جو اللہ کے دین کا کام کرتے ہیں اور شیطان ان کے ذہنوں پر اس طرح وار کرتا ہے کہ مالداروں سے تعلق زیادہ مفید ہے، نتیجہ یہ کہ اپنے منہج اور اپنے مقام کو گرا کر وہ ان کے ٹھکانوں اور دوکانوں کے سروے اور دورے کرتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہماری تقویت کا سامان یہی لوگ ہیں، حالانکہ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کے منہج کے خلاف ہے اور پھر یہ اس مقام و رفعت کو جو اللہ نے عطا فرمائی ہے، گرانے کے مترادف ہے، اصل مضبوطی اور استحکام اللہ رب العزت کی طرف سے ہے، اس کے اپنے مناہج ہیں، جنہیں اپنانا ہی باعث برکت ہے، تبھی ہرقل نے، جو بڑا صاحب فراست تھا، اس کا یہ جواب دیا: " هم أتباع الرسل " کہ انبیاء کے اتباع بھی کمزور ہی ہوتے ہیں، جو رفتہ رفتہ ان کے کاز کی مضبوطی کا باعث بن جاتے ہیں۔

ہرقل کا پانچواں سوال:

پھر ہرقل نے یہ سوال کیا: " هل يزيدون أم ينقصون؟ " یہ بتاؤ کہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟ ابوسفیان نے جواب دیا: " بل يزيدون " ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، کمی نہیں ہو رہی، حالانکہ ہم نے راستے بند کئے ہوئے ہیں اور جو ہمارے زیر دست ہیں، ان کا ہم نے ناطقہ بند کیا ہوا ہے، لیکن پھر بھی یہ لوگ پھیل رہے ہیں۔

ہرقل کا تبصرہ:

ہرقل نے جواب دیا: " كذلك أمر الإيمان حتى يتم " ایمان کا یہی معاملہ ہے کہ ایمان کا معاملہ رفتہ رفتہ بڑھتا ہے، حتی کہ یہ پورا ہو جاتا ہے، اللہ رب العزت اگر کسی بھی دور میں ایمان کے غلبے کا فیصلہ فرما لے، تو پھر وہ آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور اس میں استحکام آتا ہے، یہ کام تیزی سے بھی ہو سکتا ہے، لیکن یہ دین اسلام کی

طبیعت نہیں ہے، یہ راستہ بڑا صبر آزما ہے، اللہ تعالیٰ تو ''کن'' کہہ کر دین اسلام کے غلبہ و استحکام پر قادر ہے، لیکن اللہ رب العزت خاص طور پر اپنے پیاروں کو آزماتا ہے، ان کا امتحان لیتا ہے اور جب پوری طرح ان کو صابر پاتا ہے، تو پھر اپنی توفیق کے راستے کھول دیتا ہے، یقیناً یہ سارے امور اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فیصلوں کے تابع ہیں کہ ایمان رفتہ رفتہ بڑھتا ہے، حتی کہ مکمل ہوجاتا ہے، ایسے بہت سے انبیاء گزرے ہیں، جن کے امر کے غلبے کا اللہ نے فیصلہ نہیں فرمایا، جنہوں نے توحید سے اپنی دعوت کا آغاز کیا اور آخر دم تک ایک ہی دعوت دیتے رہے، قوموں نے مان کے نہیں دیا۔

دعوتِ دین میں انبیاء کا منہج:

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے آخرت کا یہ منظر دکھایا کہ کچھ انبیاء کے ساتھ پوری جماعتیں ہیں، کچھ انبیاء کے ساتھ بیس پچیس افراد ہیں، کچھ انبیاء کے ساتھ ایک یا دو افراد ہیں اور کچھ انبیاء بالکل اکیلے کھڑے ہیں۔[1] انہیں جو بھی عمر ملی، انہوں نے '' قولوا لا إله إلا الله '' کی دعوت میں صَرف کر دی کہ اللہ کی توحید کو مان لو اور قومیں نہیں مانیں۔

اللہ رب العزت کو اپنے جس نبی کے مشن کا غلبہ منظور ہو، اس کے معاملے کو آہستہ آہستہ بڑھاتا ہے، آزمائشوں کے مراحل سے گزار کر ایمان کا معاملہ پورا ہوجاتا ہے، لیکن جو انبیاء صرف توحید ہی پیش کرتے کرتے اللہ سے جا ملے، وہ ناکام نہیں ہیں، وہ بڑے کامیاب ہیں، اس لئے کہ انہوں نے اپنے منہج کے ساتھ پوری طرح دفاداری کی، دین کا سودا نہیں کیا، کچھ لو اور کچھ دو، کچھ مان لو، کچھ منوالو، یہ تو

[1] صحيح البخاري: كتاب الطب، باب من لم يرق، رقم الحديث (٥٤٢٠)

سراسر ناکامی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ فتنوں کے دور میں انسان صبح کو مومن ہوگا اور شام کو کافر ہوگا، فرمایا: "يبيع دينه بعرض من الدنيا"[1] وہ اس طرح کہ وہ دنیا کے معمولی سے ساز و سامان کی خاطر اپنے دین کو بیچ دے گا، اپنی جھوٹی شہرت کے لئے مال کی طمع میں یا عہدوں کے لالچ میں وہ اپنے مشن اپنی توحید اور اپنے دین کا سودا کر دے گا، یہ انبیاء تو مبارک ہیں، جنہوں نے کوئی سودا نہ کیا، قوموں کا بائیکاٹ برداشت کرلیا، فتنے برداشت کر لئے، ان کی ماریں برداشت کرلیں۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسے انبیاء سے متعارف کرایا، جنہوں نے دعوت دی، "قولوا لا إله إلا الله" کہا، قوموں نے پتھر مارے، حتی کہ لہولہان ہوگئے، "يقول وهو يمسح الدم عن وجهه اللهم اغفر لقومي فإنهم لا يعلمون" وہ اپنے رومال سے اپنے چہرے کا خون صاف کرتے اور ساتھ ساتھ یہ دعا کرتے کہ اے اللہ! میری قوم کو بخش دے، انہیں شعور نہیں ہے۔[2]

غلبۂ دین:

تو ایسے انبیاء بھی بڑے کامیاب ہیں، ان کی یہ استقامت اور مشن اور توحید کے ساتھ وفا ان کا ثمرہ ہے، لیکن اللہ رب العزت نے جس نبی کے مشن کے غلبہ کا فیصلہ فرما لیا ہو: "كذلك أمر الإيمان حتى يتم" تو اللہ تعالیٰ اس کے معاملے کو آہستہ آہستہ بڑھاتا ہے، حتی کہ وہ مکمل ہوجاتا ہے، چنانچہ نبی ﷺ کے صحابہ بڑھتے جا

---

[1] صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب الحث على المبادرة بالأعمال قبل تظاهر الفتن، رقم الحديث (١١٨)

[2] صحيح البخاري: كتاب الأنبياء، باب أم حسبت أن أصحاب الكهف والرقيم، رقم الحديث (٣٢٩٠) صحيح مسلم: كتاب الجهاد والسير، باب غزوة أحد، رقم الحديث (١٧٩٢)

رہے ہیں اور ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، ہرقل نے کہا کہ یہی ایمان کی شان ہے کہ ایمان رفتہ رفتہ بڑھتا ہے اور ماننے والے پھیل جاتے ہیں، حتیٰ کہ یک لخت اس زمین کی پشت پر دین کا احیاء اور انقلاب قائم ہو جاتا ہے، مگر یہ راستہ آزمائشوں سے پُر ہے اور بڑا پُر خطر راستہ ہے۔

دعوت دین کی اہمیت:

اسی لئے محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جب دعوت کا حکم دیا، تو دعوت کو جہاد نہیں بلکہ جہاد کبیر کہا، تلوار سے قتال چھوٹا جہاد ہے اور کفار کے ایوانوں اور میدانوں میں دعوت دینا بڑا جہاد ہے، اسی لئے پیغمبر ﷺ کا فرمان ہے:

" إسلام رجل واحد أحب إلي من قتل ألف كافر ."[1]

"میری تلوار سے ایک ہزار کافر قتل ہوں، اس سے بہتر یہ ہے کہ میری دعوت سے ایک کافر اسلام قبول کر لے۔"

یعنی میری دعوت قبول کر کے کافر جنت میں پہنچ جائے، یہ اس سے بہتر ہے کہ میری تلوار سے ایک ہزار کافر قتل ہو کر جہنم میں چلے جائیں، یہ معاملہ آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور یہ معاملہ واقعتاً بڑھا، حتیٰ کہ وہ وقت آ گیا، جب اللہ رب العزت نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ وحی بھیجی:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ [المائدة: ٣]

کہ آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا، میری نعمت پوری ہو چکی ہے، تو یہ ایمان کا معاملہ مکمل ہو کر رہا، یہ نبی ﷺ کی دعوتی اور جہادی زندگی کا نچوڑ ہے اور یہ وہ ثمرہ اور کامیابی ہے جو اللہ نے آپ کو عطا فرمائی۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: فتح الباری (٧/٠ ٣٧)

غلبۂ دین کا طریقہ:

تو ہرقل کی فراست اس بات کو جانتی تھی کہ ایمان کا معاملہ رفتہ رفتہ بڑھتا ہے، یہ کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہے یا دین کی دعوت دینے والا کوئی بہروپیا، شعبدہ باز یا مداری نہیں ہے کہ وہ اعلان کرے اور لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جائیں، نہیں یہ معاملہ آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور یہ دین اسلام کی فطرت ہے کہ اللہ تعالیٰ قوموں کا امتحان لیتا ہے، داعیوں کا امتحان لیتا ہے اور ان کے صبر کو آزماتا ہے، اللہ تعالیٰ کو اپنے نیک بندوں کی وہ آواز بڑی پیاری لگتی ہے، جو تکلیفوں سے بھری ہو اور وہ اپنے شکوے اور تکلیف کا اللہ کے سامنے اظہار کریں، اللہ تعالیٰ سے کہیں کہ یا اللہ جو بھی تکلیف ہے، اس کا اظہار تیرے سامنے ہے اور تجھ ہی سے اس کا ازالہ مطلوب ہے، تو یہ ایمان کا معاملہ رفتہ رفتہ بڑھا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو مکمل کر دیا اور سارے احکام پورے کر دیئے، عقیدۂ توحید کے بعد نمازیں ہیں، روزے ہیں، حج ہیں اور دیگر اسلام کے احکام ہیں، یہ آہستہ آہستہ اترے اور معاملہ مکمل ہوگیا۔

ہرقل کا چھٹا سوال:

ہرقل نے اگلا سوال یہ کیا کہ " هل يرتد أحد منهم سخطةً لدينه بعد أن يدخل فيه ؟" یہ بتاؤ کہ محمد ﷺ کے دین سے کوئی بندہ آج تک مرتد ہوا ؟ اور چھوڑا کس بناء پر ہو: " سخطةً لدينه " اس کے دین کو ناپسند کر کے! دین میں آیا ہو اور کچھ وقت گزارا ہو اور پھر دین کو ناپسند کر کے دین کے معاملے سے ناراض ہو کر کبھی اس دین کو چھوڑا ہو؟ کوئی اس کی مثال ملتی ہے؟

ابوسفیان کا جواب:

ابوسفیان نے جواب دیا کہ " لا يرتد "ایسی ایک مثال ہمارے سامنے نہیں کہ

کسی نے دین اسلام کو قبول کر کے چھوڑا ہو، اس دعوت توحید کو مان کے ارتداد اختیار کیا ہو، اس کی کوئی مثال نہیں، بشرطیکہ اس کی بنیاد دین سے ناراضی ہو، ہاں کسی کے دل میں طمع اور لالچ ہو، دنیا یا دنیا کے مناصب اور وقار کی چاہت ہو، اس کی خواہش پوری نہ ہوئی ہو اور وہ مایوس ہو کر چلا جائے، یہ بات الگ ہے، لیکن دین کو قبول کر کے دین سے ناراض ہو کر کسی نے دین کو نہیں چھوڑا، جس نے اس دین کو قبول کیا، وہ آج تک قائم ہے، حتی کے ماریں برداشت کیں، وہ گرم کوئلوں اور انگاروں پر گھسیٹے گئے، ان کے سینوں پر بھاری سلیں رکھیں گئیں، ان کے گلوں میں رسیاں باندھ کر مکہ کے اوباشوں کے سپرد کر دیا گیا، جو ان کو گسیٹتے رہتے، ان کو مارتے رہتے، کھولتا ہوا پانی ڈالا گیا، لیکن اس دین سے کوئی مرتد نہیں ہوا۔

ہرقل کا تجزیہ:

ہرقل نے اس کا جواب دیا: " وكذلك الإيمان حين تخالط بشاشته القلوب " ہاں یہی ایمان کی شان ہے، جب ایمان کی بشاشت، ایمان کا انشراح، ایمان کا نور اور حلاوت دلوں میں بیٹھ جائے، تو پھر کوئی ایمان کو چھوڑ نہیں سکتا، یہ ایمان کی شان اور ایمان کی حلاوت ہے اور واقعتاً ہرقل کا یہ جواب ایک تاریخی جواب ہے۔

انشراحِ ایمان:

یہ اس کا فہم وفراست ہے کہ سچی توحید اور سچے ایمان کی حلاوت اگر دل میں بیٹھ جائے، تو پھر بندہ ایمان کو چھوڑنا تو دور کی بات ہے، کوئی ایک عمل چھوڑنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتا، آج درحقیقت یہ انشراح نہیں ہے اور نہ یہ حلاوت دلوں میں بیٹھی ہے، اس لئے ایمان سے ایک روایتی نوعیت کا تعلق ہے، صحیح منہج نہیں، اوپر اوپر سے ایک رابطہ اور تعلق ہے، جو اللہ تعالیٰ کو قطعاً قابل قبول نہیں، یہ انشراح کیسے آتا ہے؟

یہ حلاوت کیسے آتی ہے؟ رسول اکرم ﷺ کے صحابہ ایمان لاتے تو انہیں روز اول ہی یہ مٹھاس اور یہ حلاوت حاصل ہوجاتی، کیونکہ ان کا ایمان اس فہم پر قائم ہوتا تھا، جو فہم اس لذت اور حلاوت کا باعث بنتا ہے۔

ایمان کی مٹھاس:

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

" ذاق طعم الإيمان من رضي الله ربا وبالإسلام دينا و بمحمد رسولا " [1]

ایمان کی مٹھاس اور حلاوت کو وہ شخص پاتا ہے، جو تین چیزوں کو مانے اور ایسا مانے کہ ان پر راضی ہوجائے، ان پر قانع ہوجائے اور ان پر اکتفا کر کے بیٹھ جائے، اب یہ درگاہیں، یہ کراچی کی سرکاریں اور اجمیر کی سرکاریں اور یہ پاکپتن کی سرکاریں سب طواغیت ہیں، جو لوگوں نے بنا رکھیں ہیں، وہ لوگ اس سے بے خبر ہیں، تو جو لوگ اتنے کمزور اور کچے عقیدے کے مالک ہوں، ان کے اندر ایمان کی حلاوت کیسے سمائے گی؟ یہ انشراح انہیں کیسے حاصل ہوگا؟

حلاوتِ ایمان کے اسباب:

آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ ایمان کی حلاوت تو وہ لوگ پاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایمان کی مٹھاس ان لوگوں کو عطا فرماتا ہے، جو اللہ کو رب مان لیں اور مان کر راضی ہوجائیں اور وہیں پر رک جائیں، بس! اب کوئی رب نہیں، کوئی الٰہ نہیں، صرف ایک اللہ ہے، تمام طواغیت سے اپنے عقیدوں، اپنے اعمال اور اپنے قلوب کو پاک

[1] صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب الدليل على أن من رضي بالله ربا وبالإسلام دينا وبمحمد صلى الله عليه وسلم رسولا فهو مؤمن وإن ارتكب المعاصي الكبائر، رقم الحديث (٣٤)

اور صاف کر لیں اور ایک اللہ کے رب ہونے پر قانع ہو جائیں، قائم ہو جائیں اور ڈٹ جائیں اور دوسری چیز "وبالإسلام دینا" اسلام کو اپنا دین مان لیں اور اس پر راضی ہو جائیں، نہ اس سے آگے، نہ اس سے پیچھے، بہت سی قومیں اور بہت سے مذاہب ہیں، ان کے افکار ہیں، ان کی تہذیبیں ہیں، ان کی ثقافتیں ہیں، کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھے، نگاہ اٹھا کے بھی نہ دیکھے۔

دینِ حنیف:

اللہ تعالیٰ نے اسی لئے اس دین کو دین حنیف قرار دیا ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: " بعثت بالحنيفية السمحة "[1] مجھے جو دین دیا گیا ہے، اس دین میں دو چیزیں امتیازی ہیں، ایک حنیفیت اور دوسری سماحت، حنیفیت کیا ہے؟ حنیفیت یہ ہے کہ اس کو ماننے والے ہر دین سے کٹ کر اسی دین کو قبول کر کے بیٹھ جائیں، دائیں بائیں نہ جھانکیں، آگے پیچھے نہ دیکھیں، اقوام عالم کی سیاستیں کیا ہیں؟ ان کی ثقافتیں کیا ہیں؟ ان کی تہذیبیں کیا ہیں؟ نہیں ایسا نہ ہو۔

صبغة الله:

ان پر پوری طرح ایک رنگ ہو، جس رنگ کے بارے میں اللہ کا فرمان اور دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر کوئی رنگ نہیں ہے اور وہ ﴿ صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ [البقرہ:۱۳۸] ہے، وہ دین کا رنگ ہے، توحید کا رنگ ہے، اس رنگ کو اپنے اوپر چڑھا لیں، ان کی نمازوں پر، ان کی عبادات پر، ان کے اقوال پر، ان کے اخلاق پر، ان کے مناہج اور عقائد پر اسی دین کا رنگ ہو۔

---

[1] مسند أحمد (٥/٢٦٦) یہ حدیث شواہد کی بنا پر "حسن" ہے، تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسة الصحيحة، برقم (٢٩٢٤)

مسلمانوں کی زبوں حالی:

لیکن آج یہ چیز نہیں ہے، آج اسلام کے ساتھ یہ حقیقی تعلق نہیں ہے، تو پھر انشراح کیسے حاصل ہوگا اور یہ حلاوت دلوں میں کیسے بیٹھے گی؟ ناممکن ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کی دکانوں پر آپ کو ہندوستان کے فلمی ایکٹروں کے فوٹو ملیں گے، اس کا معنیٰ ہے کہ انہیں اس سے پیار ہے، اس تہذیب سے پیار ہے، اس ثقافت سے پیار ہے، ہم نے تو نوجوانوں کے لباسوں پر غیر مسلم کنجروں کے فوٹو دیکھے ہیں، اس کا معنی ہے کہ انہیں ان ثقافتوں سے محبت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "المرء مع من أحب"[1] کہ انسان قیامت کے دن اسی کے ساتھ اٹھے گا، جس کے ساتھ محبت کرے گا۔ جن کے فوٹو سے پیار کرتے ہو، انہیں کے ساتھ حشر ہوگا، جب تعلق کی نوعیت یہ ہو، تو انشراح ایمانی کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟ ایمان کی محبت اور حلاوت کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟

کفار کی نقالی:

لوگ باقاعدہ میڈیا کے سامنے بیٹھتے ہیں، ایک ایک چیز پر غور کرتے ہیں، ان کے بالوں کی کٹنگ کیسی ہے؟ اگلے دن وہی بال بن جاتے ہیں، یہ چاروں طرف سے بال چھوٹے کرواکے اور منڈوا کر بیچ میں ایک پیالہ سا بنا لینا، یہ وہ قزعہ ہے جس سے اللہ کے پیغمبر ﷺ نے روکا ہے،[2] ہمیں اپنے دین کی ثقافت سے کوئی پیار نہیں، ان کی ثقافت سے پیار ہے، اکثر ماں باپ اپنے بچوں کے بالوں کی اسی طرح کٹنگ کراتے ہیں، اکثر ایسے نظر آتے ہیں کہ غیر مسلم یورپین کا یہ سٹائل ہے، اس پر فخر

---

[1] صحیح البخاري: کتاب الأدب، باب علامة الحب في الله تعالیٰ، رقم الحدیث (٥٨١٧) صحیح مسلم: کتاب البر والصلة، باب المرء مع من أحب، رقم الحدیث (٢٦٤٠)

[2] صحیح البخاري: کتاب اللباس، باب القزع، رقم الحدیث (٥٥٧٦) صحیح مسلم: کتاب اللباس والزینة، باب کراهة القزع، رقم الحدیث (٢١٢٠)

کرتے ہیں اور اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ ہم ایک ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ہیں، ایک ترقی یافتہ قوم کا ہم نے راستہ اپنایا ہے، اس پر فخر کرتے ہیں، یہ معلوم نہیں کہ اللہ کے دین کو ذبح کرنے کے مترادف ہے، کیونکہ اللہ کے نبی نے اس سے روکا ہے۔

انشراح ایمان کا راستہ:

تو پھر یہی وجہ ہے کہ وہ ایمان کی حلاوت و انشراح حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ انشراح کا راستہ تو یہی ہے کہ اللہ کو رب مان لو اور بس، اسلام کو دین مان لو اور بس، اس پر راضی ہوجاؤ، راضی ہونے کا معنی یہ ہے کہ بس اتنا ہی کافی ہے، اس سے زیادہ نہیں چاہیے، اس سے کم نہیں چاہیے، اتنے دین پر راضی ہوں، قانع ہوں اور بس!

حلاوت ایمان کا تیسرا سبب:

اور تیسری چیز یہ کہ " وبمحمد رسولا " محمد ﷺ کو اپنا رسول مان لو اور بس! رسول ماننے کا معنی کیا ہے؟ بس رسول مان لیا، ان کا کلمہ پڑھ لیا، " محمد رسول اللّٰہ" کہہ لیا، انہی کی اطاعت کر لی، اس پر بس کر جاؤ، اب کوئی امام نہیں، کوئی مجتہد نہیں، کوئی محدث یا فقیہ نہیں، کوئی پیرومرشد نہیں، ہاں کوئی اللہ کے نبی کی بات کہے گا، تو وہ بات سنیں گے، اس کو قبول کریں گے، وہ اس کی اطاعت نہیں، وہ اللہ کے نبی کی اطاعت ہے اور یہ ذاتی ملفوظات، ذاتی قصے کہانیاں، چونکہ چنانچہ، موضوعات، کذب اور جھوٹ، اگر اس طرف توجہ ہے تو پھر محمد ﷺ کو رسول تم نے کیا مانا ہے؟

رسول ماننے کا معنی:

رسول ماننے کا معنی یہ ہے کہ ہر چیز میں ان کی اطاعت کرو، عقیدہ، منہج، خلق، معیشت، معاشرت، کاروبار، ہر چیز میں اللہ کے پیغمبر کا دین ہے، وہ سارے اعمال جو انحراف پر قائم ہونگے، تمہارے منہ پر مارے جائیں گے، ان کی کوئی ضرورت نہیں،

یہاں تو پوری غیرت کے ساتھ امر مطلوب یہ ہے کہ تمہارے ہر عمل اور تمام مناہج کی تصویر پر اللہ کا یہ فرمان ہو:

﴿ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ [الحشر:۷]

''جو چیز رسول دے وہ لے لو اور جس چیز سے رسول روکے، رک جاؤ۔''

حلاوت ایمان میں رکاوٹ:

اگر یہ تین چیزیں حاصل ہو جائیں، تو اسے ایمان کی مٹھاس مل جاتی ہے اور اگر ان تین چیزوں پر اکتفا نہ ہو، اللہ کو رب مانتا ہو، لیکن اور بھی مشکل کشا بنا رکھے ہوں اور بھی حاجت روا بنا رکھے ہوں، اسلام قبول تو کر لیا، لیکن دیگر تہذیبیں اور ثقافتیں بھی پیش نظر ہوں، محمد ﷺ کو رسول تو مان لیا، لیکن اور بھی اطاعت کے مراکز ہوں، ائمہ ہوں، مجتہدین ہوں اور پیرو مرشد ہوں، تو اس شخص کو ایمان کی حلاوت نصیب نہیں ہو سکتی، نتیجہ یہ کہ آج چونکہ ہماری اس دین پر گرفت مضبوط نہیں ہے، لہٰذا ہر طرح کے انحراف آپ کے سامنے ہیں، اللہ کی مدد مفقود ہے، کیونکہ وہ مثالی ایمان مفقود ہے، جو اس دین کے شایان ہے، جو صحابہ نے قبول کیا۔

تو ہرقل نے پوچھا کہ کوئی ایک مرتد ہوا ہو؟ کہا کہ نہیں، جس نے اس مذہب کو اپنا لیا، وہ پکا ہو گیا، آج یہ دو باتیں ڈھونڈو، آپ کو کہاں ملیں گی؟ دنیا میں مختلف مذاہب اور دعوتیں ہیں، یہ دو باتیں کہ وہ گھٹ رہے ہیں اور کسی نے اس دعوت کو قبول کر کے چھوڑا ہو، اس کی کوئی مثال ہے؟ ابو سفیان نے جواب دیا کہ وہ بڑھتے جا رہے ہیں، گھٹ نہیں رہے اور دوسری بات یہ کہ آج تک جو اس مذہب میں داخل ہو گیا، اس نے اس کو چھوڑا نہیں، یہ بھی حق کی شناخت اور حق کا مزاج ہے، میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ مٹھاس اپنے اندر پیدا کرو، یہ حلاوت اپنے اندر پیدا کرو، جس کا طریق یہ ہے کہ

ان تین چیزوں کو قبول کر کے راضی ہو جاؤ، یہ تین چیزیں پوری زندگی کا محور ہیں، عقیدہ اور عمل کی پوری گاڑی ان تین چیزوں پر قائم ہے، چوتھی کوئی چیز نہیں، پانچویں کوئی چیز نہیں، بس انہی پر اکتفا کرو۔

قبر میں اولین امتحان:

اس لئے قبر میں آپ جائیں گے، تو پہلا پرچہ انہی تین چیزوں کا ہوگا، اللہ تعالیٰ نے کتنی وضاحت سے یہ بات سمجھا دی کہ جب فرشتے پوچھیں گے: "من ربك؟، ما دينك؟، من نبيك؟" یہی تین سوال ہیں، یہی تین چیزیں ایمان کی اور حلاوتِ ایمان کی اساس ہیں۔

قبر میں پہلا سوال:

اور جب آپ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، یہ پہلا پرچہ آپ کے سامنے آئے گا، بتاؤ رب کون ہے؟ اس کا جواب کون دے گا؟ جس کا ایک ہی رب ہو اور جس نے کئی ربّوں کو پکارا ہو، ہر جگہ اس کے مختلف رب ہیں، ان کو سلام ہو رہے ہیں، استغاثہ ہو رہا ہے، وہ متحیر ہوں گے کہ آج ان مختلف ربّوں میں کس کا نام پیش کروں؟ وہ کہیں گے کہ ہمیں معلوم نہیں: "سمعت الناس يقولون شيئا فقلت قوله"[1] ہم نے تو لوگوں کو سنا، لوگ باتیں کرتے تھے کہ فلاں کو بھی سلام کر لو اور فلاں کے سامنے بھی جھک جاؤ، ہم نے بھی یہ باتیں شروع کر دیں اور وہی کرتے گئے، اب ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارا رب کون ہے؟

---

[1] صحيح البخاري: كتاب العلم، باب من أجاب الفتيا بإشارة اليد والرأس، رقم الحديث (٨٦) صحيح مسلم: كتاب الكسوف، باب ما عرض على النبي صلى الله عليه وسلم في صلاة الكسوف من أمر الجنة والنار، رقم الحديث (٩٠٥)

قبر میں دوسرا سوال:

اچھا بتاؤ: " ما دینك؟ "تمہارا دین کیا ہے؟" لا أدري " ہم نہیں جانتے، ہم نے لوگوں کو سنا کہ فلاں چیز کو اپنا لو، فلاں چیز کو بھی اپنا لو، ہم اپناتے گئے، اب ہم کو معلوم نہیں کہ ہمارا دین کیا ہے؟ حقیقی دین کیا ہے؟ اصل دین کیا ہے؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں!

قبر میں تیسرا سوال:

نبی کون ہے؟ یہی جواب کہ ہمیں معلوم نہیں، ہم نے تو کئی اطاعت کے مرکز قائم کیے تھے، دین کا معاملہ ہم نے امتیوں کے کندھوں پر تعمیر کیا ہوا تھا کہ جو بات یہ کہہ دے گا، وہ حق ہوگی۔

میزان حق:

ہم نے حق کو شخصیتوں کے نظام پر تولا، حالانکہ شرعی ترتیب یہ ہے کہ شخصیتوں کو حق کے نظام پر تولو، امام ذہبی کا قول ہے، جو بہت بڑے محدث ہیں:

"الحق ما یعرف بالرجال، اعرف الحق تعرف أهله " [1]

کہ حق لوگوں سے نہیں پہچانا جاتا، ایک شخص کی ظاہری ہیئت کذائی کو دیکھیں اور سمجھیں کہ مجسم حق ہے؟ نہیں، حق لوگوں سے نہیں پہچانا جاتا، تم حق کو اصل مصدر سے پہچانو، کتاب وسنت سے پہچانو، جب کتاب وسنت سے حق کو پہچان لوگے، تو اہل حق کو بھی پہچان جاؤ گے، اس منہج کو لوگوں پر پیش کرو گے، جو اس کے مطابق ہے، وہ صاحب حق ہے اور جو اس کے خلاف ہے، اس کی ہیئت کذائی کچھ بھی ہو، وہ صاحب حق نہیں ہوسکتا۔

---

[1] یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ دیکھیں: فیض القدیر للمناوي (۱/۱۷)

نتیجہ:

تو ہم نے صرف شخصیتوں کو دیکھا، ان کے قائل ہوگئے اور ان کے کندھوں پر پوری عمارت تعمیر کر دی، اب ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارا رسول کون ہے؟ نبی کون ہے؟ فرشتے بڑی مار ماریں گے اور ساتھ ساتھ کہیں گے: " كنت على الشك " تو پوری زندگی شک اور حیرانی میں مبتلا رہا، تیری زندگی یقین پر نہیں تھی، یقین پہ اس شخص کی زندگی گزرتی ہے، جس کے ایک ہاتھ میں کتاب اللہ ہو اور دوسرے میں سنت رسول اللہ ہو، اس کے علاوہ جو بھی راستہ ہے، وہ شکوک وشبہات سے عبارت ہے، اس میں یقین نہیں آسکتا تیری پوری زندگی شک پر گزری: " وعليه مت وعليه تبعث يوم القيامة " اور اسی شک پر تو مر گیا، مرتے دم تک تو اس شک پر قائم رہا اور قیامت کے روز اسی شک پر اٹھایا جائے گا، اسی طرح متحیر اور پریشان ہوگا۔ [1]

محورِ حیات:

یہ پہلا پرچہ ہے، بتاؤ اس میں کوئی چوتھا سوال ہو؟ کوئی دوسرا نام ہو؟ نہیں وہی جو درس دیا گیا، جس کو خالق کائنات نے محور حیات کہا ہے کہ جو اللہ کو رب مان کر بس کر جائے، اسلام کو دین مان کر بس کر جائے اور محمد کو رسول مان کر بس کر جائے، اس کو ایمان بھی مل گیا اور ایمان کی حلاوت بھی مل گئی، ایمان کی مٹھاس بھی مل گئی، اسی پر قائم رہو، یہ اتنا اہم محور حیات ہے اور یہ پرچہ جو سامنے پیش ہوگیا، اس کی خوب تیاری کرو، پرچے کی تیاری شریعت نے ہمیں جو تعلیمات دی ہیں، ان تعلیمات کی روشنی میں اس پرچے کی تیاری روزانہ بار بار کی جاتی ہے، دن میں پانچ دفعہ اذان ہوتی ہے، اذان کی دعا میں بھی اللہ کے پیغمبر سے ثابت ہے:

---

[1] سنن ابن ماجه: كتاب الزهد، باب ذكر القبر والبلى، رقم الحديث (٤٢٦٨) مسند أحمد (١٣٩/٦)

" رضیت باللّٰہ ربا، وبالإسلام دینا، وبمحمد رسولا " [1]

یا اللہ! میں تجھے رب مان کر، اسلام کو اپنا دین مان کر اور محمد ﷺ کو اپنا رسول مان کر راضی ہوں۔

دن میں پانچ بار یہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں، یعنی اس پیپر کی تیاری بار بار ہو رہی ہے، پھر صبح و شام کے اذکار میں تین تین بار آپ یہ پڑھتے ہیں:

" رضیت باللّٰہ ربا، وبالإسلام دیناً، وبمحمد رسولا " [2]

میں راضی ہوں اللہ کو رب مان کر، اسلام کو اپنا دین مان کر اور محمد ﷺ کو اپنا رسول مان کر، چھ دفعہ یہ ہوگیا، گیارہ بار اس پیپر کی روزانہ تیاری ہو رہی ہے، لیکن بات یہ ہے کہ اس کے معنی کو سمجھو، اس کی معنویت کو اپناؤ، اس پر عملی اور اعتقادی طور پر ڈٹ جاؤ اور قائم ہو جاؤ، تا کہ صحیح حلاوت نصیب ہو جائے، جس کو صحابہ روز اول ہی قبول کر لیتے تھے، یہ تو پہلے دن کا درس ہے، باقی باتیں تو بعد کی ہیں۔

ہمیں یہ حلاوت کیوں حاصل نہیں ہوتی؟

آج کیا وجہ ہے کہ سالہا سال اسلام کے دائرے میں گزر جاتے ہیں، لیکن یہ درس نصیب نہیں ہوتا، چنانچہ ہمارے دل حلاوت سے خالی ہیں، حالانکہ یہ روز اول کا درس ہے، صحابہ اس کو پہلے دن قبول کرتے اور ڈٹ جاتے، قبول کر کے اپنی قوموں کا سامنا کرتے، قومیں مارتیں اور مبتلائے عذاب کرتیں، لیکن کوئی پروانہ کرتے، کیونکہ ان تین چیزوں کو مان کر ایمان کی حلاوت کو اپنے دل میں شامل کر چکے ہوتے۔

---

[1] صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ، باب استحباب القول مثل قول المؤذن، رقم الحدیث (۳۸٦)

[2] سنن ابن ماجه: کتاب الدعاء، باب ما یدعو به الرجل إذا أصبح وإذا أمسیٰ، رقم الحدیث (۳۸۷۰)

حلاوتِ ایمان کی علامت:

اس حلاوت کی ظاہری علامت کیا ہے؟ علامت یہ ہے کہ پھر کوئی نیکی بھاری محسوس نہیں ہوتی، پھر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے گلہ کٹوا دینا آسان ہوتا ہے، بلکہ صحابہ تو شہادت کی دعائیں مانگ کر میدان جہاد میں جاتے، ہاں یہ الفاظ ضرور کہتے کہ کسی ایسے کونے میں شہادت کی موت دینا، جہاں دیکھنے والی کوئی نگاہ نہ ہو، تاکہ ریا کاری نہ آئے، یہ عمل کوئی شہرت کے لیے تھوڑا ہوتا ہے، یہ عمل تیری رضا کے لئے ہے، دنیا دیکھے یا نہ دیکھے، یا اللہ بس تو قبول فرمالے اور تیرے دربار میں اس کی پذیرائی ہوجائے، پھر وہ کھڑے کھڑے اپنے کل سرمائے کے سودے کر دیتے تھے، جیسے ابو درداء نے کیا، ایک ہی باغ تھا، مشہور باغ تھا، اللہ کی رضا کا معاملہ آ گیا، جنت کے درختوں کی خرید کا معاملہ آ گیا، کھڑے کھڑے سارا باغ دے دیا اور جنت کے درخت خرید لئے۔

اس لئے کہ حلاوت دل میں ہے، وہ مٹھاس دل میں ہے، پھر راتوں کو اٹھنا آسان ہے، سردی کے باوجود ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا آسان ہے، زکوۃ دینا آسان ہے، صدقہ دینا آسان ہے، روزہ رکھنا آسان ہے، حج کا سفر، جو بڑا پرمشقت سفر ہے، کرنا آسان ہے، نیندیں قربان کرنا آسان ہے، مال قربان کرنا آسان ہے، جب یہ حلاوت دل میں آتی ہے، تو پھر گناہ بھاری پڑ جاتا ہے، جس قدر یہ حلاوت ہوگی، اسی قدر گناہ بھاری پڑے گا۔

صحابۂ کرام میں حلاوتِ ایمان کے اثرات:

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

"أنتم تأتون بأمور هي أدق في أعينكم من الشعرة وكنا نعدها في عهد رسول الله من الموبقات."[1]

کہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ تم آج ایسے گناہ کرتے ہو کہ تمہارے نزدیک وہ گناہ صرف اتنی اہمیت کے حامل ہیں کہ ناک پر مکھی بیٹھی اور یوں کر کے اڑا دی، بس! بس یہ وقعت ہے، وہ گناہ تم اتنی جرأت سے کرتے ہو کہ تمہیں کوئی پروا ہی نہیں، وہ گناہ کرنا ایسے ہے، جیسے مکھی بیٹھی اور اڑا دی، بس معاملہ ختم، ہم تو اللہ کے پیغمبر کے دور میں ان گناہوں کو پہاڑوں سے بوجھل اور مہلک سمجھتے تھے، بعض روایتوں میں جس گناہ کا ذکر ہے، وہ کپڑے کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانا ہے،[2] کپڑے ہو، وہ پتلون ہو، شلوار ہو، پاجامہ ہو، لنگی ہو، کوئی بھی کپڑا ہو، اس کو ٹخنے سے نیچے کرنا، فرمایا کہ یہ گناہ تم کرتے ہو، اس کی کوئی پروا نہیں کرتے، ہم اللہ کے پیغمبر کے دور میں اس گناہ کو اتنا مہلک سمجھتے تھے کہ یہ گناہ ہماری پوری عاقبت کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے، تمہیں کوئی پروا ہی نہیں!

ہمارا طرزِ عمل:

تو معاملہ کیا ہے؟ وہ حلاوت دل میں نہیں، وہ بشاشت دل میں نہیں، وہ ایمان کی مٹھاس دل میں نہیں، اگر یہ مٹھاس آجائے تو نیکیوں کی محبت پیدا ہوگی، بندہ کوئی نیکی نہیں چھوڑے گا، گناہوں سے نفرت ہوگی، کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرے گا اور آج اتنے کمزور ایمان ہیں کہ گناہ بھی ہوتے ہیں اور گناہ آگے بیان بھی ہوتے ہیں، بندہ گناہ کر کے گناہ کو چھپائے، اللہ سے توبہ کر لے، ندامت کا اظہار کر لے، اپنے

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الرقاق، باب ما يتقى من محقرات الذنوب، رقم الحديث (٦١٢٧)

[2] سنن الدارمي (٢/٤٠٧)

معاملے کو صاف کرالے، لیکن ہمارا تو یہ حال ہے کہ گناہ ہوتے ہیں اور گناہوں کو آگے بیان بھی کیا جاتا ہے، رات ہم نے ٹی وی پر فلاں ڈرامہ دیکھا، رات ہم نے فلاں شو دیکھا تھا، رات ہم نے فلاں محفل موسیقی اٹینڈ کی، رات ہم نے فلاں کام کیا، فلاں کام کیا، فلاں کلب میں گئے، یہ کیا اور وہ کیا، گناہوں کو بیان کیا جاتا ہے، کیسے مسلمان ہیں؟ کیسا عقیدہ اور کیسا منہج ہے؟

یہ اس انشراح ایمان کی نشانیاں ہیں کہ ہر نیکی آسان ہے اور گناہ پہاڑ کی طرح بوجھل محسوس ہوتا ہے، تو ہرقل کا یہ کہنا کہ ایمان کی مٹھاس جب دل میں شامل ہوتی ہے، تو پھر بندہ اس ایمان کو چھوڑ نہیں سکتا، اطاعت کے راستے کو چھوڑ نہیں سکتا، گناہوں کا راستہ اپنا نہیں سکتا، پھر وہ سچے ایمان پر، منہج پر، مشن پر، توحید پر، عقیدے اور عمل کی محبت پر قائم ہو جاتا ہے، یہ اس کا راستہ ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ یہ تو پہلے دن کی تربیت ہے، ان تین چیزوں کو صحیح معنی میں سمجھ لینا، ان کو قبول کر لینا، یہ پہلے دن کی تربیت میں شامل ہے، مگر اس سے آج ہم خالی ہیں، کیونکہ ہم نے عقیدہ اور منہج بالکل بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

ہرقل کا ساتواں سوال:

ہرقل نے رسول اکرم ﷺ کے بارے میں ابوسفیان سے جو سوال کیے، ان میں ایک سوال یہ تھا کہ "هل يغدر؟" کیا محمد (ﷺ) کبھی دھوکہ دیتے ہیں؟ ابوسفیان نے جواب دیا: "لا يغدر" وہ دھوکہ نہیں دیتے اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ "نحن منه في مدةٍ ما ندري ما هو صانع فيها؟" البتہ آج کل اس سے ہمارا ایک صلح کا معاہدہ ہے، دس سال جنگ نہ کرنے کا ایک میثاق اور ایک عہد ہے، اس معاہدے کے بارے میں وہ کیا کریں؟ اس کو نبھائیں یا توڑ دیں؟ یہ ہم نہیں جانتے، بہرکیف آج تک دھوکہ نہیں دیا، ابوسفیان کا کہنا ہے کہ "ما أمكنني أن أدخل كلمة غير هذه

الکلمة" ہرقل کے ہر سوال پر میری یہ کوشش تھی کہ میں کوئی ایسا جملہ کہنے میں کامیاب ہو جاؤں، جس میں محمد ﷺ کی تنقیص ہو یا آپ کی اہانت و تذلیل ہو، لیکن میں کامیاب نہ ہو سکا، البتہ اس سوال پر میں یہ جملہ داخل کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ ماضی میں کوئی دھوکہ نہیں دیا، لیکن مستقبل میں ہمیں خدشہ ہے، ہمارا ایک دس سالہ صلح کا عہد ہو چکا ہے، ہمیں خدشہ ہے کہ شاید وہ اس عہد کو توڑ دے۔

ہرقل کا تبصرہ:

ہرقل نے اس کا کیا جواب دیا؟ وہ کہتا ہے کہ " الرسل لا تغدر" یہ بات درست ہے کہ جو اللہ کے سچے نبی ہوتے ہیں، وہ دھوکہ نہیں دیتے، ابوسفیان کہتا ہے کہ مجھے بڑی خفت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا کہ جو خدشہ میں نے مستقبل کے حوالے سے ظاہر کیا، اسے اس نے تبصرے کے قابل نہیں سمجھا اور اس پر اس نے ایک لفظ نہیں کہا، البتہ بعض روایتوں میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ ہرقل نے کہا" أنتم أغدر "[1] کہ جو تم نے محمد ﷺ کی صفات بیان کیں ہیں، ان صفات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہے کہ وہ دھوکہ نہیں دے سکتے، ہاں تم دے سکتے ہو اور واقعتاً قریش مکہ نے عہد توڑ دیا، سن چھ ہجری میں یہ معاہدہ ہوا تھا، وہ دو سال بھی یہ معاہدہ نہ نبھا سکے، آٹھ ہجری میں ان سے غدر ہوا اور وہ میثاق کو توڑ بیٹھے، جس کے نتیجے میں محمد رسول اللہ ﷺ نے مکہ پر حملہ کر دیا اور مکہ فتح ہوگیا۔

دھوکہ کون دیتا ہے؟

ہرقل نے کیا کہا: " الرسل لا تغدر " اللہ تعالیٰ کے سچے نبی دھوکہ نہیں دیتے، دھوکہ کون دیتے ہیں؟ جو طالب دنیا ہوں، لیکن جن کی نظر آخرت پر ہو اور جو آخرت

---

[1] السيرة لابن كثير (٥٠٢/٣) فتح الباري (٣٦/١)

کے سچے خریدار ہوتے ہیں، وہ بڑے سادہ اور بڑے نفیس ہوتے ہیں، ان میں دھوکہ نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی، یہ تو دنیا کے طالب ہیں، جو دنیا کے عہدوں، مال و منال اور سیاستوں کی لالچ میں دھوکے اور عہد شکنی کرتے ہیں، لیکن چونکہ نبی کی نگاہ درجات علیٰ پر مرکوز ہوتی ہے اور وہ جنت کا سچا خریدار ہوتا ہے، لہٰذا نبی ﷺ اور نبی کے سچے اُتباع سے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دھوکہ دیں یا جھوٹ بولیں، یعنی ہرقل نے نبی ﷺ کے اوصاف سن کر یہ تجزیہ کیا کہ جو ہستی ان اوصاف کی مالک ہے، وہ غدر نہیں کر سکتی، کیونکہ جو اللہ کے سچے نبی ہوتے ہیں، وہ غدر نہیں کر سکتے۔

چہرۂ نبوت کے اوصاف:

جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کفار قریش کا بڑا پروپیگنڈا سنا کہ وہ ساحر ہے، جادوگر اور شاعر ہے، اس میں جنون آچکا ہے، طرح طرح کی باتیں سنیں، سوچا کہ میں خود جا کر دیکھوں، جب وہ نبی ﷺ کو دیکھتا ہے، تو اس کے الفاظ ہیں:

"فلما تبينت وجهه، أيقنت بأن هذا الوجه ليس بوجه كذاب "

جب میں نے محمد ﷺ کے چہرے کو دیکھا، تو میرے دل سے یہ گواہی اٹھی کہ یہ چہرہ جھوٹا نہیں ہوسکتا، قریب سے دیکھا اور پھر باتیں بھی سنیں، اس وقت آپ صحابہ کو وعظ فرما رہے تھے اور یہ جملے میں نے سنے:

" أفشوا السلام، ولينوا الكلام، وأطعموا الطعام، وصلوا بالليل والناس نيام، تدخلوا الجنة بسلام " [1]

سلام کو عام کرو، گفتگو کو نرم کرو، لوگوں کو کھانا کھلاؤ، لوگ رات کو سوئے ہوں، تو تم نفل پڑھو، اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز کرو، اگر یہ کام کرو گے، تو بڑی سلامتی اور بڑے پیار کے ساتھ جنت میں داخل ہوجاؤ گے۔

[1] سنن الترمذي، أبواب صفة الجنة، رقم الحديث (٢٤٨٥) وقال الترمذي: "هذا حديث صحيح"

میرے دل سے یہ آواز اور شہادت آئی کہ یہ چہرہ جھوٹ نہیں بھول سکتا، انہی اوصاف کو سن کر ہرقل نے بھی کہا کہ جو تم نے صفات بیان کی ہیں، یہ اللہ کے سچے نبی کے اوصاف ہیں، ان اوصاف کا حامل جو بھی ہوگا، وہ غدر نہیں کر سکتا۔

ہرقل کا آٹھواں سوال:

اب ایک سوال یہ بھی کیا کہ " کیف کان قتاله معکم؟ " یقیناً تمہاری آپس میں جنگیں ہوتی ہیں، ان جنگوں کے نتائج کیا ہیں؟ کون جیتتا اور کون ہارتا ہے؟

ابوسفیان کا جواب:

ابوسفیان نے جواب دیا:" الحرب بیننا سجال " کہ ہماری جنگیں آپس میں کنویں کے ڈول کی مانند ہیں، کنویں کے ڈول پر ایک شخص کا حق نہیں ہوتا، وہ کبھی کسی کے ہاتھ میں اور کبھی کسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے، تو ہماری جنگیں بھی ڈول کی مانند ہیں، کبھی ہم کامیاب ہوتے ہیں اور کبھی وہ کامیاب ہوتے ہیں:" ینال منا وننال منه " کبھی ہم انہیں نقصان پہنچاتے ہیں اور کبھی وہ ہمیں نقصان پہنچاتے ہیں۔

ابوسفیان کے جواب کا تجزیہ:

شارحین نے لکھا ہے کہ یہاں بھی ابوسفیان تھوڑی سی گڑ بڑ کر گیا، کیونکہ کفار عارضی طور پر نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوئے، یعنی کبھی ہم کامیاب ہوئے، یہ اشارہ جنگ احد کی طرف ہے اور کبھی وہ کامیاب ہوئے، یہ اشارہ جنگ بدر کی طرف ہے، ان کی کامیابی مستقل کامیابی نہیں تھی، وہ نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوئے، لیکن بالآخر جو انجام کار تھا، وہ کفار کی شکست کی صورت میں تھا، اس واقع کو بیان کرنے میں بھی اس سے غلطی ہوئی، کیونکہ عارضی طور پر کچھ نقصان پہنچانے میں وہ ضرور کامیاب ہوئے، لیکن جنگ احد کا جو نتیجہ تھا، وہ مسلمانوں کی فتح کی صورت میں ظاہر ہوا اور بالآخر کفار کو ہزیمت و شکست ہوئی اور وہ شکست خوردہ ہو کر بھاگے۔

ہرقل کا تبصرہ:

ہرقل نے اس پر کیا تبصرہ کیا؟ بڑا منہجی نقطہ ہے، اس نے کہا: "الرسل تبتلیٰ ثم تکون لھم العاقبة" یہ بات بھی درست ہے، یہ مت سمجھو کہ اسلام کو ہمیشہ فتح ہوتی ہے، نقصان نہیں ہوتا، نقصان ہوتا ہے، شہادتیں ہوتیں ہیں، کیوں؟ "الرسل تبتلیٰ" رسولوں کی آزمائش ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو آزماتا اور ان کا امتحان لیتا ہے، جو ان کے ساتھی ہوتے ہیں، انہیں بھی چیک کرتا اور ان کا بھی امتحان لیتا ہے، وہ جھنجھوڑے اور آزمائے جاتے ہیں، وہ تکلیفوں، فاقوں اور سختیوں میں مبتلا کیئے جاتے ہیں، "ثم تکون لھم العاقبة" اور پھر جب وہ بھرپور صبر کرنے میں کامیاب ہوجائیں، تو اللہ تعالیٰ بالآخر انجامِ کار ان کے حق میں فرما دیتا ہے اور پھر ان کو کامیابیاں عطا فرما دیتا ہے، لیکن ابتداء میں رسولوں کو بھی جھنجھوڑا جاتا ہے، انہیں بھی آزمایا جاتا ہے اور انہیں بھی آزمائشوں اور امتحانوں کی چکی میں پیسا جاتا ہے۔

انبیاء کی آزمائش:

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "أشد البلاء الأنبياء ثم الأمثل فالأمثل"[1] کہ سب سے سخت تکلیفیں نبیوں پر آتی ہیں، نبیوں کو بڑا آزمایا جاتا ہے، بڑا جھنجھوڑا جاتا ہے، مسلسل فاقے برداشت کرنے پڑتے ہیں، قوموں کے طعنے سننے پڑتے ہیں، قوموں سے پتھر کھانے پڑتے ہیں، قوموں کی ماریں برداشت کرنی پڑتی ہیں، تو سب سے سخت تکلیفیں نبیوں پر آتی ہیں، "ثم الأمثل فالأمثل" اور نبیوں کے بعد ان پر آزمائشیں آتی ہیں، جن کا درجہ اور مقام انبیاء کے بعد ہو۔

---

[1] سنن الترمذي: أبواب الزهد، باب ما جاء في الصبر على البلاء، رقم الحديث (٢٣٩٨) وقال الترمذي: "هذا حديث حسن صحيح"۔

آزمائش کا معیار:

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"الرجل يبتلى بقدر دينه ."[1] کہ ہر شخص کی آزمائش اس کے دین کے مطابق ہوتی ہے۔

اگر اس میں دین داری زیادہ ہوگی، تو اس کی ابتلاء بھی سخت ہوگی، دین داری کم ہوگی، تو اس کا امتحان بھی ہلکا ہوگا، اس لئے فرمایا کہ اللہ رب العزت کچھ لوگوں کو آزماتا ہے، فتنوں میں مبتلا کرتا ہے۔ " لا يزال الرجل في بلاءٍ "تکلیفوں کے پہاڑ ٹوٹتے رہتے ہیں، کبھی بیماریاں اور کبھی مخالفین کی مخالفتیں، ان کے طعنے، تکلیفیں، سختیاں، کبھی فقر، کبھی فاقہ، ایک تکلیف آئی، وہ ختم ہوئی، تو دوسری آ گئی۔

آزمائش مغفرت کا ذریعہ ہے:

ایک شخص آزمائشوں میں گھرا رہتا ہے، حتی کہ ایک وقت آتا ہے: " إنه يمشي على الأرض وليس عليه سيئة " کہ وہ زمین پر چل پھر رہا ہوتا ہے اور اس کے ذمے ایک گناہ باقی نہیں بچتا اور نہ اس کے سر پر ایک بھی گناہ کا بوجھ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ آزمائشوں میں ڈال ڈال کر اسے گناہوں سے پاک صاف اور گناہوں سے بری کر دیتا ہے، تو انبیاء تو اللہ رب العزت کی سب سے زیادہ مقرب اور مقدس شخصیات ہیں، تو ان کے امتحان بھی زیادہ ہوتے ہیں، جنگیں ہوتیں ہیں، کفار سے مقابلے ہوتے ہیں اور بعض اوقات شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات شہادتیں ہوتیں ہیں اور زخم بھی آتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ پر آزمائشیں:

ا۔ جیسا کہ جنگ احد میں رسول اللہ ﷺ زخموں سے چور ہوگئے، نڈھال ہو کر

---

[1] یہ الفاظ مذکورہ بالا حدیث کا حصہ ہیں۔

ایک کھائی میں گر گئے، سر زخمی ہوا، دندان مبارک شہید ہوئے، چہرہ بھی زخمی ہوا،[1] تو انبیاء آزمائے جاتے ہیں اور جھنجھوڑے جاتے ہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ تمام معشر انبیاء میں سب سے زیادہ سختیاں مجھ پر آئیں، کیونکہ آپ سب سے افضل اور سب سے زیادہ اللہ کے مقرب بندے ہیں۔

۲۔ کبھی آپ کو بخار ہوتا تو آپ اکیلے کو دو انسانوں کے برابر بخار ہوتا، صحابہ کبھی آپ کی بیمار پرسی کے لیے آ کر دور بیٹھتے، تو آپ کے بخار کی تپش ان تک پہنچتی، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

" إني لأوعك كما يوعك رجلان منكم ."[2]

''مجھ اکیلے کو تمہارے دو انسانوں جتنا بخار ہوتا ہے۔''

۳۔ فاقے اور فقر آپ نے برداشت کیے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''مجھ پر اور بلال پر بعض اوقات تین تین دن گزرتے اور ہم دونوں کو کھانا نہ ملتا۔'' بلال آپ کے ابتدائی ساتھی ہیں، عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا تھا:

" من اتبعك علىٰ هذا الأمر يا رسول الله " یا رسول اللہ! اب تک کتنے ساتھی بن سکے ہیں؟ فرمایا کہ " حر وعبدٌ " ایک آزاد اور ایک غلام، یہ آپ کے ابتدائی ساتھی ہیں۔ فرمایا کہ تین تین دن ہم پر ایسے گزرتے کہ مجھے اور بلال کو کھانا نہ ملتا، صرف اتنا ملتا جو بلال کی بغل میں پورا آ جاتا، اتنا تھوڑا اور اتنی کم مقدار میں، یہ

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الجهاد والسير، باب لبس البيضة، رقم الحديث (٢٧٥٤) صحيح مسلم: كتاب الجهاد والسير، باب غزوة أحد، رقم الحديث (١٧٩٠)

[2] صحيح البخاري: كتاب المرضىٰ، باب أشد الناس بلاء الأنبياء ثم الأول فالأول، رقم الحديث (٥٣٢٤) صحيح مسلم: كتاب البر والصلة والآداب، باب ثواب المؤمن......، رقم الحديث (٢٥٧١)

فقرہ و فاقہ آپ نے شعب ابی طالب میں تین سال مکمل مقاطعہ کے ساتھ گزارے، مکمل اقتصادی اور مصاھرت کا بائیکاٹ ہوا، کوئی رشتہ اور کوئی لین دین نہیں۔

۴۔ اور پھر نبی ﷺ کو عام الحزن دیکھنا پڑا، آپ یتیم پیدا ہوئے، پیدا ہوتے ہی ماں کا سہارا چھن گیا، دادا نے پالا اور تربیت کی، وہ بھی فوت ہوگئے اور نبی ﷺ کی پیاری بیوی خدیجہ، جو آپ کے گھر کی ساتھی تھی، مواساۃ کرتی تھی، اس کا بھی انتقال ہوگیا، یہ بڑا صدمہ تھا، ایک شخص باہر سے تھکا ہارا اپنے گھر میں آتا ہے، اسے اگر گھر میں پیار نہ ملے، گھر میں بداخلاقی ملے، تو وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی خدمات اور جنت میں درجات:

خدیجہ رضی اللہ عنہا نے مواساۃ کی، اپنا سب کچھ نچھاور اور قربان کر دیا، اس کی جدائی کا بڑا ملال اور بڑا صدمہ تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

" خديجة واستني بما لها، وصدقتني إذ كذب الناس، وامنت بي إذ كفر الناس، " [1]

اس نے اپنا مال مجھ پر قربان کر دیا، خدیجہ نے اس وقت مجھے سچا کہا، جب سب نے مجھے جھوٹا کہا، جب سب لوگ کافر تھے، خدیجہ اس وقت ایمان لا چکی تھی۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" بشروا خديجة ببيت من الجنة من قصب لا صخب فيه ولا نصب " [2]

---

[1] مسند أحمد (۱۱۷/٦)

[2] صحيح البخاري: أبواب العمرة، باب متى يحل المعتمر، رقم الحديث (١٦٩٩) صحيح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل خديجة رضي الله عنها، رقم الحديث (٢٤٣٣)

اللہ تعالیٰ نے خدیجہ کو جنت میں یہ مقام دیا ہے کہ صرف خدیجہ کے لیے اللہ نے جنت میں جو محل بنایا ہے، وہ پورا ایک ہی موتی کا محل ہے، اس میں کمرے اور محل کی سب ضروریات موجود ہیں، اور وہ سارا محل ایک ہی موتی میں تراشا گیا ہے، اس میں کوئی شور نہیں، بڑا پرسکون ہے، یہ خدیجہ کا مقام ہے، یہ ایک بڑا گہرا ساتھ ہے، جب آپ پر وحی اتری اور آپ کو ایک عجیب صورت حال کا سامنا کرنا پڑا، صاحب وحی فرشتے نے آپ کو سینے پر لگا کر دبایا، حتی کے قریب تھا کہ جان نکل جاتی، چونکہ اس صورت سے آپ واقف نہیں تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ گھر پہنچے اور " زملوني زملوني " کہا اور کہا کہ مجھے اپنی ہلاکت اور بربادی کا اندیشہ ہے، میں جلدی ختم ہو جاؤں گا، خدیجہ نے کہا: یہ کیسے ممکن ہے؟

" إنك لتحمل الكل، وتكسب المعدوم، وتقري الضيف، وتعين على نوائب الحق "[1] آپ مہمان نواز ہیں، آپ غریبوں کو کما کر دیتے ہیں اور آپ لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں اور آپ حق کے مددگار ہیں، اس کے لیے جو مدد کرنی پڑے، جو خرچ کرنا پڑے، آپ کرتے ہیں، جس شخصیت کے یہ اوصاف ہوتے ہیں، اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، یہ پہلی مواساۃ آپ کو اپنے گھر میں ملی، یہ صدمہ بڑا تکلیف دہ تھا، شعب ابی طالب کے بعد عام الحزن آیا، اس میں دوسرا صدمہ یہ ہوا کہ باہر آپ کی مدد کرنے والا آپ کا چچا ابوطالب تھا، وہ بھی اسی سال فوت ہو گیا، گھر کی مواساۃ خدیجہ نے سنبھال رکھی تھی اور باہر مدد کرنے والا ابوطالب تھا، دونوں ایک ہی سال فوت ہوئے، اب نبی ﷺ کفار قریش کو دعوت دیتے ہیں، جب دیکھا

---

[1] صحيح البخاري: باب كيف كان بدء الوحي إلىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم الحديث (٣) صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب بدء الوحي إلىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم الحديث (١٦٠)

کہ یہ دو بڑے قوی قسم کے سہارے چلے گئے ہیں، تو اللہ کے نبی ﷺ کسی ایسے ہی سہارے کو چاہتے تھے، اچھے ساتھی ساتھ ہوں، تو دعوت میں تقویت ہوتی ہے۔

اہل طائف کو دعوت:

آپ نے سوچا کہ مکہ والے اس دعوت کو نہیں مانتے، تو مکہ والوں کو بتا کر گئے کہ تم میرے اپنے ہو اور میرے چچے تائے ہو، تم نے میری دعوت کو قبول نہیں کیا، اب میں بیگانوں میں جاتا ہوں، انہیں جا کر دعوت دیتا ہوں، چنانچہ آپ طائف چلے گئے، اہل طائف کو جمع کیا اور فرمایا کہ "قولوا لا إله إلا الله "اے طائف والو! میں تمہیں توحید کی دعوت دیتا ہوں، میرے اپنوں نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، تم قبول کر لو، پوری قوم اس دعوت کو قبول کر لے، دائرۂ اسلام میں داخل ہوجائے، تاکہ تمہیں پہلی قوم کا اعزاز حاصل ہوجائے، جس نے اس دین کو قبول کیا۔

اہل طائف کا جواب:

اہل طائف نے کہا یہ کیا: معاملہ ہے؟ اتنے سارے معبودوں کو تم نے ایک ہی کر دیا؟ پتھراؤ شروع کر دیا، حتیٰ کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا پورا جسم لہولہان ہوگیا، آج تو اتنا خون بہا کہ آپ بے ہوش ہو کر گر گئے، جب ہوش آیا، تو آپ نے پھر دعوت دی، قوم نے پھر وہی سلوک کیا، پھر آپ گرے، تیسری بار پھر دعوت دی، پھر وہی سلوک ہوا، کپڑے سرخ ہوگئے اور بار بار غشی کے دورے پڑ رہے ہیں، یہ اہل طائف کا سلوک تھا، کتنا حزن اور کتنا ملال ہے؟ قوم سے تو کہا تھا کہ بیگانے اس دعوت کو قبول کریں گے، لیکن " أشد البلاء الأنبياء " یہ سخت ترین تکلیفیں نبیوں کا حصہ ہیں۔

نبیٔ رحمت:

یہ دین اسلام کی طبیعت ہے کہ اللہ کے انبیاء کو جھنجھوڑا جاتا ہے، اللہ کو ان کا

امتحان مقصود ہے، اللہ نے امتحان لیا، جبرائیل امین آ گئے، ملائکہ آ گئے کہ آپ ایک اشارہ تو کر دیں، ان دو پہاڑوں کے بیچ میں اس قوم کو پیس کے رکھ دیں، فرمایا: نہیں،[1] " بعثت رحمة، ولم أبعث لعانا "[2] مجھے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، لعنت دینے والا اور بد دعا کرنے والا نہیں!

رسول اللہ ﷺ کا تاریخی جملہ:

اس موقع پر آپ نے ایک تاریخی جملہ کہا کہ آج اگر اہل طائف میری دعوت کو قبول نہیں کرتے، تو کل ان کی اولادیں قبول کر لیں گی، ان کے بچے قبول کر لیں گے، ان کے پوتے قبول کر لیں گے اور واقعتاً یہ کلام اللہ نے قبول کر لیا اور اہل طائف بھی بعد میں مسلمان ہو گئے اور ان کی اولادوں میں سے ایسی ایسی شخصیات پیدا ہوئیں، جو دین کا ایک مضبوط قلعہ اور حصار بن گئیں، میں صرف ایک ہی نام آپ کو پیش کروں گا، وہ ایسا معتبر نام ہے کہ میرا اور آپ کا اسلام اسی شخصیت کی جہود کے پیش نظر ہے، یہ محمد بن قاسم ثقفی ہیں، یہ بنو ثقیف کے، جو طائف کا ایک علاقہ ہے، اس علاقے کی شخصیت ہے، اسلام قبول کیا اور فاتح سندھ بنے، اس علاقے کے تمام مسلمان اسی کی جہود سے اسلام لائے، تو ایک ہی شخصیت نے ان علاقوں کی کایا پلٹ دی، تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ قوم میری دعوت قبول نہیں کرتی، تو کل ان

---

[1] صحيح البخاري: كتاب بدء الخلق، باب إذا قال أحدكم آمين والملائكة في السماء فوافقت إحداهما الأخرى غفر له ما تقدم من ذنبه ، رقم الحديث (٣٠٥٩) صحيح مسلم: كتاب الجهاد والسير، باب ما لقي النبي صلى الله عليه وسلم من أذى المشركين والمنافقين، رقم الحديث (١٧٩٥)

[2] صحيح مسلم: كتاب البر والصلة والآداب، باب النهي عن لعن الدواب وغيرها، رقم الحديث (٢٥٩٩)

کی اولادیں کریں گی، اولادوں نے کیا اور ایسا کیا کہ وہ علاقوں کے فاتح بن گئے، ایسا قبول کیا کہ ان کی جہود سے علاقوں کے علاقوں کی کایا پلٹ گئی اور دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے، انہوں نے دین توحید کو قبول کرلیا اور اللہ کے پیغمبر ﷺ کی سچی غلامی کو قبول کرلیا۔

رسول اللہ ﷺ پر سب سے بھاری آزمائش:

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک بار پوچھا: "هل مر عليك يوم أشد من أحد؟" [1] یارسول اللہ! کیا آپ نے احد سے زیادہ سخت دن کبھی دیکھا؟ جنگ احد میں آپ کے دندان مبارک شہید ہوئے، چہرہ زخمی ہوا اور آپ کے سر میں بڑا گہرا زخم آیا، خون رکنے کا نام نہیں لے رہا، حتی کہ چٹائی جلائی گئی اور اس کی راکھ سے زخم کو بھرا گیا، تب خون رکا۔ [2] عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا اس سے سخت دن آپ نے دیکھا ہے؟ فرمایا کہ ہاں عائشہ! طائف کا دن اس سے سخت تھا، جو اہل طائف نے سلوک کیا، وہ تو کیا، لیکن تم تصور نہیں کرسکتی کہ میں کن بوجھل قدموں سے طائف سے باہر آیا؟ پھر مکہ میں کیسے داخل ہوا؟ میں نے تو اپنی قوم سے کہا تھا، تم نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا، لیکن بیگانے اس کو قبول کریں گے، اب کس طرح مکہ میں داخل ہوں؟ اور وہ لوگ بھی منتظر تھے کہ اب تو محمد (ﷺ) بالکل بے یارومددگار ہے، اب تو کوئی ان کا ساتھی

---

[1] صحيح البخاري: كتاب بدء الخلق، باب إذا قال أحدكم آمين والملائكة في السماء فوافقت إحداهما الأخرى غفر له ما تقدم من ذنبه، رقم الحديث (٣٠٥٩) صحيح مسلم: كتاب الجهاد والسير، باب ما لقي النبي صلى الله عليه وسلم من أذى المشركين والمنافقين، رقم الحديث (١٧٩٥)

[2] صحيح البخاري: كتاب الجهاد والسير، باب لبس البيضة، رقم الحديث (٢٧٥٤) صحيح مسلم: كتاب الجهاد والسير، رقم الحديث (١٧٩٠)

اور کوئی مددگار نہیں، اب تو وہ ہاتھوں میں پتھر لئے کھڑے ہیں اور کچھ بھی سلوک کر سکتے ہیں۔

اس وقت رسول اللہ ﷺ نے مطعم بن عدی، جس میں کچھ خیر کے آثار تھے، جس میں کچھ سنجیدگی اور متانت تھی، کے پاس اپنے غلام کو بھیجا اور کہا کہ مطعم سے کہو کہ مجھے کفار کے برے سلوک کا خطرہ ہے، کیا تم مجھے اپنی امان دے سکتے ہو؟ میں چاہتا ہوں تمہاری امان میں مکہ میں داخل ہوں، تاکہ کوئی مجھے گزند نہ پہنچائے اور کوئی مجھے تکلیف نہ دے؟ مطعم بن عدی امان دینے پر تیار ہوگیا، اس نے اپنے جوانوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھما دیں اور کہا کہ بیت اللہ کے ایک ایک کونے میں کھڑے ہوجاؤ اور کسی نے بھی پتھر پھینکنے کی کوشش کی، یا کوئی تکلیف دینے کی کوشش کی، یا کوئی طعنہ زنی کی کوشش کی، تو تم نے اپنی تلواریں لے کر باہر آجانا ہے اور اپنی جان قربان کردینی ہے، تب نبی ﷺ مکہ میں داخل ہوئے۔ [1]

تو انبیاء کی تاریخ اور نبی ﷺ کی سیرت میں یہ بڑا مہیب اور بڑا خطرناک دن تھا، فرمایا کہ یہ دن سب سے سخت تھا، اس لئے جہاد کی بہ نسبت دعوت کے میدان زیادہ سخت اور خطرناک ہوتے ہیں، جنگ احد ایک جہادی میدان تھا اور طائف ایک دعوتی میدان تھا، فرمایا کہ یہ دن زیادہ سخت ہے، حالانکہ احد میں ستر صحابہ شہید ہوئے، لیکن یہ دن آگے چل کر بڑے واقعات پر مترتب ہوا اور اس کے بڑے آثار ظاہر ہوئے، تو اس طرح آپ بوجھل قدموں کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے۔

مطعم بن عدی کے احسان کا بدلہ:

جب جنگ بدر ہوئی اور کفار قریش ستر قتل ہوئے اور ستر قید ہوئے، تو ان کے بارے میں مشاورت ہو رہی ہے کہ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ کسی نے کہا کہ

[1] دیکھیں: فتح الباري (٧/ ٣٢٤)

ان کو قتل کر دیں، کسی نے کہا ان کا فدیہ لے لیں اور کسی نے کہا کہ ان سے ہم ہنر سیکھیں، کتابت سیکھیں، اپنے بچوں کو سکھلائیں، تاکہ انہیں کچھ علم اور لکھنے پڑھنے کے ڈھنگ آ جائیں، اس وقت رسول اللہ ﷺ کو مطعم بن عدی یاد آئے، اس کا وہ احسان یاد آ گیا، فرمایا:

" لو كان المطعم بن عدي حيا ثم كلمني في هؤلاء النتنى لتركتهم له "[1]

آج اگر مطعم زندہ ہوتا اور وہ ان ستر مرداروں کی سفارش کرتا، تو اس کی سفارش پر میں سب کو رہا کر دیتا، تاکہ اس کے اس احسان کا بدلہ آج چکانے میں کامیاب ہوتا، لیکن وہ آج زندہ نہیں۔

کفار مردار ہیں:

آپ نے ان کو مردار کہا، حالانکہ وہ زندہ تھے، جس میں یہ اشارہ اور نقطہ ہے کہ کفار اپنے کفر اور شرک کی بناء پر خواہ کتنے ہی طاقت سے لیس اور مسلح ہوں، اگر ہمارا ایمان مستحکم ہوگا، تو ہمارے مقابلے میں کافر زندہ ہونے اور بڑی طاقتوں کے مالک ہونے کے باوجود مردار ہیں، ایک مردے سے کیا خوف؟ ایک قبرستان میں کڑوروں قبریں ہیں، کروڑوں مردے ہیں، ان سے کیا ڈر ہے؟ آپ قبرستان میں چلے جائیں، ان کا کیا خوف ہے؟ اس کا معنی یہ ہے کہ تم اپنے ایمان کو پکا کر لو اور کفار سے بے خوف ہو جاؤ، تمہارے ایمان کے استحکام کے مقابلے میں کفار مردار ہیں، ہاں اگر تم کمزور ہو، تمہارے ایمان میں خلل ہے، تو پھر وہ تم پر حاوی ہو جائیں گے، لیکن شرک اور کفر میں اتنی نحوست ہے کہ یہ مردار اور متعفن ہیں اور ان

---

[1] صحيح البخاري: كتاب المغازي، باب شهود الملائكة بدراً، رقم الحديث (٣٧٩٩)

میں کوئی طاقت نہیں، اگر تمہارا ایمان پختہ ہو اور تمہارا ایمان پکا ہو، تو ان کی ظاہری چمک دمک اور ہتھیار سب بیکار ہیں۔

دعوت میں استقامت:

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ آزمائشیں آئی تھیں، یعنی مکہ کی پوری زندگی کتنا مسلسل صدمات سے دوچار رہی، آپ کا یہ دور کیسے گزرا، یہ دعوت ایمانی کا امتحان تھا، سجدے کی حالت میں اوجھڑی پھینکی گئی،[1] آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، گڑھے کھودے گئے اور مختلف اتہامات دیئے گئے، مجنون اور دیوانہ کہا گیا، ساحر، کاذب اور شاعر کہا گیا، پھر آپ کے سامنے آپ کے ساتھیوں کو شہید کیا گیا، آپ کی بیٹی کو شہید کیا گیا، بلال حبشی کو گرم انگاروں پر گھسیٹا گیا اور خاندان یاسر پر کھولتا ہوا پانی ڈالا گیا، ان پر، ان کے بیٹے عمار اور ان کی بیوی سمیہ پر آپ یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور فرما رہے ہیں: "صبراً یا آل یاسر فإن موعدکم الجنة"[2] خاندان یاسر! صبر سے کام لو، اگر آج صبر میں تم کامیاب ہوگئے، تو میری تمہاری ملاقات جنت میں ہوگی۔ تو انبیاء جھنجھوڑے جاتے ہیں، انبیاء آزمائے جاتے ہیں، ہرقل کی یہ تشخیص اور تبصرہ بالکل برمحل ہے، اس کو بڑا شعور اور بڑی معرفت ہے، چنانچہ محمد رسول اللہ ﷺ کی پوری تیرہ سالہ مکی زندگی دعوت کے میدان میں تکلیفوں سے عبارت ہے، صدمے جھیلے، فاقے برداشت کئے اور فقر برداشت کیا، حتی کہ مدینے آ گئے، ایک الگ شہر مل گیا، ہجرت کر لی اور یہ بھی ایک تکلیف ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: أبواب الجزية والموادعة، باب طرح جيف المشركين في البئر ولا يؤخذ لهم ثمن، رقم الحديث (٣٠٢٤) صحيح مسلم: كتاب الجهاد والسير، باب ما لقي النبي صلى الله عليه وسلم من أذى المشركين والمنافقين، رقم الحديث (١٧٩٤)

[2] المستدرك للحاكم (٤٣٢/٣) شعب الإيمان للبيهقي (٢٣٩/٢) وقال الحاكم: صحيح على شرط مسلم ولم يخرجاه وقال الذهبي: على شرط مسلم، وقال الألباني: "حسن صحيح" (فقه السيرة: ١٠٣)

ہجرت:

اپنے گھر بار کو چھوڑ دیا، یہ تکلیف بھی آپ نے سہی، بیت اللہ کو چھوڑ دیا، مکہ کو چھوڑ دیا اور جاتے ہوئے یہ فرماتے ہیں:

اے اللہ کے گھر! اے بیت اللہ! اے کعبۃ اللہ! اللہ گواہ ہے کہ میں تجھے دل کی خوشی سے چھوڑ کر نہیں جا رہا، ہاں میری قوم نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔[1]

یہ ہجرت جو آپ نے اور صحابہ نے کی، یہ بھی ایک بڑی تکلیف ہے، اپنے کاروبار چھوڑ دیئے، اپنے گھر بار چھوڑ دیئے، اپنی گلیاں چھوڑ دیں اور مولد و مسکن چھوڑ دیا، بلکہ کچھ صحابہ تو اس سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے، صرف اپنے دین، اپنے عقیدے اور ایمان کی سلامتی کے لیے مکہ کو چھوڑ کر حبشہ چلے گئے، اس قدر جھنجھوڑا جا رہا تھا کہ یہ خدشہ پیدا ہوتا جا رہا تھا کہیں یہ تکلیفیں ہمیں ایمان چھوڑنے پر مجبور نہ کر دیں، اگر ایسا خدشہ اور ایسا خوف ہو تو اللہ کی رضا کے لیے، اپنے ایمان کو بچانے کے لیے اور اپنے دین کی سلامتی کے لیے اپنے علاقے کو چھوڑ دو، یہ ہجرت ہے۔

ہجرت کی فضیلت:

اسی لئے پیغمبر ﷺ نے اس کا اجر بیان کیا کہ "الهجرة تهدم ما كان قبلها"[2] اگر ایک شخص اللہ کے لیے ہجرت کرتا ہے، اپنے وطن کو چھوڑتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے عمل کی بنیاد پر اس کی سابقہ زندگی کے تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے،

---

[1] سنن الترمذي: كتاب المناقب، باب في فضل مكة، رقم الحديث (٣٩٨٦) وقال الترمذي: " هذا حديث حسن" وصححه ابن حبان (٢٣/٩) وقال الألباني: " صحيح " (صحيح الجامع، برقم: ٥٥٣٦)

[2] صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب كون الإسلام يهدم ما قبله وكذا الهجرة والحج، رقم الحديث (٢١)

یعنی ہجرت سابقہ گناہوں کو ڈھا دیتی ہے اور سابقہ گناہوں کو مسمار کر دیتی ہے، صرف گراتی ہی نہیں، مسمار کر کے ان کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے، کوئی گناہ باقی نہیں رہتا۔

ہجرت حبشہ کی فضیلت:

حبشہ میں ان کی زندگی مستقل تکلیفوں سے عبارت تھی، جب حبشہ میں اطلاع پہنچی کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گئے، تب وہ حبشہ سے مدینہ آئے، اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا حبشہ کی مہاجرات میں سے ہیں، انہوں نے حبشہ ہجرت کی تھی، حبشہ سے مدینہ آ گئیں۔

ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی بیٹی حفصہ سے ملنے آئے، تو اسماء بنت عمیس کو دیکھا، پوچھا یہ خاتون کون ہے؟ عرض کیا کہ یہ اسماء ہیں، پوچھا کون اسماء؟ کہا کہ اسماء بنت عمیس! فرمایا کہ " آلبحرية أنتِ؟ آلحبشية أنتِ؟ "کہ تو حبشی ہے، یعنی حبشہ ہجرت کی، اور تو بحری ہے؟ کیونکہ حبشہ سے جب مدینہ آئے، تو کچھ سفر ان کو بحری جہاز میں کرنا پڑا، کہا کہ ہاں، امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: " نحن سبقناكم بالهجرة " کہ ہم ہجرت میں تم سے سبقت لے گئے، گو تم ہم سے پہلے اپنے ساتھیوں کے ساتھ حبشہ گئی ہو، لیکن اصل ہجرت نبی ﷺ کے ساتھ مدینے کی طرف ہے، اس میں ہم تم سے سبقت لے گئے ہیں، اسماء نے کہا: یہ تم نے کیا کہہ دیا؟

"كنتم مع رسول الله، كان يطعم جائعكم، ويعظ جاهلكم، وكنا في الأرض البعداء البغضاء "

تم تو اللہ کے نبی کے ساتھ تھے، اپنے قائد کے ساتھ، اپنے لیڈر کے ساتھ اور اپنے امام و مقتدیٰ کے ساتھ، جب تمہیں بھوک لگتی، تو ان کی برکت سے تمہیں کھانا مل جاتا تھا اور وہ تمہارے جاہلوں کو دین بھی سکھاتے تھے، اللہ کی وحی بھی اترتی تھے اور تم

وحی کو مستقل سنتے بھی تھے اور ہم تو حبشہ گئے، بہت ہی دور دراز علاقے میں، دشمنوں میں گرے ہوئے تھے، نہ وہاں پر ہمارا کوئی پرسان حال تھا اور نہ ہم وحی کو سن سکتے تھے، تمہیں تو یہ شرف حاصل تھا کہ نبی ﷺ کے ساتھ ہو، ہدایت لے رہے ہو، تعلیم لے رہے ہو، وحی اتر رہی ہے اور وحی کو سنتے ہو اور کبھی بھوک لگتی، پیاس لگتی، تو نبی علیہ السلام کی برکت سے تمہیں کھانا بھی مل جاتا تھا، پانی بھی مل جاتا تھا۔

" وكنا في أرض بعداء بغضاء " ہم تو دشمنوں کی سرزمین میں تھے، جہاں بڑے بڑے اوباش اور بدمعاش تھے، ہمیں فاقے برداشت کرنے پڑے، بھوک سہنی پڑی اور پھر اللہ کی وحی سے دور، دین اور دین کے احکام سے دور تھے، ہم تو ترستے تھے کہ ہم تک دین کے احکام پہنچیں اور یہ ساری تکلیفیں ہم نے اللہ کی رضا کے لیے برداشت کیں، پھر اسماء نے کہا کہ تم نے جو بات کہی ہے، میں اللہ کے نبی سے جا کر پوچھتی ہوں: " والله لا أطعم طعاما ولا أشرب شرابا " جب تک اللہ کے پیغمبر تک پہنچ نہیں جاتی، اس وقت تک کھانے کا ایک لقمہ بھی نہیں کھاؤں گی اور پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں پیوں گی، پہلے اس مسئلے کو حل کراؤں گی کہ ہجرت میں سبقت کون لے گیا؟

اہل حبشہ کے لیے دو ہجرتیں:

پھر نبی علیہ السلام کے پاس آئیں اور کہا کہ یا رسول اللہ! عمر بن خطاب نے یہ کہا ہے، فرمایا کہ عمر نے صحیح نہیں کہا:

" إن له ولأصحابه هجرة، ولكم أهل السفينة هجرتان " [1]

---

[1] صحيح البخاري: كتاب المغازي، باب غزوة خيبر، رقم الحديث (٣٩٩٠) صحيح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل جعفر بن أبي طالب وأسماء بنت عميس وأهل سفينتهم رضي الله عنهم، رقم الحديث (٢٥٠٢)

عمر سے جا کر کہہ دو کہ اس کے لیے اور اس کے ساتھیوں کے لیے ایک ہی ہجرت ہے اور اے کشتی میں سفر کرنے والو! تمہارے لئے دو ہجرتیں ہیں۔

اسماء رضی اللہ عنہا اس حدیث کو سن کر بڑا خوش ہوئیں، ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی اسی سفینے میں پہنچے تھے، اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ میرے پاس ایک دن میں کئی بار آتے اور کہتے کہ مجھے یہ حدیث سناؤ، بس یہ حدیث سننے کے لیے بار بار آیا کرتے تھے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اہل سفینہ کے لیے دو ہجرتیں ہے، یہ تکلیفیں، یہ ترک وطن یہ ہجرتیں وہی " أشد البلاء الأنبياء ثم الأمثل فالأمثل"[1] والا معاملہ ہے۔

آزمائشوں پر صبر:

میرے دوستوں اور بھائیو! یہ سب اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے وہ فیصلے ہیں، جو بندوں کے لیے تکلیف دہ ہوتے ہیں، ان پر صبر کرنا سیکھو، انبیاء وہ شخصیتیں ہیں، جن کو جھنجھوڑا جاتا ہے اور آزمایا جاتا ہے، اس کے بعد وہ لوگ آزمائے جاتے ہیں، جو نبیوں والا کام کرتے ہیں، جو اللہ کے دین کے داعی ہیں، جو انبیاء کے وارث ہیں، جو بھی اس مشن کے قریب ہوگا، اس پر آزمائشیں آئیں گی، ہرقل کا یہ تبصرہ ہمیشہ ہمارے سامنے ہونا چاہیے، وہ کافر تھا، لیکن اس کی تشخیص صحیح تھی اور تبصرہ درست کر گیا، یہ اللہ کی مقرر کردہ اشیاء پر صبر ہے، اس کو سیکھو اور اس منہج پر قائم ہو جاؤ۔

صبر علی أقدار الله:

صبر علی أقدار الله کیسے ہوتا ہے؟ وہ اس طرح ہوتا ہے کہ تکلیفوں کو جھیلو اور تکلیفوں پر اللہ کا شکوہ نہ کرو، تکلیف دینے والا اللہ ہے، یہ نہ ہو کہ ہر کس و ناکس

---

[1] سنن الترمذي: أبواب الزهد، باب ما جاء في الصبر على البلاء، رقم الحديث (٢٣٩٨) وقال الترمذي: "هذا حديث حسن صحيح"۔

کے سامنے بیٹھ جاؤ اور اپنی تکلیفوں کی فہرست کھول دو، مجھے فلاں مرض ہے، فلاں تکلیف ہے، فلاں درد ہے، آرام ہی نہیں آتا، شفا ہی نہیں ملتی، سوچو یہ شکوہ کس کا کر رہے ہو؟ صبر کرو، اس پر خاموشی اختیار کرو اور صبر علی أقدار اللّٰہ کا دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ تکلیفوں کے پہنچنے پر کسی خلاف شریعت امر کا ارتکاب نہ کرو۔

سفلی علوم کفر ہیں:

کوئی مستقل بیماری آجائے، لوگ کہتے ہیں کہ چلو فلاں جادوگر کے پاس چلتے ہیں اور سفلی علم والے کے پاس چلتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ کسی نے جادو کر دیا ہو، وہ جادو کی جادو سے کاٹ کر دے گا، یہ سارا معاملہ کفر ہے، چلو فلاں درگاہ پر چلو، وہاں جا کر دم کراؤ، وہاں جا کر تعویذ کرواؤ، پلیٹیں ساتھ لے جاؤ، پلیٹوں پر تعویذ لکھوا کر لاؤ، گھول گھول کر پیو اور پانی کی بوتلیں لے جاؤ اور پانی کی بوتلوں پر پھونکیں مروا کر لاؤ اور دم کروا کے لاؤ، یہ سارے امور غیر شرعی ہیں، ہاں کسی سے دم کروانا اور دم کروانے کے لیے جانا بھی اس کو شریعت نے بنظر استحسان نہیں دیکھا، تم خود کیوں نہیں دم کر سکتے؟

سورہ فاتحہ بہترین دم ہے:

رسول اللہ ﷺ نے سورۃ فاتحہ کو دم قرار دیا ہے،[1] اور یہ ایک بہترین دم ہے، اور یہ کس کو نہیں آتی؟ سورۃ فاتحہ سب کو آتی ہے، جو اخلاص اپنے مرض کی شفا کے متعلق تمہارے اندر ہے، وہ کسی دوسرے کے اندر نہیں، اور پھر خاص طور پر وہ شعبدہ باز اور وہ بہروپیے جن کی نگاہ تمہاری جیبوں پر ہوتی ہے، وہ تمہارے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ وہ تو دم کر کے، پھونکیں مار کے اور تمہارے نام کے استخارے کر کے اپنے پیسے کھرے کر لیں گے اور تمہیں گناہوں کی دلدل میں دھکیل دیں گے، جو اخلاص

---

[1] صحيح البخاري، برقم (٢١٥٦) صحيح مسلم، برقم (٢٢٠١)

تمہارے اندر موجود ہے، وہ ان کے اندر موجود نہیں، تو صبر علی أقدار اللّٰہ کا معنی یہ ہے کہ شریعت کے دامن کو تھامے رکھو۔

انجام کار انبیاء کو کامرانی ملتی ہے:

ہرقل کہتا ہے: یہ سخت ترین تکلیفیں نبیوں پر آتی ہیں، نبی جھنجھوڑے جاتے ہیں: "ثم تکون لھم العاقبة" پھر بالآخر اللہ رب العزت ان کے صبر کو دیکھ کر انجام کار ان کے حق میں کر دیتا ہے، ان کے لیے بہتری کے فیصلے فرما دیتا ہے، دنیا میں کامیابی کی صورت میں اور آخرت میں درجات علیٰ کی صورت میں!

صبر کا مقام:

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ایک شخص کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت میں بڑا اونچا مقام رکھا ہوتا ہے، لیکن اس کے عمل قاصر ہیں، اس کے عمل چھوٹے ہیں اور درجہ اونچا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو کسی تکلیف میں ڈال دیتا ہے، اس پر کوئی مرض اتار دیتا ہے اور اس کو صبر کی توفیق دے دیتا ہے، وہ اتنا صبر کرتا ہے، اتنا جھیلتا ہے، اتنا برداشت کرتا ہے کہ وہ اس درجہ علیٰ کے قابل بن جاتا ہے، اس مقام عالی کا مستحق بن جاتا ہے، جو اللہ نے اس کے لیے تیار کیا ہے۔

تمحیص:

تو یہ معاملہ دین اسلام کی فطرت ہے کہ اللہ تعالیٰ آزماتا ہے، اس میں ایک پہلو تمحیص اور تمیز کا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلام کی صفوں میں نکھار پیدا کرنا چاہتا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے جنگ احد میں صحابہ کو زخم دیئے، خود اپنے پیارے پیغمبر کو زخم دیئے، تو منافقین جنگ بدر کے نتیجے سے سمجھے ہوئے تھے کہ یہاں فتح ہی فتح ہے

اور کامیابی ہی کامیابی ہے، جنگ بدر میں یہ تین سو تیرہ تھے، کفار ایک ہزار تھے، یہ نہتے تھے، وہ مسلح تھے، اس کے باوجود یہ کامیاب ہوئے، ستر کافر قتل ہوئے، ستر قید ہوئے اور زخم تو سب کو لگے۔

اس کا معنی یہ ہے کہ یہاں فتح ہی فتح ہے، چنانچہ ساتھ مل جاؤ، غنیمتیں بھی ملیں گی، فتوحات بھی ملیں گی، لیکن جب جنگ احد میں معاملہ برعکس دیکھا کہ آج صحابہ شہید ہوگئے اور جنگ احد کی بنیادیں صحابہ کے پاکیزہ خون سے سرخ ہوگئیں، خود امام الانبیاء زخمی ہوکر نڈھال ہوکر گر گئے، تو منافقین نے کہا کہ نہیں بھئی یہاں بھی مار پڑ سکتی ہے، وہ کٹ گئے، علیحدہ ہوگئے اور اس سے تمحیص حاصل ہوگئی، تمیز حاصل ہوگئی، ابوبکر صدیق جیسے، عمر بن خطاب جیسے، بلال حبشی جیسے سچے اور کھرے لوگ ساتھ رہ گئے اور عبداللہ بن ابی ابن سلول جیسے جھوٹے اور منافق کٹ کے الگ ہوگئے، صفوں میں تمحیص آگئی اور تمیز آگئی اور یہ بھی ایک برکت ہے۔ ساتھی تھوڑے ہوں، سچے اور کھرے ہوں، وہ کامیابی کی نوید ہیں اور ساتھی لاکھوں ہو، نیتوں میں کھوٹ ہو اور عقیدے میں خلل ہو، زبانوں پر جھوٹ ہو، تو کثرت تعداد کا کوئی فائدہ نہیں۔

کثرت تعداد کا کوئی فائدہ نہیں:

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "إنما الناس كإبل مائة لا تكاد تجد منهم راحلة "[1] لوگوں کی کثرت کی مثال تو ان سو اونٹوں کی سی ہے، جن کو آپ خریدیں، پالیں پوسیں، کھلائیں اور پلائیں اور جب آپ کو سواری کی ضرورت ہو تو ان میں کوئی بھی سواری کے قابل نہ ہو، تو کیا فائدہ اس تعداد کا؟ تو آزمائشوں سے یہ بھی ایک مقصود ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمحیص چاہتا ہے، اسلام کی صفوں میں نکھار پیدا کرنا چاہتا ہے۔

[1] صحيح البخاري: كتاب الرقاق، باب رفع الأمانة، رقم الحديث (٦١٣٣) صحيح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب قوله صلى الله عليه وسلم: الناس كإبل مائة لا تجد فيها راحلة، رقم الحديث (٢٥٤٧) مسند أحمد (١٣٩/٢)

مخلص ساتھی:

اس لئے ایک موقع پر امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ میری یہ خواہش ہے کہ جس کمرے میں بیٹھا ہوں، یہ کمرہ عبیدہ بن الجراح جیسے لوگوں سے بھرا ہو، بس اتنے ہی ساتھی مجھے چاہئیں، اس کمرے میں جتنے ساتھی آسکتے ہیں، وہ آجائیں اور سارے کے سارے عقیدے کے اعتبار سے، امانت کے اعتبار سے، عمل کے اعتبار سے، خلق کے اعتبار سے ابو عبید بن جراح جیسے ہوں، مجھے کافی ہے، میں ان مٹھی بھر لوگوں سے پوری دنیا پر انقلاب لا سکتا ہوں، تو ایسے ساتھی کارآمد ہیں، جن میں صبر اور استقامت ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی استقامت:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ جیسے لوگ جنہوں نے ایک موقع پر تاتاری حاکم سے کہا تھا کہ تم ہمارے ساتھ کیا کر سکتے ہو؟ ہمیں قید کر سکتے ہو، جلا وطن کر سکتے ہو، زیادہ سے زیادہ آخری حربہ یہ کہ قتل کر سکتے ہو، جو چاہو کر لو، لیکن یاد رکھو ہماری قید خلوت ہے، جب قید کر دو گے، ہم قید ہو کر جیل کے گوشوں میں اپنے پروردگار سے راز و نیاز کریں گے، ہمیں کوئی تکلیف نہیں، ہماری قید خلوت ہے، ہماری جلا وطنی سیاحت ہے، ہمارا قتل شہادت فی سبیل اللہ ہے، [2] ہمارے لئے ہر سودا قابل قبول ہے، یہ ثقاہت ہو، یہ صداقت ہو، تو حقیقت یہ ہے کہ شروع میں تکلیفیں آتی ہیں، آزمائشیں آتی ہیں، اللہ جھنجھوڑتا ہے اور بالآخر انجام کار نصرت اور بہتریاں عطا فرما دیتا ہے۔

درسِ استقامت:

ہرقل کا یہ تبصرہ، میں نے کچھ تفصیل سے بات کر دی، تا کہ صبر علی أقدار

---

[2] لمحات من حياة شيخ الإسلام ابن تيمية (ص: ٣٢) محنة ابن تيمية (ص: ١٧)

اللہ کے معنی کو ہم سمجھیں اور اس کو اپنائیں، جو انبیاء کے دین کے وارث اور داعی ہوتے ہیں، اس منہج کے حامل ہوتے ہیں، وہ انبیاء کی طرح جھنجھوڑے بھی جائیں گے، فاقوں میں ان کو رہنا پڑے گا، تکلیفیں دی جائیں گی، گھسیٹیں جائیں گے، آزمائشیں آئیں گی، ان پر صبر کرنا چاہیے، اللہ پاک کا فرمان ہے:

﴿ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَ لَمَّا یَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلۡزِلُوۡا حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰهِ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِیۡبٌ ﴾ [البقرہ: ٢١٤]

تم کیا سمجھتے ہو جنت میں یونہی چلے جاؤ گے؟ نہیں اس وقت تک نہیں جب تک تمہارے اندر سابقہ لوگوں کی مثالیں نہ آ جائیں، تم یہ سمجھتے ہو، جس روش پر قائم ہو جنت میں پہنچ جاؤ گے؟

تم سوچو کہ تم نے جنت کے لیے ابھی کیا کیا ہے؟ جب تک سابقہ لوگوں کی مثالیں نہ آئیں، جن کو جھنجھوڑا گیا، فاقے برداشت کرنے پڑے، قتل اور زخم سے چور ہونا پڑا، جب تک وہ مثالیں نہ آئیں، اس وقت تک نہیں جا سکتے، تو اس کے لیے ہم صبر کی تربیت حاصل کریں، اس نقطے پر قائم ہوں، اپنے آپ کو تیار اور آمادہ کریں، صبر علی أقدار اللّٰہ پر شریعت کی روشنی میں اور شریعت کے امور کے تحت عمل کریں۔

ہرقل کا نواں سوال:

ہرقل کا سب سے اہم سوال یہ تھا: "ما ذا یأمر کم؟" ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا کہ یہ شخص جو نبی ہونے کا دعویدار ہے، وہ تمہیں کیا حکم دیتا ہے؟

نبی ہی حاکم ہوتا ہے:

اس کے اس سوال میں بڑی بصیرت ہے اور یہ سوال اس کے بڑے اچھے فہم کی

دلیل ہے، کیونکہ جو نبی ہوگا، حکم دینا اور امر کرنا اسی کا حق ہوگا، لامحالہ وہی حکم دے گا اور اسی کا حکم چلے گا، جو بھی نبی ہوتا ہے، وہ اپنی قوم کا آمر ہوتا ہے، مامور نہیں ہوتا، وہ حکم دینے والا ہوتا ہے، اس پر کسی کا حکم نہیں چلتا، وہ متبوع ہوتا ہے، تابع نہیں ہوتا، وہ مطاع ہوتا ہے، مطیع نہیں ہوتا، اس کا یہ سوال بڑا قابل فہم اور قابل غور ہے کہ وہ تمہیں کیا حکم دیتا ہے؟ کیونکہ لامحالہ نبی ہی حکم دیتا ہے، اللہ پاک نے بھی ارشاد فرمایا:

﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [النور: ٦٣]

کہ جو لوگ میرے نبی کے کسی ایک امر کی مخالفت کرتے ہیں، انہیں دنیا میں فتنے اور آخرت میں دردناک عذاب سے ڈرنا چاہیے۔

جس کا معنی یہ ہے کہ نبی حکم دیتا ہے اور نبی کا ہر حکم واجب الاطاعت اور واجب التعمیل ہوتا ہے، اگر کسی ایک امر کو چھوڑ دیا جائے، تو اللہ رب العزت اس کی دوہری سزا دے سکتا ہے، دنیا میں فتنوں سے دوچار کر دے اور صدمات مسلط کر دے، مختلف پریشانیوں اور بیماریوں میں مبتلا کر دے اور اس کے بعد جب قیامت قائم ہو، تو اپنے دردناک عذاب میں ڈال دے، اسی لئے تو فرمایا کہ تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ:

﴿ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ [الحشر:٧]

''جو چیز تم کو میرا پیغمبر دے، اسے لے لو اور جس چیز سے میرا پیغمبر روکے اس سے باز آجاؤ۔''

ابوسفیان کا جواب اور نبی علیہ السلام کی دعوت:

اب ابوسفیان نے اس سوال کا کیا جواب دیا؟ نبی کا حکم آپ جانتے ہیں،

جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا، تو فرمایا:

" أيها الناس! قولوا لا إله إلا الله تفلحوا" [1]

اے لوگو! لا إله إلا الله کہہ دو۔ یہ دعوت نبی ﷺ نے بار بار دی، ابوسفیان اور اس کی قوم اس دعوت سے کیا سمجھی؟ ابوسفیان وہی جواب دے رہا ہے کہ اس نبی کی دعوت اور اس کا امر کیا ہے؟ وہ کہتا ہے:

" يقول: اعبدوا الله وحده، ولا تشركوا به شيئاً، واتركوا ما يقول آباؤكم "

اس مشرک نے اس دعوت کو کیا سمجھا؟ وہ بتا رہا ہے کہ اس نبی کی دعوت یہ ہے کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرو، اتنا ہی سمجھا؟ نہیں، "ولا تشركوا به شيئا " اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اتنا ہی سمجھا؟ نہیں، "واتركوا ما يقول آباؤكم" اور تمہارے بزرگ اور تمہارے باپ داد، تمہاری قومیں، برادریاں، جو کچھ تم کو حکم دیتیں ہیں، سب کو چھوڑ دو۔

یہ اس نبی کی دعوت ہے، جس کا کلمہ " لا إله إلا الله " ہے، یہ ایک مشرک کا فہم ہے، ابوسفیان نے اس کلمے سے یہ معنی سمجھا کہ ایک اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، نہ کسی درگاہ کو، نہ کسی زندہ کو، نہ کسی مردہ کو، نہ کسی حجر کو، نہ کسی شجر کو، نہ کسی جن کو، نہ کسی فرشتے کو، نہ کسی نبی مرسل کو، کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اس طرح اس کے حکم کو قبول کر لو، اس طرح جڑ جاؤ، مان لو کہ "واتركوا ما يقول آباؤكم " اپنے آباء واجداد اور بزرگوں، قوموں اور برادریوں کی اطاعت کو بھی چھوڑ دو، صرف اسی کا سکہ چلے گا، اسی کا حکم چلے گا، یہ " لا إله إلا الله" کا فہم ابوسفیان کو حاصل ہوا۔

---

[1] مسند أحمد (٣/٤٩٢) وقال الألباني: " أحد إسنادي أحمد صحيح " (دفاع عن الحديث النبوي: ٢٢)

کلمہ کا معنی:

افسوس یہ ہے کہ ایک مسلمان جو یہ کلمہ پڑھتا ہے، اس کلمے کا اقرار اور اعتراف کرتا ہے، وہ اس معنی کو نہیں سمجھ سکا، حالانکہ یہ کلمہ ان تین چیزوں پر مشتمل ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، صرف ایک اللہ معبود برحق ہے، باقی سارے معبود باطل ہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، اس کا معنی یہ ہے کہ انہی کی اطاعت فرض ہے، اپنی برادری کی باتیں، اپنی قوموں کی باتیں، آباء و اجداد کی باتیں، بزرگوں کی باتیں یہ سب چھوڑ دو، یہ ہے دین کا فہم جو ابوسفیان کو حاصل ہوا، وہ اس کلمے کا معنی یہ سمجھا کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرنی ہے اور اس عبادت میں کسی کو شریک نہیں ٹھہرانا، سجدہ ہو، رکوع ہو، قیام ہو، قراءت ہو، نماز ہو، روزہ ہو، حج ہو، عمرہ ہو، جو چیز عبادت ہے، وہ اللہ کے لیے خاص ہے اور اس عبادت میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔

صرف ایک معبود؟

قومِ کفار کو یہی پریشانی تھی کہ ﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ﴾ [ص: ٥]

محمد ﷺ نے اتنے سارے معبودوں کو ایک ہی بنا دیا، یہ ہمارے مختلف معبود جو ہمارے مختلف کام آتے ہیں، یہ کیسی دعوت ہے کہ اتنے سارے کام جو اتنے معبود مل کر کرتے ہیں، اس نے سب کو ایک کر دیا کہ معبود ایک ہی ہے، یعنی اس کلمے کا فہم ان کو حاصل تھا، وہ قبول نہ کر سکے، آج کلمہ قبول کرنے والے بہت ہیں، لیکن فہم اور سمجھ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پتھر پر لکیر ہے:

﴿ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴾ [یوسف: ١٠٦]

کہ جو لوگ ایمان لائیں گے، کلمہ پڑھیں گے، آپ اگر ان کے عقیدوں کو ٹٹولیں اور چیک کریں گے، تو ان میں سے اکثر مشرک ہوں گے۔

وہ قبول تو کریں گے، لیکن ان کو اس دین اور توحید کا فہم وشعور حاصل نہیں ہوگا، تو پھر لامحالہ ان کا عقیدہ، ان کی توحید، ان کا ایمان سب مسترد ہے، قابل قبول نہیں۔

کلمے کے دو معانی:

مشرکین مکہ اس کلمے کو دونوں معانی کے ساتھ سمجھتے تھے، معنیٔ نفی اور معنیٔ اثبات، معنیٔ اثبات یہ ہے کہ صرف ایک اللہ معبود ہے، اس کی توحید ثابت اور قائم ہے اور معنیٔ نفی یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں، کوئی معبود نہیں، صرف ایک اللہ ہی معبود برحق ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کی بات جہاں بھی کی، ان دونوں معانی کے ساتھ نفیاً واثباتاً کی ہے، فرمایا:

﴿ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ﴾ [البقرہ: ٢٥٦]

جو طاغوت کا انکار کرے گا اور ایک اللہ پر ایمان لائے گا، نفی کیا ہے؟ ہر طاغوت کا انکار نفی ہے، جتنی سرکاریں لوگوں نے بنا رکھی ہیں، ان سب کا انکار اور سب کی نفی کرنا، ﴿ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ ﴾ ایک اللہ پر ایمان لے آئے اور اس کی توحید کو مان لے، ﴿ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ﴾ اس نے ایک مضبوط سہارے کو تھام لیا، ایسا مضبوط سہارا کہ جو کبھی ٹوٹے گا ہی نہیں، وہ بہت مضبوط پناہ میں آگیا اور ایک بڑے محفوظ قلعے میں آگیا، اسے کوئی نقصان نہیں دے سکتا، کیونکہ اللہ اس کے ساتھ ہے، اس کا منہج صحیح ہوگیا، اس کا عقیدہ صحیح ہوگیا، جب یہاں مکمل درستگی ہوگی، تو اللہ ساتھ ہے، پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کو نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔

کلمے کا فہم:

تو اس کلمے کا یہ فہم ابوسفیان کو حاصل تھا کہ " لا إله إلا الله محمد رسول



اللہ" اس کا معنی یہ ہے کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرو، کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور محمد ﷺ چونکہ اللہ کے نبی ہیں، تو ان کی اس طرح اطاعت کرو کہ یہ برادریوں کے بندھن، آباء واجداد کی پیروی نبی ﷺ کی اطاعت کے مقابلے میں یہ تمام چیزیں باطل ہیں۔

نبی علیہ السلام کی تعلیمات:

یہ اس کی دعوت اور اس کا امر ہے اور ساتھ ساتھ کچھ باتیں اور بھی ہیں: "ویأمرنا بالصلوۃ، والصدق، والصلة، والعفاف " وہ ہمیں نماز، سچ، صلہ اور عفاف کا حکم دیتا ہے، عفاف کا معنی پرہیزگاری ہے، یعنی ان چیزوں کو چھوڑ دینا، جن کو اللہ نے حرام کیا ہے، یہ چوری ہے، زنا ہے، ڈاکہ ہے، غیبت ہے، جھوٹ ہے، تمام محرمات سے بچنا یہ عفاف میں داخل ہے، یہ اس کی بنیادی تعلیم ہے، ایک روایت میں صدقے کا بھی ذکر ہے۔

تعلیم نبوی کے اثرات:

ابوسفیان نے اس تعلیم کو ذکر کر کے ہرقل کے دل میں نفرت پیدا کرنا چاہی کہ اگر اس کی اطاعت کرو گے، تو پھر یہ ہمارے معبود کہاں جائیں گے؟ تم بھی عیسیٰ علیہ السلام کے پجاری ہو، اس کی دعوت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کی نفی کرتی ہے اور اس کی دعوت یہ کہتی ہے کہ آبا و اجداد کی پیروی چھوڑ دو، باپ دادا کی پیروی چھوڑ دو، باپ دادا کے ہم بھی پیروکار ہیں اور تم بھی پیروکار ہو، اور اس کی دعوت یہ کہتی ہے کہ عفت اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کرو، پھر یہ ہماری محفلیں کہاں جائیں گی؟ یہ شراب نوشی اور پھر مختلف قینات [گلوکاراؤں] کے ناچ اور گانے یہ سب کچھ چھوڑنا پڑے گا، یعنی وہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی دعوت کو اس انداز سے ذکر کر رہا ہے، تاکہ ہرقل کے دل میں نفرت پیدا ہو جائے۔

ہرقل کا تبصرہ:

چونکہ ہرقل کے پاس فہم وبصیرت تھا اور اب تک وہ صحیح باتیں کرتا جا رہا ہے، لہٰذا اس نے سنا کہ محمد ﷺ کی یہ دعوت ہے، تو اس پر تبصرہ کیا:

"إن كان ما تقول حقا، فسيملك موضع قدميّ هاتين!"

اے ابوسفیان! اگر تم سچ کہہ رہے ہو کہ اس نبی کی یہی دعوت ہے، تو پھر میرا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ اس پورے ملک شام اور میرے تخت پر اسی کا قبضہ ہوگا!

دو کافروں کا فہم:

اب یہ دو کافروں کا فہم ہے، ایک کافر اللہ کے پیغمبر کی دعوت بیان کر رہا ہے، اس کی دعوت یہ ہے کہ ایک اللہ کو پوجو اور ہر شریک کی نفی اور انکار کرو، کیونکہ وہ طاغوت ہے، یہ برادریاں، یہ قومیں، یہ بزرگ ان سب کی پیروی چھوڑ دو، جب تک یہ بندھن برقرار رہے گا، تم کبھی حق تک پہنچ ہی نہیں سکتے، اِلا یہ کہ آباء واجداد کی تعلیم اللہ کے پیغمبر ﷺ کی تعلیم کے مطابق ہو، وہ انہی کی بات کریں اور انہی کی دعوت پیش کریں۔

جنگ موتہ:

حکیم بن حزام اور خالد بن ولید سے کسی نے پوچھا کہ تم نے اسلام قبول کرنے میں دیر کیوں لگائی؟ اتنے زیرک، سمجھدار اور ہوشیار ہو، بالخصوص خالد بن ولید جس معرکے میں شریک ہوجائیں، تو ان کی شرکت فتح کی ضمانت ہوتی، جنگ موتہ میں مسلمان صرف تین ہزار تھے اور مقابلے میں کافر ایک لاکھ تھے، جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے جب قافلہ روانہ کیا، تو زید بن حارثہ کو پرچم دیا، فرمایا کہ زید بن حارثہ اگر شہید ہوجائیں، تو پھر عبداللہ بن رواحہ تمہارے قائد ہوں گے، اگر وہ بھی شہید ہوگئے، تو

پھر جعفر طیار ہو نگے اور اگر وہ بھی شہید ہو گے، تو چوتھی قیادت آپ نے منتخب نہیں کی، چنانچہ یہ تینوں یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے، پھر پرچم خالد بن ولید نے سنبھال لیا، یہ خالد بن ولید کا اسلام میں پہلا معرکہ تھا، انہوں نے صرف ایک تبدیلی کی کہ اپنی فوج کی پوزیشن تبدیل کر دی، اس دور میں فوج کے چار حصے ہوتے تھے، ایک آگے کی صف اس کو ''مقدمہ'' بولتے تھے، ایک پیچھے کی صف اس کو ''موخرہ'' بولتے تھے، ایک بایاں بازو اور ایک دایاں بازو، دائیں بازو کو ''میمنہ'' اور بائیں بازو کو ''میسرہ'' بولتے تھے، خالد بن ولید نے مقدمہ کو موخرہ کر دیا اور موخرہ کو مقدمہ کر دیا، میمنہ کو میسرہ اور میسرہ کو میمنہ کر دیا، اب سامنے جو کفار تھے، وہ بھی اس پوزیشن میں تھے، انہوں نے چہرے بدلے ہوئے دیکھے، سمجھے کہ نئی طاقت آ گئی، ان کے آدھے حوصلے ٹوٹ گئے، آدھے وہیں شکست کھا گئے اور پھر جب لڑائی ہوئی اور خالد بن ولید آگے گئے، ان کا بیان ہے کہ جنگ موتہ کے دن میرے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹیں۔ [1]

حریتِ فکر کی برکت

کسی نے خالد بن ولید سے پوچھا کہ تم لوگوں نے اسلام اتنی دیر سے کیوں قبول کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ اصل معاملہ یہ ہے کہ پہلے ہماری سوچ کا محور ہمارے بزرگ تھے، ہم انہی کی سوچ سوچتے، انہی کی بات کرتے، جو وہ حکم دیتے، وہ قبول کرتے، بس پورا برادری کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، بزرگوں کے پیروکار، بزرگوں کے فرمانبردار، اس لئے اسلام کی حقانیت سوچنے کی ہمیں مہلت ہی نہیں ملی، لیکن جب ہمیں کچھ عقل آئی اور تھوڑی سی دعوت کی کرنیں ہم تک پہنچیں

---

[1] صحیح البخاري: کتاب الجنائز، باب الرجل ینعی إلی أهل المیت بنفسه، رقم الحدیث (١١٨٩)

اور ہم نے اپنے آپ کو برادری کے اس بندھن سے آزاد کرایا، آباء واجداد کی سوچ کو اپنے آپ سے دور کیا، تو حق نے ہمارے سینوں کو روشن کر دیا اور ہم نے فوراً اسلام قبول کرلیا۔

تاثیرِ قرآن:

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بھی یہی بات بیان کرتے ہیں کہ اس دعوت کو ہم نے توجہ سے سنا ہی نہیں، آباء و اجداد کے پیروکار تھے، حتی کہ جنگ بدر میں قیدی ہوگئے، مشکیں کسی ہوئی ہیں، اسی اثناء میں مغرب کا وقت ہوگیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو مغرب کی نماز پڑھا رہے تھے اور آپ نے سورۂ طور پڑھی، کہتے ہیں ہماری مشکیں کسی ہوئیں اور ہم براہ راست اللہ کے پیغمبر کا قرآن سن رہے تھے: " ذلك أول إيمان وقر في قلبي " یہ ہمارے دلوں میں ایمان کا پہلا جھونکا تھا اور ایمان کی بہار کی پہلی دستک تھی، ہم نے خود قرآن سنا اور پھر ہم نے فوراً اسلام قبول کرلیا۔ [1]

معاشرتی ملامت کا خوف:

میرے دوستو اور بھائیو! سچے دین کی پیروی میں برادریوں، قوموں اور آباء و اجداد کے بت سب سے بڑی رکاوٹ ہیں، سچا دین لوگ اس لیے قبول نہیں کرتے کہ برادری کیا کہے گی؟ قوم کیا کہے گی؟ ابو طالب یہی کہتا کہتا مر گیا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعوت پیش کر رہے ہیں، وہ قبول نہیں کر رہا، یہاں تک اس کو کہہ دیا کہ تم میرے کان میں کلمہ پڑھ لو اور کوئی نہیں سن رہا، صرف میں سنوں گا اور جب قیامت کا دن ہوگا، میں اس کلمے کو حجت بنا کر تمہیں بخشوانے کی کوشش کروں گا، کہتا ہے کہ نہیں:

---

[1] صحيح البخاري: كتاب التفسير، باب سورة والطور ، رقم الحديث (٤٥٧٣)
صحيح مسلم: كتاب الصلاة، باب القراءة في الصبح، رقم الحديث (٤٦٣)

" اخترت النار على العار، بل أنا على دين عبدالمطلب "

میں جہنم کی آگ برداشت کرلوں گا، لیکن قوم کے طعنے نہیں برداشت کرسکتا، میں تو عبدالمطلب کے دین پر جارہا ہوں، یہ نعرہ لگایا اور روح قبض ہوگئی۔

ابو طالب کا انجام:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" يا علي! إن أباك لفي ضحضاح من النار " ❶

تیرے باپ کو اللہ تعالیٰ نے جہنم کے ایک طبقے میں ڈال دیا ہے، جس کا نام "ضحضاح" ہے۔

غلبۂ اسلام کی اساس:

تو یہ ایک بت ہے، ابوسفیان نے کہا کہ یہ اس کی دعوت ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور آباء و اجداد کو چھوڑ دو، ان کی پیروی چھوڑ دو، پیروی صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے، ہرقل نے جواب دیا کہ اگر اس کی یہی دعوت ہے: " إن كان ما تقول حقا فسيملك موضع قدمي هاتين " تو میرے تخت پر محمد (ﷺ) کا قبضہ ہوگا، یہ دو کافروں کی سوچ اور فہم ہے اور آپ یقین سے یہ بات نوٹ کرلیں کہ ان کی سوچ میں ایک سوئی کی نوک کے برابر بھی غلطی نہیں، نبی ﷺ کی یہی دعوت ہے اور جب مسلمان اس دعوت کو اپنالیں گے، تو پوری دنیا پر چھا جائیں گے۔

ابوسفیان کا تجزیہ:

اس کے بعد ابوسفیان کو ہرقل کی مجلس سے نکال دیا گیا، انٹرویو پورا ہوگیا، تو

❷ صحيح البخاري: كتاب فضائل الصحابة، باب قصة أبي طالب، رقم الحديث (٣٦٧٢) صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب شفاعة النبي صلى الله عليه وسلم ←

کہا کہ تم چلے جاؤ، باہر نکل کر ابوسفیان نے اپنے ساتھیوں سے کیا کہا تھا؟ باہر نکل کر اس نے اپنے دوستوں سے کہا:

"لقد أمر أمر ابن أبي كبشة، يخاف منه ملك بني الأصفر"

ابن ابی کبشہ کا معاملہ چھا چکا ہے، ابن ابی کبشہ کون ہے؟ وہ پیارے پیغمبر کو حقارت سے "ابن ابی کبشہ" کہا کرتے تھے، ان کا نام نہیں لیتے تھے، نبی ﷺ اس پر بھی صبر کرتے اور بعض اوقات ان کی عقل پر تعجب کرتے۔

منصب رسالت کی خدائی حفاظت:

ایک موقع پر آپ نے فرمایا: اے عائشہ! "انظري كيف صرف الله عني سب قريش" دیکھو اللہ تعالیٰ نے قریش کی گالیوں کو مجھ سے کیسے پھیر دیا، وہ جب بھی میرا نام لیتے ہیں، میرا نام نہیں لیتے، محمد ﷺ نہیں کہتے، "مذمم" کہتے ہیں، کیونکہ محمد کا معنی ہے تعریف کیا گیا، اس کے مقابلے میں انہوں نے ایک لفظ اختراع کیا ہے: "مذمم" یعنی مذمت کیا ہوا، نفرت کیا ہوا، تو جب بھی وہ میرا ذکر کرتے ہیں اور طعنہ زنی کرتے ہیں "مذمم" کہہ کر میرا ذکر کرتے ہیں، "يسبون مذمماً" وہ صبح و شام مذمم کو گالیاں دیتے ہیں، "**وأنا محمد** ﷺ" حالانکہ میں مذمم نہیں بلکہ محمد ﷺ ہوں، دیکھو میرے پروردگار نے مجھے قریش کی گالیوں سے کیسے بچا لیا؟[1]

یہاں بھی وہ حقارت سے آپ کو ابن ابی کبشہ کہا کرتے تھے، کبشہ، یہ آپ کی مرضعہ جس نے آپ کو دودھ پلایا، مائی حلیمہ سعدیہ، اس کے آباء میں سے کسی کا نام تھا، نبی ﷺ کو وہ نسب قریش کی طرف منسوب نہ کرتے، بلکہ حقارت سے ان کو کبشہ کا بیٹا کہتے، فلاں عورت نے دودھ پلایا تھا، اس کے آباء و اجداد میں کبشہ تھا، محمد (ﷺ) اس کا بیٹا ہے۔

← لأبي طالب، رقم الحديث (٢١٠)

[1] مسند أحمد (٢/ ٣٤٠)

" لقد أمر أمر ابن أبي كبشه " ابوسفیان نے کہا کہ ابن ابی کبشہ تو یہاں بھی چھا چکا ہے، ہم نے دیکھا: " یخاف منه ملك بني الأصفر " دنیا کے سارے سونے کا مالک بادشاہ اور سلطنت روم کا فرماں رواں اس سے ڈر رہا تھا، ہم نے اس کی پیشانی پر پسینہ دیکھا، اس کا معنی ہے کہ ابن ابی کبشہ کا معاملہ یہاں چھا چکا اور غالب آ گیا ہے، یہ دوسرے کافر کا تبصرہ تھا، پہلے کافر نے کیا کہا کہ اگر یہی دعوت ہے، تو عنقریب اس تخت پر محمد (ﷺ) کا قبضہ ہوگا۔

غلبۂ دین کا منہج:

یہ بات آپ نوٹ کر لو اور دنیا والو سن لو! غلبے کا کلیہ اور اساس دعوت توحید ہے، ایک اللہ کی توحید، ہر قسم کے شرک سے بیزاری، ان بتوں سے، درختوں سے، حجر وشجر سے، ان درگاہوں سے مکمل بے زاری، یہ غلبے کا کلیہ اور کامیابی کی اساس ہے، اس دعوت کو صحیح معنی میں ایک کافر سمجھا، اس دعوت کے نتیجے کو صحیح معنی میں دوسرے کافر نے پہچان لیا، لیکن آج کے کلمہ گو لوگ نہ اس دعوت کو پہچانتے ہیں، نہ اس کے ثمرات کو پہچانتے ہیں!

اِقامت صلوۃ:

سچی توحید اور پھر نماز کی پابندی، نماز کوئی سرسری نہیں، "یقیمون الصلوۃ "، أقيموا الصلوة " نماز کو پڑھو نہیں، نماز کو قائم کرو، ﴿أقيموا﴾ کا اصل معنی ہے سیدھا کرنا، ''اقامت'' کا اصل معنی کسی چیز کو سیدھا کرنا، یہ لفظ کہاں استعمال ہوتا ہے: "إقامة العود " لکڑی کو سیدھا کرنا، جو لوگ تیر بناتے ہیں، وہ تیر بالکل سیدھا ہونا چاہیے، اگر سیدھا ہوگا، تو ہدف تک پہنچے گا، اگر وہ تیر کی لکڑی ٹیڑھی ہوگی، تو آپ کا نشانہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا، نشانہ خطا ہوگا، چنانچہ وہ لوگ جب تیر لینے آتے، تو اس

تیر کو چیک کرتے، لکڑی اگر سیدھی ہے، تو کہتے کہ " أقامت العود" لکڑی واقعی سیدھی ہے، تم نے واقعی سیدھی بنائی ہے۔

نماز کس طرح پڑھیں؟

اسی طرح نماز کو بالکل سیدھا کر کے ادا کرو، سیدھا کیسے ادا ہوگی؟ جب تکبیر تحریمہ سے لے کر بلکہ صف بندی سے لے کر سلام پھیرنے تک ایک ایک چیز مطابق ہو، کس کے؟ محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت کے اور آپ کے طریقے پر، آباء و اجداد کا طریقہ نہیں، یہ نہیں دیکھنا کہ باپ کیسے نماز پڑھتا ہے یا محلے کی مسجد کے مولوی نے بچپن میں میری گھٹی میں کونسی نماز ڈالی ہے؟ محمد ﷺ کے طریقۂ نماز کے مطابق نماز سیدھی ہے، ورنہ نماز ٹیڑھی ہے، لیکن کون اس کو سمجھے؟ اس کو سمجھنے والے بہت تھوڑے لوگ ہیں۔

نماز کیوں برباد ہوتی ہے؟

اس لئے پیارے پیغمبر ﷺ کا فرمان ہے: "لینقضن الإسلام عروۃ عروۃ"[1] اسلام ایک زنجیر ہے، جوں جوں وقت گزرے گا، ایک ایک کڑی ٹوٹتی جائے گی اور آخری زنجیر نماز کی ہے، نماز باقی رہے گی، مسجدیں بنیں گی، نمازیوں سے آباد ہوگی، لیکن اب " رب مصل لا خلاق له "[2] اکثر نمازی وہ ہوں گے، جن کا اللہ تعالیٰ ایک سجدہ بھی قبول نہیں کرے گا، ان کی نمازیں برباد ہوں گی، کیوں برباد ہوں گی؟ اس لئے کہ نمازوں میں روح نہ ہوگی، کیونکہ وہ نمازیں ایک روح سے خالی ہوں گی، وہ روح کیا ہے؟ وہ روح اللہ کے پیغمبر ﷺ کے طریقے کی مطابقت ہے، مرضی کی نمازیں ہیں، ماں باپ اس طرح پڑھتے ہیں، مولوی صاحب نے اس طرح پڑھا دی، پیرو مرشد کی یہی تعلیم ہے، بس یہ سارے ارکان اور سارے اعمال ہیں، اسی دائرے

❶ مسند أحمد (٢٣٢/٤) وصححه ابن حبان والحاكم۔

❷ صحيح الجامع، برقم (٢٥٧٥)

کے اندر محصور ہو کر رہ جائیں گے، اللہ کے پیغمبر ﷺ کی سنت اور آپ کے طریقے کا ادراک نہیں، تو ایسی نمازیں نہ قابل قبول ہیں اور نہ ہی یہ نمازیں کامیاب کرواسکتی ہیں، یا کامیابی دلواسکتی ہیں۔

دعوتِ نبوی کی بنیادی تعلیمات اور نتائج:

اس پیغمبر ﷺ کی دعوت نماز کی دعوت ہے اور صدق کی ہے کہ سچ بولو، عمل میں صداقت ہو، منہج میں صداقت ہو، عقیدے میں صداقت ہو، اللہ کی طرف انابت اور اللہ کے ساتھ تعلق میں صداقت ہو، گفتار میں صداقت ہو، گفتگو سچی ہو اور ساتھ ساتھ صلہ رحمی ہو، گناہوں سے اجتناب ہو، اس نے کہا کہ یہی دعوت ہے، تو اس پورے ملک شام پر اس نبی کا قبضہ ہوگا۔ ہرقل کتنا بڑا بادشاہ تھا اور اس کی سلطنت کتنی بڑی تھی؟ آج کے اس دور کے بادشاہوں میں مجھے کوئی مثال نہیں ملتی، نہ امریکہ کے فرمانروا کی، نہ روس کے، نہ چائنہ کے، نہ جاپان کے، کسی بادشاہ کی مجھے مثال نہیں ملتی، وہ اتنا بڑا بادشاہ تھا اور وہ کیا کہہ رہا ہے؟ اگر یہی دعوت ہے تو اس پورے ملک روم پر اس کا قبضہ ہوگا، وہ اس دعوت کو سمجھ گیا اور اس دعوت کے ثمرے، اس کے عاقبہ، اس کے نتیجے اور اس کے مآل کو سمجھ گیا کہ جس داعی کی یہ دعوت ہوگی اور وہ صبر و استقامت کے ساتھ اس دعوت پر قائم ہوگا، بالآخر ایک وقت آئے گا کہ وہ کامیاب ہو جائے گا، غالب آجائے گا اور چھا جائے گا۔

کتب سابقہ میں نبی علیہ السلام کی نبوت و رسالت کا بیان:

کہتا ہے کہ " كنت أعلم أنه خارج " مجھے اس بات پر یقین تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے، یقین کیسے تھا؟ اس لئے کہ اس نے کتابیں پڑھیں، تورات و انجیل میں اس نبئ آخر الزماں کی خبر ہے، اس کے زمانے کا ذکر ہے، " ما كنت أظن أنه

منکم" مجھے یقین تھا کہ وہ نبی آنے والا ہے، لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ نبی قوم قریش سے ہوگا، یہ معلوم نہیں تھا، نشانیاں ساری سچی ہیں، توارۃ وانجیل میں یہی لکھا ہوا ہے۔

ہرقل کا اشتیاقِ ملاقات:

آگے کیا کہتا ہے؟

"لو أني أعلم أني أخلص إليه لتجشمت لقاءه، ولو كنت عنده لغسلت عن قدميه"

اگر مجھے آج پتا چل جائے کہ میں محمد ﷺ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گا، تو اس کو ملنے کے لیے میں ساری تکلیفیں برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ میں باہر نکلوں گا، تو میری قوم ہی مجھ کو قتل کر دے گی، میں اس تک پہنچ ہی نہیں سکوں گا اور کاش پہنچ جاؤں اور پوری زندگی اس نبی کے پاس گزار دوں، اگر میں اس پیغمبر ﷺ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں اور مجھے اس پیغمبر کی صحبت نصیب ہو جائے، تو جب تک اس پیغمبر کے ساتھ رہوں گا، اس وقت تک میں اس پیغمبر کے پاؤں دھوتا رہوں گا، سلطنت روم کا فرماں رواں اس پیغمبر کے پاؤں دھوئے گا، یہ اس کا تبصرہ ہے، جبکہ ابو سفیان کیا کہہ رہا ہے؟" لقد أمر أمر ابن أبي كبشه" ابن ابی کبشہ تو یہاں بھی چھا گیا ہے، روم کا بادشاہ اس سے ڈر رہا تھا!

غلبے کے حقیقی اسباب:

اللہ اکبر! میرے دوستوں اور بھائیو! یہ کفار کا تبصرہ ہے، یہ فہم ایک کافر نے پیش کیا، ایک مشرک نے پیش کیا اور یہی فہم اور یہی توحید یہی دین کی دعوت ہے، اس کا ثمرہ کیا ہے؟ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ اگر اس دعوت پر قائم رہو گے، اس کو قبول کر کے اس پر اٹل رہو گے، کامیابیاں، غلبہ اور نصرت اللہ تعالیٰ آپ کو عطا فرمائے گا، کیوں؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟ یہ ایک مستقل موضوع ہے کہ غلبے کی اساس تو اسلحہ ہے، دنیا

کی طاقتیں ہیں، تعداد ہے، ظاہری قوت ہے، اس قوت کا ذکر ہی نہیں، تعداد کا ذکر ہی نہیں، اسلحہ کیا ہو؟ اس پر بحث ہی نہیں، صرف اس دعوت کی اساس پر یہ بات کہی گئی، اگر یہی دعوت ہے تو پورے ملک روم پر وہ قبضہ کر لے گا، اس کا غلبہ ہو جائے گا، اس کو کامیابی مل جائے گی، آخر اس کی وجوہات کیا ہیں؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟ اس کی علتیں کیا ہیں؟ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ تعداد ہونی چاہیے اور خوب تیاری ہونی چاہیے، اسلحہ کی بہتات ہونی چاہیے اور خوب وسائل سے مالا مال ہونا چاہیے اور خوب مال جمع کرو، چندے بٹورو، تاکہ یہ طاقت ہو، جب کہ یہاں ان چیزوں کا ذکر ہی نہیں، مال ہو یا نہ ہو، اسلحہ ہو یا نہ ہو، طاقت ہو یا نہ ہو، ظاہری وسائل ہوں یا نہ ہوں، ہاں ان امور پر تربیت مکمل ہو، صدق ہو، سچائی ہو، کوئی جھوٹ نہ ہو، کوئی غدر نہ ہو، کوئی خیانت نہ ہو، نمازوں کی اقامت ہو، توحید مکمل ہو، اہل توحید سے محبت ہو، اہل توحید سے میل جول ہو۔

یہ نہیں کہ کام تو دعوت کا ہے اور کام تو دین کا ہے اور ان کے ساتھ بھی بیٹھنا گوارا ہے جو قبر پرست اور قبروں کے طواف کرنے والے ہیں، جو اللہ کے پیغمبر کی بیویوں اور اللہ کے پیغمبر کے صحابہ کو گالیاں دیتے ہیں، ان کے سامنے بیٹھتے ہیں، جن کا کلمہ اور، جن کی آذانیں اور، جن کی نمازیں اور، جن کا قبلہ اور، جن کی زکاتیں اور، جن کا عقیدہ اور، جن کا منہج اور، ان کو بھی ساتھ بٹھاؤ، ان کی بھی تکریم کرو اور ان کو بھی اعزاز دو، یہ کونسی دعوت ہے؟ آخر کفار کس اساس پر یہ بات کرتے ہیں؟ اس پیغمبر کی اگر یہی دعوت ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، آباء و اجداد اور برادری کے بندھنوں کو توڑ دو اور صدق، نماز، عفاف، تقویٰ، صلہ رحمی اور مکارم خیر ان پر پوری طرح کمر بستہ ہو جاؤ، تو پھر غلبہ ہے، نصرت ہے، کامیابی ہے، اس کے اسباب کیا ہیں؟ یہ ایک بڑی اہم بات اور بڑا اہم نکتہ ہے۔

کامیابی کی بنیاد:

عالم کفر ہر قسم کے وسائل سے مالا مال ہو، اس کے پاس ہر قسم کی طاقت ہو، اسلحہ ہو، تعداد ہو، تیاری ہو اور اس کے مقابلہ میں مسلمان کمزور ہوں، نہتے ہوں، بھوکے ہوں، تعداد میں تھوڑے ہوں، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام غالب آ جائے؟ کفار مغلوب اور شکست خوردہ ہو جائیں؟ اس کے لیے یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ فتح، غلبہ اور کامیابی، زمین کی تمکین اور سطوت یہ انسانوں کے ہاتھ میں نہیں دی گئی، یہ صرف اور صرف پروردگار کے ہاتھ میں ہے، اگر مسلمان غالب آتے ہیں، تو محض اللہ کی توفیق سے، اور اگر کسی معرکے میں کفار کو غلبہ حاصل ہوتا ہے یا وہ کامیاب ہوتے ہیں اور مسلمان کو نقصان پہنچاتے ہیں، تو یہ بھی صرف اللہ کے امر سے ہے، تب ہی تو ابوسفیان نے کہا تھا: " الحرب بيننا سجال" اب تک ہماری جو جنگیں ہوئی ہیں، ان کا نتیجہ کنویں کے ڈول کی مانند ہے کہ وہ ڈول کبھی کسی کے ہاتھ میں اور کبھی کسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے، کبھی وہ فتح یاب ہوتے ہیں جیسے جنگ بدر، اور کبھی ہمیں غلبہ حاصل ہوا، ان کو نقصان ہوا جیسے جنگ احد، یہ کامرانی خواہ مسلمانوں کو ملے، یہ اللہ کی توفیق سے ملتی ہے اور خواہ کفار کو ملے، انہیں بھی اللہ کے امر سے ملتی ہے، ایسا کیوں ہے؟

﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ﴾ [المجادلة: ٢١]

"اللہ تعالیٰ نے یہ بات لکھ رکھی ہے کہ غلبہ میرے اور میرے رسولوں کے لیے ہے۔"

دعوت اور غلبۂ دین کا منہج کیا ہے؟

دوسری بات یہ ذہن نشین کر لیں کہ یہ سب اللہ کی توفیق اور اللہ کے امر سے حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ [المائدۃ: ٣]

کہ آج میں نے دین کو مکمل کر دیا ہے، دین کی تکمیل کا معنی بہت کم لوگ سمجھ پائے ہیں، دین کی تکمیل یہ ہے کہ جو دین کے احکام ہیں، فرائض ہیں، واجبات ہیں، مستحبات ہیں، اللہ کے اوامر ہیں، نواہی ہیں، یہ سب اللہ نے بیان کر دیئے ہیں، یہ دین کو پھیلانے اور دین کے غلبے کا ایک اہم نقطہ ہے، یہ بھی اللہ پاک نے بتا دیا اور سمجھا دیا ہے کہ جس طرح یہ ضروری ہے کہ ہم یہ دین کتاب وسنت سے لیں، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ دعوتِ دین اور غلبۂ دین کا طریقہ اور اسلوب بھی کتاب وسنت سے لیں۔

احکام ہم دین کے لیں اور غلبۂ دین کا معاملہ ہم اپنے ہاتھ میں رکھ لیں، اس کے لیے ہم اپنی تدبیر کریں، اپنی مرضی کی کوشش کریں اور اپنی من مانی کریں۔ یہ کامیابی کا راستہ نہیں، جس طرح یہ دین آسمان سے اترا، اسی طرح تنفیذ دین اور غلبۂ دین کا طریقہ بھی آسمان سے اترا ہے، اس کی پابندی ضروری ہے اور تیسری بات یہ جان لو کہ یہ بھی ایک بھول ہے اور بہت بڑی بھول ہے کہ ہم بندوں کی طاقت اور قدرت پر اللہ تعالیٰ کی طاقت کو قیاس کریں اور نا امید ہو جائیں، ہم تنقیدیں شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ بندوں کے پاس تو قدرت ہے ہی نہیں، تمام تر طاقت اور قدرت کا مالک اللہ رب العزت ہے، ایک چیز ہماری طاقت سے بعید ہو اور ہماری قدرت سے ناممکن ہو، تو کیا اللہ تعالیٰ کے لیے بھی ناممکن ہے؟ ہم کسی کام کی کامیابی کے لیے ظاہری وسائل کے محتاج ہیں، کیا اللہ تعالیٰ بھی محتاج ہے؟ ہمیں غلبہ حاصل کرنے کے لیے تعداد چاہیے، اللہ تعالیٰ کو بھی کوئی تعداد چاہیے؟ یہ ایک ایسا نقطہ ہے جس پر بہت سے لوگ بھول کا شکار ہو جاتے ہیں، جب کہ اصل سمجھنے والی بات یہ ہے کہ یہ سارا

معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

"من کان للّٰه کان اللّٰه له" جو اللہ کا بن جائے گا، اللہ اس کا بن جائے گا۔

اللہ تعالیٰ ظاہری وسائل کا محتاج نہیں:

تو اللہ رب العزت کو تمہارے ان ظاہری وسائل کا کوئی احتیاج نہیں، اس کا فرمان ہے:

﴿ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ﴾ [الأنفال:٦٠]

"دشمن کے مقابلے میں تم جو قوت تیار کر سکتے ہو، کرو۔"

جو تمہارے بس میں ہے، اس سے زیادہ کے تم مکلّف نہیں ہو، جو تمہاری طاقت اور تمہارے بس میں ہے، وہ تیاری کر لو، اس میں اگر کمی ہوگی، وہ کمی تمہاری کمزوری نہیں ہے، جو کر سکتے ہو کر لو، ہاں یہ فرمایا کہ ﴿ اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ [البقرہ:٢٠٨] اس دین میں پورے آجاؤ، یہ دین کا رنگ ہے، دین کے اوامر میں پورے آجاؤ، اس میں کوئی کوتاہی نہ ہو، یہ کمی شمار ہوگی، وہ کمی شمار نہیں ہوگی، دشمن کے مقابلے میں جو تیاری ہے، اس میں اگر کمی رہ جائے، وہ شمار نہیں ہوگی، وہ کمی تو ہے ہی نہیں۔

ہاں اگر یہاں کمی رہ گئی، یہ شمار ہوگی، جس کی تم کو سزا مل سکتی ہے، دین اسلام میں دو جنگیں ہیں، ایک جنگ احد اور دوسری جنگ حنین، دونوں میں کمی واقع ہوگئی، جنگ احد میں نبی ﷺ کی نافرمانی ہوگئی، اطاعت امیر سے پہلو تہی ہوگئی اور جنگ حنین میں سب کچھ تھا، لیکن ایک گھمنڈ آ گیا کہ ہمیشہ دشمن کے مقابلے میں ہم تھوڑے ہوتے ہیں، دشمن زیادہ ہوتا ہے پھر بھی ہم فتح یاب ہوتے ہیں، آج تو ہم بہت زیادہ ہیں، آج تو ہماری تعداد زیادہ ہے، فرمایا:

﴿وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ﴾ [التوبة: ٢٥]

اور حنین کے دن کو یاد کرو، جب تمہیں اپنی کثرت پر گھمنڈ ہوگیا، تم اپنی کثرتِ تعداد کے دھوکے میں آ گئے۔

جب تعداد کم ہوتی تھی، تو تمہارا توکل اللہ پر ہوتا تھا اور اللہ رب العزت اپنی فتح اور نصرت کے خزانے عطا فرماتا تھا، آج تعداد زیادہ ہوگئی اور تم تعداد کے گھمنڈ میں آ گئے، تمہاری یہ تعداد تمہاری کوئی کفایت نہ کر سکی، بلکہ کفایت تو دور کی بات ہے:

﴿ وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ﴾ [التوبة: ٢٥] یہ زمین کا دامن اپنی کشادگی کے باوجود تم پر تنگ ہوگیا۔

یہ ذرا سی کوتاہی ہوگئی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، یہاں پر تم کو پورا حق ہے، لیکن نہ عقیدے میں کوئی جھول ہو اور نہ اتباعِ سنت میں کوئی جھول ہو، نہ منہج میں کوئی جھول ہو، اس دین کو مکمل اپنا لو، غلبہ اور کامیابیاں تمہارے لیے ہیں، تو اللہ رب العزت کامیابیاں دینے والا ہے، جو ظاہری وسائل اور تعداد کا محتاج نہیں۔

خدائی افواج:

جب وقت آتا ہے اور اللہ چاہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ جس جس چیز کو چاہے اپنی فوج بنا لے، نوح علیہ السلام پر وقت آیا، اتنی بڑی قوم کے مقابلے میں پانی کا ایک ایک قطرہ اللہ کا سپاہی بن گیا اور مل کر ایک طوفان بن گیا اور پوری قوم کو غرق کر دیا، تمہاری رہنمائی کے لیے انبیاء کی دعوت موجود ہے اور ان کے انجام موجود ہیں، حتی کہ ان کی پوری داستانیں موجود ہیں:

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۞ اَلْحَآقَّةُ ۞ مَا الْحَآقَّةُ ۞ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۞ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ﴾ [الحاقة: ١-٤]

امم سابقہ کی داستانِ ہلاکت:

دو قوموں کی داستانیں ہیں:

ا۔ ﴿ فَأَمَّا ثَمُودُ فَأُهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ ۝ وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ﴾ [الحاقة: ٥،٦]

فرمایا کہ قوم ثمود اتنی بڑی طاقت تھی، ہم نے اپنی افواج میں سے ایک ہی فوج ایک ہی کڑک کو مسلط کر کے پوری قوم کو تباہ و برباد کر دیا، ایک ہی جھٹکے میں اتنی بڑی قوم بربادی کا شکار ہوگئی، جب وقت آ گیا، تو یہ کڑک اور چیخ اللہ کے سپاہی بن گئے اور عالم کفر پر یلغار بن گئے۔

۲۔ ﴿ وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ﴾ اور قوم عاد کو ہم نے کچھ جھٹکے دیئے اور ایک آندھی مسلط کر دی، جس نے ان کو بار بار پٹخا، تہہ و بالا کیا اور سات آٹھ دن راتیں یہ آندھی طاری رہی اور پھر اس قوم کے بڑے بڑے جسم کھجوروں کے تنوں کی مانند میدان میں بکھرے ہوئے تھے، یہ آندھی اللہ کی فوج ہے۔

۳۔ جنگ احزاب میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"نصرت بالصبا، وأهلكت عاد بالدبور" [1] اللہ نے میری مدد کی صبا کے ساتھ اور عاد کو ہلاک کیا دبور کے ساتھ۔

"صبا" ایک ہوا تھی، مشرق سے مغرب کی سمت چلی اور اس نے قومِ کفار کے خیموں کو اکھاڑ دیا، ان کے ایک ایک سپاہی کی آنکھیں مٹی سے بھر گئیں، یہ چھوٹے چھوٹے ذرے اللہ کے سپاہی بن گئے اور قوم عاد کو "دبور" سے ہلاک کیا، وہ ہوا مغرب سے مشرق کی سمت اٹھی اور اس قوم کو تہس نہس کر دیا، اللہ رب العزت کسی وسیلے اور کسی سہارے کا محتاج نہیں، فرمایا: ﴿ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ﴾ [المدثر: ٣١]

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الاستسقاء، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: نصرت بالصبا، رقم الحديث (٩٨٨) صحيح مسلم: كتاب صلاة الاستسقاء، باب في ريح الصبا والدبور، رقم الحديث (٩٠٠)

تیرے پروردگار کی فوجیں کیا کیا ہیں؟ وہ اللہ ہی جانتا ہے۔

۴۔ ابرہہ کی طاقت کو مسمار کرنے والا کون ہے؟ ان ہاتھیوں کا کوئی توڑ تھا؟ وہ ہاتھی لے کر اللہ کے گھر کو تہس نہس کرنے پہنچ گیا، ابرہہ کی طاقت مشہور تھی اور جو کچھ ہوا، پوری دنیا انگشت بدنداں رہ گئی، اللہ نے کمزور سے پرندوں کا انتظام کیا، ہر پرندے کی چونچ میں چھوٹا سا کنکر تھا، اوپر سے وہ کنکر برساتے اور وہ ہاتھی کو لگتا اور ہاتھی بلبلا کر تڑپ کر بری طرح ہلاک ہوجاتا، یہ چھوٹے چھوٹے پرندے اللہ کی فوج ہیں، یہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں اللہ کی فوج ہیں، اللہ تعالیٰ ان کنکریوں میں ایٹمی تاثیر پیدا کرنے پر قادر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور طاقت ہماری طاقت جیسی نہیں:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ: ١١] ''اس جیسی کوئی چیز نہیں۔''

۵۔ غارِ ثور میں کائنات کی اعلیٰ ترین شخصیت یعنی محمد رسول اللہ ﷺ اور انبیاء کے بعد پوری کائنات میں سب سے افضل انسان ابوبکر صدیق موجود ہیں، ابوجہل اپنے کھوجیوں کے ساتھ تعاقب کرتے کرتے اس غار کے دھانے پر پہنچ گیا، ابوبکر صدیق فرماتے ہیں کہ جہاں ان کے پاؤں تھے، اگر وہ وہاں سے جھانک کر دیکھ لیتے، تو ہمیں پا لیتے۔[1] دو دھاری تلواریں ان کے ساتھ تھیں، جن کو انہوں نے ایک عرصہ زہر آلود کیا اور ان کو خوب زہر سے سیراب کیا ہوا تھا، ان کے ساتھ وہ وہاں پہنچ چکے تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی حفاظت کے لیے کس فوجی کا انتظام کیا؟ ایک مکڑی کا!

﴿اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ﴾ [العنکبوت: ٤١] دنیا میں سب

---

[1] صحيح البخاري: كتاب فضائل الصحابة، باب مناقب المهاجرين وفضائلهم، رقم الحديث (٣٤٥٣) صحيح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل أبي بكر الصديق رضي الله عنه، رقم الحديث (٢٣٨١)

سے کمزور گھر مکڑی کا جالا ہے، مکڑی ہزار جالے بنالے، آدمی ایک انگلی سے مسمار کر سکتا ہے، سب سے کمزور مگر اللہ تعالیٰ نے مکڑی کو حکم دیا کہ اس غار کے دھانے پر جالا بُن دو، اس نے بُن دیا، ابوجہل وہاں پہنچا، اب کھوجیوں کا اصرار ہے کہ یہ قدم اندر گئے ہیں اور ہماری زندگی بھر کے تجربے کا نچوڑ یہ کہتا ہے کہ یہ قدم اندر گئے ہیں، ابو جہل کہتا ہے کہ تمہاری مت ماری گئی ہے، تم احمق ہو، تمہیں جالا دکھائی نہیں دے رہا؟ "إنه أعتق من ميلاد محمد ﷺ" جالا دیکھو! لگتا ہے کہ یہ محمد ﷺ کی پیدائش سے پہلے کا ہے!

کائنات کے دو اعلیٰ ترین انسان تھے، اللہ نے ان کی کمزور ترین گھر کے ذریعے حفاظت کی، تو اللہ رب العزت تمہارے ان ظاہری وسائل کا محتاج نہیں۔

٦۔ جنگ خندق کا سبق ہمارے سامنے موجود ہے، صحیح بخاری میں جنگ خندق کے واقعات موجود ہیں، صرف ایک واقعہ یعنی خندق کھودنا، جنگ خندق بظاہر ہماری کمزوری کی پہچان ہے، کیونکہ جب کفار نے جنگ احد میں زخم لگا دیئے، تو انھوں نے سوچا کہ مسلمانوں کو ہم نے بہت مارا ہے، اب آخری اور بھرپور وار کریں گے، اپنوں نے بڑے بڑے لالچ دے کر کفار کے تمام قبیلوں کو مسلمان کے خلاف جنگ پر آمادہ کرلیا، بنوغطفان کو خیبر کی آدھی پیداوار دے دی کہ تم یہ سب لے لو، اپنی فوجیں بھیج دو، مدینے پر ایک ہی یلغار کریں اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں، چاروں طرف سے محاصرہ ہوا اور کفار کا گھیرا تنگ ہوگیا۔

اللہ کے نبی ﷺ فکر اور تشویش میں مبتلا ہیں، اس جتھے کا مقابلہ کیسے کریں؟ سلمان فارسی نے کہا: "كنا إذا حوصرنا خندقنا عليه"[1] ہمارے ملک فارس میں

[1] تاریخ الطبري (٢/٩١) نیز دیکھیں: فتح الباري (٧/٣٩٣)

نظام تھا کہ اگر ہم دشمن کے نرغے میں گھر جاتے، تو اپنی حفاظت اور اپنے شہر کو بچانے کے لیے چاروں طرف خندق کھودا کرتے تھے، تاکہ دشمن خندق کو عبور کر کے ہم تک نہ پہنچ پائے اور ہم محفوظ ہو جائیں۔

چنانچہ نبی ﷺ نے خندق کھودنے کا حکم دیا، اب صحابہ خندق کھود رہے ہیں، یہ خندق کھودنا ایک کمزوری کی علامت ہے، اپنی کمزوری اور عجز کا اعتراف ہے، اتنی بڑی طاقت کا مقابلہ کیسے ہو؟ جنگی تدبیر کرنی چاہیے، آخر تک جو تدبیر آپ کر سکتے ہیں کریں، لیکن اللہ پر توکل ہو، پھر معاملہ اللہ کے سپرد کردو، دین داری مکمل ہو، دین پر عمل مکمل ہو، کوئی جھول نہ ہو، پھر معاملہ اللہ کے سپرد کر دو، چنانچہ یہ تدبیر اختیار کرتے رہے، اپنے شہر کو بچانے کے لیے خندق کھودی جا رہی ہے، ظاہر ہے کمزوری ہے، اسی اثنا میں ایک چٹان آ گئی، صحابہ وار پر وار کر رہے ہیں، وہ چٹان اپنی جگہ سے ہل نہیں رہی، کسی نے کہا چھوڑ دو، کہا چھوڑیں کیسے؟ ایک کمزور نقطہ باقی رہے گا، کفار یہاں سے اندر آ سکیں گے، جب یہ معاملہ نبی ﷺ تک پہنچا، فرمایا چلو میں چلتا ہوں اور دیکھتا ہوں، آپ نے کدال ہاتھ میں لی اور تین ضربوں میں اس چٹان کو پاش پاش کر دیا، پہلی ضرب لگائی، تو چٹان ایک تہائی ٹوٹ گئی، دوسری لگائی، دو تہائی ٹوٹ گئی، تیسری لگائی حدیث میں ہے: "عاد كثيباً أهيل أو أهيم" وہ چٹان اپنی جگہ پڑے پڑے ریت کا پہاڑ گئی۔

نبی علیہ السلام کی تین پیش گوئیاں:

ان تین ضربوں پر رسول اللہ نے تین مختلف جملے ارشاد فرمائے:

ا۔ پہلی ضرب لگائی تو فرمایا:

"الله أكبر أعطيت مفاتيح الشام، إني أبصرت قصورهم حمر"

اللہ اکبر! مجھے شام کی چابیاں دے دی گئی ہیں۔ میں نے اس جگہ کھڑے کھڑے ملک شام کے سرخ محلات کو دیکھ لیا، یعنی شام فتح ہوگیا۔

۲۔ دوسری ضرب پر فرمایا: " الله أكبر أعطيت مفاتيح فارس، إني أبصرت قصرهم الأبيض " مجھے سلطنت ایران کی چابیاں دے دی گئیں، میں نے یہاں کھڑے کھڑے سلطنت فارس کا وائٹ ہاؤس دیکھا ہے۔

۳۔ تیسری ضرب پر فرمایا: أعطيت مفاتيح اليمن، إني أبصرت أبواب صنعاء " مجھے یمن کی چابیاں دے دی گئی، میں نے یمن کے دارالخلافہ صنعاء کا دروازہ دیکھا، یمن بھی فتح ہوگیا، فارس بھی اور سلطنت روم اور شام سب فتح ہوگئے۔

نصرتِ خداوندی پر بھروسہ:

جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کدال اوپر کر کے وار کیا:

"رأيت بطنه معصوبا بحجر " تو اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پیٹ سے کپڑا اٹھ گیا اور ہم نے اس پر پتھر بندھا ہوا دیکھا۔ فرماتے ہیں کہ تین دن سے کسی کو کھانا نہیں ملا تھا، کھانا تو دور کی بات ہے، کوئی چیز چکھی تک نہیں تھی، تین دن کی بھوک اور پیٹ پر پتھر بندھا ہوا، مدینے کو بچانے کے لیے خندق کھودی جا رہی ہے اور سلطنت شام، سلطنت فارس اور ملک یمن کی فتح کی باتیں ہو رہی ہیں۔

اہل خندق کی دعوت:

جابر رضی اللہ عنہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سن رہے تھے، تو بڑے پریشان ہوئے، اللہ کے نبی سے عرض کیا: ائذن لي إلى البيت" یا رسول اللہ! مجھے گھر جانے کی اجازت دیں، گھر چلے گئے، اپنی بیوی سے کہا: "هل عندك شيء ؟" کچھ کھانے کے لیے ہے؟" رأيت في النبي ما صبرنا عليه" میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ

کی بات سنی، صبر نہ کر سکا، بھوک کی بناء پر آپ سے بات نہیں ہو رہی تھی، آپ نے سلطنت فارس اور یمن کی فتح کی جو بات کہی، بھوک اور کمزوری کی بنا پر جملے صحیح ادا نہیں ہو رہے تھے، کچھ کھانے کے لیے ہے تو تیار کرو، کم از کم پیغمبر علیہ السلام کو کھلا دو، بیوی نے کہا ایک چھوٹی بکری گھر میں ہے، تھوڑا سا آٹا بھی ہے، دیکھو بناتی ہوں، تم پیغمبر علیہ السلام کو لے کر آجاؤ، جابر رضی اللہ عنہ نے جا کر کان میں اطلاع دی: "طعیم یا رسول الله!" اللہ کے رسول! تھوڑا سا کھانا ہے، آپ تشریف لائیں، پوچھا: کھانا ہے؟ فرمایا کہ اے اہل خندق آؤ، جابر کے گھر میں دعوت ہے!

جابر پریشان ہوئے، گھر دوڑے، "فضحتني" ہم تو ذلیل و رسوا ہوگئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو تمام اہل خندق کو لے کر آگئے، بیوی سمجھدار تھی، کہا تم نے اللہ کے رسول کو بتایا تھا کھانا کتنا ہے؟ کہا کہ ہاں بتایا تھا، کہا کہ پھر اللہ کے نبی جانے اور ان کا پروردگار! اب یہ معاملہ ہمارے ہاتھ میں نہیں، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جابر جب کھانا بن جائے، تو ہنڈیا کو ڈھک کے رکھنا اور روٹی تندور سے نکلے تو اسے توڑنا نہیں، میں خود ہی آ کر جو کرنا ہوا کروں گا۔

غزوۂ خندق میں ایک معجزہ:

اب کھانا بن گیا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہنچ گئے، تمام اہل خندق پہنچ گئے، انصار و مہاجرین پہنچ گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روٹیوں کا ٹکرا دست مبارک سے توڑتے، اس پر گوشت رکھتے اور صحابہ کو باری باری دیتے جاتے، تمام اہل خندق اللہ کے رزق سے سیراب ہوگئے، ان کے پیٹ بھر گئے، کھانا باقی بچ گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بابرکت کھانا ہے، تم بھی کھاؤ، اپنے پڑوسیوں میں تقسیم کرو، اللہ کی مخلوق کو کھلاؤ۔ [1]

---

[1] صحيح البخاري: كتاب المغازي، باب غزوة الخندق، وهي الأحزاب، رقم الحديث (٣٨٧٥)

صحابہؑ کرام کا ایقان و استقامت:

لیکن باتیں کیا ہو رہی ہیں؟ اتنی بڑی سلطنتوں کی فتح کی اور کسی صحابی نے اعتراض اور سوال نہیں کیا کہ یہ پیغمبر علیہ السلام کی کیسی خبر ہے؟ یہ حق ہے، ہمارا اس پر ایمان ہے، جیسے آج کل شکوے کرتے ہیں کہ پیٹ پر تو پتھر بندھا ہوا ہے اور باتیں فتح کی ہو رہی ہیں! یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ کیا دیوانوں کی بات ہے؟ لیکن نہیں یہ پروردگار کی باتیں ہیں، ہم اپنی طاقت کو اللہ کی طاقت پر قیاس کرتے ہیں اور اللہ کی طاقت کو اپنی طاقت پر قیاس کرتے ہیں، اللہ کی قدرت کو نہیں جانتے، اللہ رب العزت ان ظاہری وسائل کا محتاج نہیں، ہاں شرط یہ ہے کہ ہم ایمان میں کامل ہوں، عقیدے میں جھول نہ ہو، اخلاص اور ریا کاری نہ ہو، مکمل اخلاص ہو۔

ایک مخلص مجاہد:

مسلمہ بن مروان بنو امیہ کے حاکموں میں سے ہے، اس نے ایک قلعہ کا محاصرہ کیا ہے، لیکن قلعہ فتح نہیں ہو رہا، اندر سے تیر اندازی ہو رہی ہے، مسلمان زخمی ہو رہے ہیں، ایک دیوار میں چھوٹا سا شگاف نظر آ گیا، اس سے داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن کامیابی نہیں ہو رہی، ایک شخص آیا، اس نے تیزی سے داخل ہونے کی کوشش کی اور وہ داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا، آناً فاناً وہ اندر داخل ہو گیا اور اندر سے قلعے کا دروازہ کھول دیا، اسلامی لشکر اندر داخل ہو گیا اور قلعہ فتح ہو گیا، کردار ایک شخص کا ہے، جو نامعلوم ہے کہ کون ہے؟ مسلمہ نے قلعہ کی فتح کے بعد اعلان کیا کہ وہ شخص کون تھا جس نے اندر جا کر دروازہ کھولا؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں، لیکن کوئی سامنے نہیں آیا، جب اس نے یہ بات بتائی کہ یہ امر امیر ہے، امیر کی نافرمانی جائز نہیں، اس شخص کو سامنے آنا پڑے گا، تو پھر ایک شخص پیچھے سے اٹھتا ہوا سامنے آ گیا

اور کہا: امیر المؤمنین میں اس شخص کو جانتا ہوں، وہ سامنے آنے کے لیے تیار ہے، اس کی تین شرطیں ہیں:

۱۔ ایک شرط یہ ہے کہ تم اس کا اور قبیلے کا نام نہیں پوچھو گے، یہ اس کی پہلی شرط ہے۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس شخص کا معاملہ امیر وقت کی طرف پیش نہیں کرو گے کہ خط لکھ کر اس کی تعریفیں کرو کہ فلاں قلعہ کی فتح میں فلاں شخص کا کردار ہے، کوئی تعریفی خط نہیں لکھو گے۔

۳۔ اس شخص کی تیسری شرط یہ ہے کہ اس کے لیے کسی انعام کا اعلان نہیں کرو گے کہ اس کو ہم اتنا انعام دیتے ہیں اور اس کو یہ اکرام دیتے ہیں۔

اگر یہ تین شرطیں منظور ہیں، تو پھر وہ سامنے آنے کے لیے تیار ہے، کہا کہ ٹھیک ہے، مجھے قبول ہے، ہم تو اس شخص کی زیارت کرنا چاہتے ہیں، تو اس نے کہا کہ وہ میں ہی ہوں، اور یہ کہہ کر وہ تیزی سے واپس پلٹا اور لشکر میں داخل ہوگیا۔ تا کہ یہ نیکی اللہ کی رضا کے لیے خالص ہو، اگر انعام و اکرام تم دے دو گے، تمغے تم پہنا دو گے، تو اخلاص ختم ہو جائے گا، قبیلے کا نام بتا دوں یا اپنا نام بتا دوں، دنیا میں دھوم مچ جائے، نام کی شہرت ہو، اخلاص ختم ہو جائے گا، جس لشکر میں ایسے فوجی ہوں، وہ لشکر کیوں نہ کامیاب ہو؟

برکت اور کامیابی کی اساس:

اور جہاں ریا کاری ہو، دکھاوا ہو، نام و نمود ہو، نمود و نمائش ہو، شہرت پسندی ہو، وہاں قطعاً کامیابی نہیں ملتی، جہاں داستانیں بنیں اور داستانیں بھی جھوٹ اور مبالغہ آمیزی کے ساتھ اور کذب بیانی کے ساتھ تا کہ ہمارے نام کا خوب ڈنکا بجے،

وہاں کیا کامیابی ہوگی اور کیا برکتیں نازل ہوں گی؟

یاد رکھو! یہ کامیابی کی اصل اساس ہے، اخلاص ہو، عقیدے کی صلابت ہو، منہج کی معرفت ہو، عمل ہو، صبر ہو، صدق ہو، تو یقیناً کامیابی ہوگی، پھر اللہ رب العزت غلبہ دے گا، تمکین دے گا اور اگر یہاں کچھ کمزوری ہوگی، تو اللہ سبق سکھائے گا۔

درسِ عبرت:

پھر اللہ رب العزت درس عبرت دینے کے لیے کچھ سزا دلوائے گا، خواہ لشکر کے قائد محمد رسول اللہ ﷺ کیوں نہ ہوں؟ جنگ احد اور جنگ حنین آپ کے سامنے ہیں، اس سے پاکیزہ قیادت کائنات میں کوئی ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں! قیادت جیسی بھی ہو، اگر جھول آ گیا اور کہیں بھی کوتاہی آ گئی، تو اللہ ناراض ہوگا، پھر کامیابی نہیں ملے گی، پھر اللہ کے امر سے کامیابی کفار کو ملے گی اور مسلمانوں کو زخم ملیں گے، شہادتیں ملیں گی، اللہ رب العزت یہ درس دے کر مزہ چکھائے گا، تاکہ تم لوٹ سکو، توبہ کرسکو، انابت کرسکو، تمہارا اللہ کے ساتھ تعلق مزید پختہ ہو سکے اور اسلام میں تمحیص آ جائے، یہ سارے اللہ کے امر کے رنگ ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ رب العزت یہ فتح و کامرانی عطا فرمانے کے لیے ان وسائل کا محتاج نہیں۔

کفار پر رعب و دبدبہ:

پھر اس مسئلے پر ایک اور رخ سے غور کیجیے، اللہ پاک کا فرمان ہے:

﴿ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ﴾ [آل عمران: ۱۵۱]

ہم کفار کے دلوں میں رعب، ہیبت، خوف اور تمہارا دبدبہ پیوستہ کر دیں گے، ایسا رعب ڈالیں گے کہ تمہارا خوف ان پر قائم رہے گا۔

یہ ضروری نہیں کہ سامنے آ کر تم سے ڈریں گے، بلکہ ایسا خوف طاری کریں گے کہ "نصرت بالرعب مسیرة شهر" [1] دشمن تم سے ایک مہینے کی مسافت پر ہو، اتنی دوری پر بھی وہ تم سے ڈریں گے، تمہاری ہیبت اور خوف میں مبتلا ہونگے، ایک مہینے کی مسافت کا فاصلہ ہونے کے باوجود ڈریں گے۔

وہی اللہ کا اٹل قانون ہے کہ ان کے دلوں میں بزدلی ہوگی، تمہارا رعب ہوگا، تمہارا خوف ہوگا، ہم تمہاری ہیبت ڈالیں گے اور جس قوم کے دل میں خوف اور بزدلی آ جائے، وہ قوم کبھی جنگ نہیں جیت سکتی، اس قوم کے پاس چاہے ایٹمی طاقت ہو، ایک شخص کے ہاتھ میں تلوار ہے، تلوار اٹھانا آسان ہے، چلانا مشکل ہے، چلائے گا وہ جس میں شجاعت و بہادری ہو، جس کے دل میں بزدلی ہوئی، وہ کیا تلوار چلائے گا؟ ایک شخص کے ہاتھ میں کلاشنکوف ہے، اس کو اٹھا لینا آسان ہے، لیکن ٹریگر دبانے اور دشمن کا سامنا کرنے کے لیے دل میں ہمت و طاقت چاہیے، اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے یہ طاقت چھین لی، تمہارا خوف ان کے دلوں میں پیوست کر دیا، یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے۔

دو قاعدے:

یہاں دو قاعدے بیان ہوئے ہیں، ایک یہ کہ مشرک کے دل میں تمہاری ہیبت ڈال دی، کیوں؟ ﴿ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ ﴾ کیونکہ شرک کرنے والا بزدل ہے، اس لئے تو پیغمبر ﷺ نے جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ " نتنی" ہیں، [2] مردار ہیں، حالانکہ یہ زندہ تھے اور بیشتر اشراف اور اونچے نسب کے مالک تھے،

---

[1] صحيح البخاري: كتاب التيمم، رقم الحديث (٣٢٨) صحيح مسلم: كتاب المساجد ومواضع الصلاة، رقم الحديث (٥٢١)

[2] صحيح البخاري: كتاب المغازي، باب شهود الملائكة بدرا، رقم الحديث (٣٧٩٩)

لیکن کفر اور شرک کی بنا پر فرمایا کہ یہ مردار ہیں، اس میں ایک اشارہ کیا کہ ایک مردہ انسان کسی کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟

قبرستان میں لاکھوں مردے دفن ہوں، آپ وہاں چلے جائیں، آپ کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے؟ بالکل نہیں، ایک مردہ سامنے کھڑا ہو، آپ کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے؟ فرمایا کہ یہ عالم کفر مردار ہے، بشرطیکہ تم عقیدے اور عمل کے اعتبار سے زندہ بن جاؤ، تمہارے اندر حیات ہو، اسلام کی طاقت اور عقیدے کی صلابت ہو۔

مشرک بزدل ہوتا ہے:

کیونکہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ مشرک بزدل ہوتا ہے اور مشرک کے دل میں ہیبت اور خوف اور دبدبہ ہوتا ہے ﴿ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ﴾ کیونکہ شرک وہ چیز ہے جس پر اللہ کی طرف سے کوئی دلیل نہیں، جو شرک کرنے والے ہیں، ان کے پاس کوئی دلیل نہیں، کوئی سلطان نہیں، کوئی حجت نہیں، وہ دلیل سے خالی ہیں، حجت سے عاری اور سلطان سے محروم ہیں۔

شرک کی کوئی دلیل نہیں:

ایسے لوگوں سے ہمارا معاملہ کیا ہونا چاہیے؟ ان کے سامنے اللہ کی توحید بیان کرو بس! باقی ہم یہ کوشش کریں کہ سنیں تمہاری کیا دلیل ہے؟ نہیں! اللہ فرماتا ہے کہ شرک کی دلیل کوئی ہے ہی نہیں، یوسف علیہ السلام نے جیل میں کہا تھا:

﴿ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ﴾ [يوسف: ٣٩، ٤٠]

کہ جس جس کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، یہ سب نام ہیں، جو تم نے

رکھے یا تمہارے آباء واجداد نے رکھے ہیں، اللہ کی طرف سے کسی نام کی سند ہے؟ کسی نام کی برہان ہے؟ کیا داتا نام اللہ نے رکھا ہے؟ کہیں بتایا ہے؟ کسی کو مشکل کشا اللہ نے کہا ہے؟ گنج بخش اللہ نے کسی کا نام رکھا ہے؟ یہ نام تم نے رکھے ہیں: ﴿ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ﴾ اللہ کی طرف سے کوئی دلیل نہیں، شرک بالکل بے دلیل ہوتا ہے۔

یہ دو قاعدے بیان ہوگئے، ایک یہ کہ مشرک بزدل ہوتا ہے، دوسرا یہ کہ مشرک کے لیے اپنے شرک کو ثابت کرنے کے لیے کوئی حجت اور کوئی دلیل نہیں، وہ جو بھی حجت پیش کرے گا، وہ تار عنکبوت ہوگی۔

اصل چیز توحید ہے:

اصل چیز توحید ہے، توحید بذات خود ایک حجت اور دلیل ہے، سلطان اور غلبہ ہے، یہ قواعد اللہ تعالیٰ نے بیان کئے ہیں، یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ ہرقل نے یہ بات کس تناظر میں کہی؟ اگر واقعی یہ دعوت سچی ہے اور اس کی یہی دعوت ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، اس میں کسی کو شریک نہ کرو، سب کا انکار کر دو، آباء واجداد اور قوم و برادری کی تقلید چھوڑ دو، نمازوں کی پابندی کرو، سچ بولو، صلہ رحمی کرو اور عفت کی زندگی بسر کرو، اگر یہ اس کی مبارک تعلیم ہے، تو پھر اس ملک شام کی زمین پر محمد (ﷺ) کا قبضہ ہوگا، حالانکہ وہ کمزور ہے، مفلوک الحال ہے، کھانے کے لیے اناج نہیں اور ہمارے پاس طاقت ہے، وسائل ہیں، صنعتیں، حرفتیں، دنیا کے خزانے اور دولتیں ہیں، لیکن اللہ رب العزت ان چیزوں کا محتاج نہیں ہے، اللہ کا امر آجائے، یہ سب کی سب طاقتیں مسمار ہو جاتی ہیں، ساری طاقتیں برباد ہو جاتیں ہیں، فرعون کی فرعونیت پانی کے ایک گھونٹ سے باہر نکل آتی ہے اور وہ مردہ ڈھانچہ بن جاتی ہے،

یہ اللہ کی طاقت اور اللہ کا امر ہے، بس بات یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ سیدھا تعلق جوڑ لیں اور خاص کر وہ لوگ جو دعوت و جہاد کا کام کرتے ہیں، ان کو تو ہر معاملے میں کامل ہونا چاہیے، ایک نمونہ، ایک آئیڈیل اور ایک مثال ہونا چاہیے۔

توحید کا رنگ:

ان کو توحید کے رنگ میں رنگا ہونا چاہیے، ان کے ظاہر پر، ان کے باطن پر، ان کے قلوب پر، ان کے اذہان پر اور ان کے لباس پر مکمل رنگ ہو، کس کا؟ ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ اللہ کا رنگ اور اللہ کے دین کا رنگ ہو۔

وہ کوئی معاملہ اپنے ہاتھ میں نہ لیں کہ ہمیں دین کا کام کرنا ہے، ویڈیو بھی جائز ہے، فوٹو بھی جائز ہے، ہمیں اسمبلی میں جا کر توحید کی اذانیں دینی ہیں، جمہوری طریقے سے الیکشن بھی جائز ہیں، نہیں یہ ساری چیزیں اللہ کے امر کے ساتھ بغاوتیں ہیں۔

فوٹو حرام ہے:

فوٹو حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"أشد الناس عذابا يوم القيامة الذين يضاهئون بخلق الله ."[1]

"قیامت کے دن سب سے سخت عذاب ان کو ہوگا، جو اللہ کی صفت خلق کے ساتھ تشبہ اختیار کرتے ہیں۔"

خالق اللہ ہے اور مصور بھی اللہ ہے، اگر تم فوٹو بناؤ گے، تو خلق ہوگا، تصویر بناؤ گے، تو تم مصور بنو گے، خالق بھی اللہ ہے، مصور بھی اللہ ہے، اگر یہ کام کرو گے، تو اللہ کے ساتھ تشبہ ہوگا، سب سے سخت عذاب انہی کو ہوگا۔

---

[1] صحيح البخاري: كتاب اللباس، باب ما وطئى من التصاوير، رقم الحديث (٥٦١٠) صحيح مسلم: كتاب اللباس والزينة، باب تحريم تصوير صورة الحيوان، رقم الحديث (٢١٠٧)

تصویر سازی اور ہماری حالتِ زار:

ہمیں کوئی پروا ہی نہیں، چاہے علماء ہوں، بڑے طمطراق سے اپنی ویڈیو بنوا رہے ہیں اور عامۃ الناس ہوں، ویڈیو بن رہی ہے، شادی بیاہ کے معاملے ہوں، ہم دیوث بن جاتے ہیں، کیسے لوگ ہیں کہ یہ ہماری بہو، بیٹیاں اور خاندان کی عورتیں ہیں، ایک دو غیر محرم فوٹو گرافر کو بلا لیا جاتا ہے کہ آجا بھائی! کیمرے اٹھا کے آجاؤ، یہ میری بیٹیاں ہیں، یہ میری بیویاں ہیں اور میری خاندان کی عورتیں ہیں، اب پانچ چھ گھنٹے تم ہو اور تمہارا کیمرہ چلے، خوب ان کو دیکھو، کلوز کر کر کے دیکھو، تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو، وہ کیا کچھ نہ کرتا ہوگا؟ دو چار چھ گھنٹے مستقل خواتین کے اندر ہے، تصویریں بن رہی ہیں، ویڈیو بن رہی ہے، فوٹو بن رہے ہیں، وہ فارغ ہو کر اس کا شکریہ ادا کرتا ہے، تھینک یو بھائی! یہ تمہاری فیس اور تمہارا انعام ہے!

دیوث کا انجام:

اس مقام پر غور کرو، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"ایک شخص ایسا ہے، جس کو جنت کی خوشبو بھی نہیں ملے گی، وہ کون ہے؟

فرمایا کہ وہ دیوث ہے۔"[1]

آج کے دن تجھ سے بڑھ کر کوئی دیوث نہیں، اپنی خاندان کی عورتوں میں اس نامحرم کو چھوڑ کے مطمئن ہو، وہ فخر کر رہا ہے، وہ ترقی یافتہ ہے، لعنت ہو اس ترقی پر، جو انسان کو دیوث بنا دے، پھر اس کا شکریہ ادا کرتا ہے، کتنی بڑی نحوست ہے اور کتنا بڑا اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے؟!

---

[1] مسند أحمد (٢/٦٩) نیز دیکھیں: صحیح الجامع، برقم (٥٣٧٣)

احکام خداوندی سے بغاوت کا نتیجہ:

پھر چھ ماہ بعد آ جاتے ہو، طلاق کا معاملہ بن گیا، اس کو کیسے نبھائیں، گھر میں صلح نہیں، گھر میں جھگڑے ہیں، فساد ہیں، ساس بہو کے جھگڑے ہیں، فلاں کے جھگڑے ہیں، جھگڑے کیوں نہ ہوں؟ جب اس بندھن کے موقع پر جہاں تقویٰ چاہیئے، اللہ کا خوف چاہیے، پرہیز گاری چاہیے، وہاں تم نے ایک ایک کر کے اللہ کے قانون کو توڑا اور اللہ کے قانون سے بغاوت کی، اب اختلافات کیوں نہ ہوں؟ تم نے فوٹو بنوائے، ویڈیو بنوائی، اب وہ ویڈیو خاندان کے لوگ دیکھ رہے ہیں، دوست احباب دیکھ رہے ہیں، کبھی ویڈیو فلم کسی کے گھر میں ہے، کبھی کسی کے گھر میں ہے، کوئی پردے کی پروانہیں، ایسا انسان دیوث ہے، اسے جنت کی خوشبو نہیں ملے گی۔

تو بات یہ ہے کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لو کہ ہم اپنی مرضی سے کام کریں، تاکہ غلبے کی راہ ہموار کریں، غلبہ تو خالقِ کائنات کے ہاتھ میں ہے، اگر ہم اللہ کے منہج اور اس کے دین سے وفاداری کریں گے، تو کامیاب ہوں گے، اس کے اصولوں سے بغاوت کرو گے، دین کے باغی بن جاؤ گے، جو مرضی کرتے جاؤ، کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ناکام ترین ہو جاؤ گے، کامیابی نہیں ملے گی۔

سیرت طیبہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے:

تو اللہ کا خوف کیجئے! ان مناہج کو سمجھئے، پیغمبر ﷺ کی سیرت طیبہ ہمارے سامنے ایک مثال ہے، کس سوچ سے آپ چلے؟ اللہ کے دین سے وفاداری کی، اللہ نے فتوحات کے راستے کھول دیئے اور پھر یہ سارے ممالک فتح ہو گئے، ملک شام بھی فتح ہو گیا، سلطنت فارس بھی، یمن بھی اور پھر اسلام کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا؟ ہاں اس میں دیر لگتی ہے، یہ بات درست ہے۔

اللہ جھنجھوڑتا ہے، آزماتا ہے، صبر وصدق کو چیک کرتا ہے، بندہ اگر واقعتاً صبر و صدق کا پہاڑ بن جائے، عقیدے کی صلابت دکھادے اور عملی طور پر کامل ہو، مذہبی اور منہجی اعتبار سے صاحب فہم ہو، تو بالآخر کامیابی مل جاتی ہے، دس سال بعد ملے، سو سال بعد ملے، لیکن یہ سو سال کا عرصہ ناکامی کا عرصہ نہیں ہے، بلکہ انتہائی کامیابی کا عرصہ ہے۔

منہج سے وفاداری:

وہ انبیاء بڑے کامیاب ہیں، جو قیامت کے دن اکیلے کھڑے ہوں گے، کیونکہ انہوں نے کم از کم منہج سے وفاداری کی، منہج کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیا، منہج کو قربان کرنے کی کوشش نہیں، بلکہ منہج سے پوری وفاداری کی، اگر کوئی اسلام قبول نہیں کر سکا، تو اس میں ان کا کوئی دوش نہیں، کوئی کوتاہی نہیں، وہ تو کامیاب ہیں، انہوں نے پوری زندگی منہج کو تھامے رکھا، منہج پر سودے بازی نہیں کی، کچھ لے لو اور کچھ دے دو، کچھ مان لو، کچھ منوا لو! نہیں وہ توحید کا اٹل پہاڑ تھے، ٹھوس پہاڑ تھے، کوئی مانے یا نہ مانے، ہمیں چاہیے کہ ہم بھی اسی کو سمجھیں، کامیابی اللہ کے اصولوں اور اللہ کے بیان کردہ عقیدے کے ساتھ مشروط ہے، اوامر ونواہی کے ساتھ وفاداری یہی کامیابی کی کلید ہے۔

مکتوب نبوی دربار روم میں:

سلطنت روم کے فرماں روا ہرقل کے تمام سوالات پورے ہو چکے ہیں اور اس کا تبصرہ بھی ہم سب نے سنا، جب وہ اس انٹرویو سے فارغ ہوا، تو اس نے رسول اکرم ﷺ کا خط طلب کیا، خط تو وہ پہلے ہی پڑھ چکا تھا، کیونکہ یہی خط اس پورے قصے کی بنیاد بنا، جس خط کی اس پر ہیبت طاری تھی اور اس کی پیشانی عرق آلود تھی، اس نے کہا کہ "لم أر مثله "اس جیسا خط میں نے آج تک نہیں پڑھا، اب وہ چاہتا

تھا کہ یہ خط پورے دربار میں، جہاں علمائے روم بیٹھے ہوئے تھے، پڑھا جائے، چنانچہ یہ خط جو دحیہ کلبی نے بصریٰ کے گورنر کو دیا تھا، جس کا نام حارث تھا اور حارث نے یہ خط ہرقل تک پہنچا دیا تھا، اس خط کو بھری مجلس میں پڑھا گیا، ہرقل کے ترجمان نے یہ خط پڑھ کے سنایا۔

جوامع الکلم:

یہ خط بظاہر دو سطروں پر مشتمل تھا، لیکن اس میں ہر چیز بیان ہوگئی تھی، کیونکہ یہ اس ہستی کا خط ہے جس کا فرمان ہے:

"أعطيت جوامع الكلم"[1] مجھے اللہ تعالیٰ نے جوامع الکلم دیے ہیں۔

یعنی کلام میں یہ قدرت اور طاقت دی ہے کہ میں ایک ہی جملے میں اپنا پورا مدعا بیان کرسکتا ہوں اور پورا دین سمجھا سکتا ہوں، جنت کے حصول اور جہنم سے بچاؤ کا پورا پروگرام پیش کرسکتا ہوں، یہ اس شخصیت کا خط ہے۔

مکتوب نبوی کا آغاز:

خط پڑھا گیا: "من محمد" یہ خط محمد ﷺ کی طرف سے ہے، محمد ﷺ کون ہے؟ "عبد الله ورسوله" جو اللہ کا بندہ اور اللہ کا رسول ہے۔

تمام انبیاء اللہ کے بندے ہیں:

یہ ان لوگوں پر ضرب کاری تھی، جو عیسیٰ علیہ السلام کو "ابن الله" اللہ کا بیٹا کہتے ہیں، فرمایا کہ وہ بھی اللہ کے رسول تھے اور میں بھی اللہ کا رسول ہوں اور جو اللہ کے رسول ہوتے ہیں، وہ برابر ہوتے ہیں، سب اللہ کے بندے ہیں، کوئی اللہ کا بیٹا نہیں،

---

[1] صحيح البخاري: كتاب التعبير، باب المفاتيح في اليد، رقم الحديث(٦٦١١)
صحيح مسلم: كتاب المساجد ومواضع الصلاة، رقم الحديث (٥٢٣)

﴿ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴾ [الإخلاص: ٣] نہ کوئی اس کا بیٹا ہے اور نہ کوئی اس کا والد ہے، اس پہلے جملے میں ان کے باطل مذہب کی تکذیب ہے کہ اللہ کے رسل اللہ کے بندے ہیں اور جس انسانیت کی طرف ان کو بھیجا جاتا ہے، وہ ویسے ہی انسان ہوتے ہیں، ان تمام عوارض میں مبتلا ہوتے ہیں، جن عوارض میں ہر شخص مبتلا ہوتا ہے، یعنی کھانا، پینا، سونا، جاگنا اور کمانا، شادی بیاہ کرنا، بیمار ہونا، صحت یاب ہونا۔

انبیاء و رسل اور دیگر انسانوں میں کیا فرق ہے؟

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ ﴾ [حم سجدہ: ٦]

میں تم جیسا ایک انسان ہوں، بس ایک فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ میری طرف اللہ کی وحی آتی ہے، جو تمہاری طرف نہیں آتی، بس یہ امر فائق ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میری اطاعت کرو، مجھے اپنا قدوہ مان لو، اور دین کے معاملے میں میری غلامی کرو، بس یہ ایک امر فارق ہے، تو آپ نے اسی عقیدے کی وضاحت کی کہ انبیاء و رسل اللہ کے بندے ہیں، انہیں ابن اللہ کہنا یہ غلط عقیدہ ہے، تو اس پہلے جملے میں آپ نے ان کے عقیدے اور منہج کی تکذیب کی۔

رسول ہی اصل حاکم ہوتا ہے:

"إلى عظيم الروم" یہ نہیں کہا کہ ایک مشرک کی طرف یا ایک بے ایمان کی طرف ہے، کہا روم کی عظیم شخصیت کی طرف، وہ روم کا بادشاہ تھا، لیکن بادشاہ نہیں کہا، کیونکہ بادشاہ کی اطاعت ہوتی ہے اور نبی کی بعثت کے بعد اسلامی نقطہ نظر سے زمین پر موجود بادشاہتیں ٹوٹ جاتی ہیں، نبی اپنے دور میں کسی کی بادشاہت کو نہیں مانتا، بادشاہ کہنے کی صورت میں اس میں ایک التباس ہوتا ہے، اگر فلاں کو بادشاہ مان لیا جائے، تو بادشاہ کی اطاعت ہوتی ہے، نہیں اب کائنات میں سکہ ایک ہی شخصیت کا ہے اور وہ اللہ کے نبی ہیں۔



دعوت میں تالیف قلبی کا لحاظ:

"ملك الروم" نہیں کہا کہ روم کے بادشاہ کے نام، بلکہ "عظیم الروم" کہا، یعنی روم کی ایک عظیم شخصیت کے نام، جس کا معنی ہے کہ دعوت میں تالیف قلبی کا پہلو رکھنا چاہیے، " إذا أتاكم كريم قوم فأكرموه "[1] ہر قوم کے معزز کی تم عزت کیا کرو، تا کہ اس کی تالیف قلبی ہو اور وہ تمہارے قریب آئے، تمہاری بات کو سنے اور اگر پہلے ہی فتوؤں کی بوچھاڑ ہو جائے، تم مشرک ہو، تم تو کافر ہو، تم تو بے ایمان ہو، تم تو منافق ہو، تو یہ بات منہجِ دعوت کے خلاف ہے، منہج دعوت یہ ہے کہ جس کو دعوت دینا چاہیں، اس کی عزت کریں۔

ہرقل کو دعوتِ اسلام:

تو یہ خط اللہ کے ایک بندے کی طرف سے ہے، روم کی عظیم شخصیت کے نام، اس ایک جملے میں کئی باتیں سامنے آ گئیں، نبی ﷺ کا مقام، نبی ﷺ کا منصب اور دعوت میں حکمت کے پہلو کو اپنانا، اس کے بعد فرمایا: " أدعوك بدعاية الإسلام "

اے عظیم روم! میں تجھے اسلام کی دعوت پیش کرتا ہوں۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں: " أدعوك بداعية الإسلام "

میں تجھے اس کلمے کی دعوت دیتا ہوں، جو کلمہ اسلام کی طرف بلانے والا ہے، وہ کلمہ کیا ہے؟ " أشهد أن لا إله إلا الله، وأشهد أن محمدا رسول الله " کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔

---

[1] سنن ابن ماجه: كتاب الأدب، باب إذا أتاكم كريم قوم فأكرموه، رقم الحديث (٣٧١٢) نیز دیکھیں: السلسلة الصحيحة (٣/٢٠٣) برقم (١٢٠٥)

قبول اسلام کا ثمرہ:

اور ساتھ یہ کہتے ہیں کہ " أسلم تسلم "اے ہرقل! اسلام قبول کر لے، تو سلامتی پا جائے گا، کتنی بڑی طاقت ہے؟ فرمایا کہ اسلام قبول کرلو اور میری اطاعت قبول کرلو، میرا امتیاز مان لو، " تسلم " سلامتی پا جاؤ گے، دنیا اور آخرت کی سلامتی، اورصرف سلامتی ہی نہیں: "إن أسلمت فلك الأجر مرتين " اگرتم نے اسلام قبول کرلیا، تو پھر تمہیں دوہرا اجر ملے گا۔

اِعراض کا انجام:

" وإن توليت فإنما عليك إثم الأريسيين " اور اگرتم نے اعراض کیا اور اس دعوت سے انحراف کیا، تو پھر تمام "أريسيين " کا گناہ تمہارے سر پر ہوگا، اسلام قبول کرلو گے، تو دوہرا اجر ہے، دوہرا اجر کیوں؟ اس کی دو توجیہیں کی جا سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ تم دو نبیوں پر ایمان لائے ہو، ایک اپنے نبی پر عیسیٰ علیہ السلام اور پھر تم نے میری نبوت کو پالیا اور اس کو مان لیا، تو یہ دوہرا اجر ہے۔

دوہرے اجر کے مستحق:

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ہے:

" ثلاثة لهم أجران " تین قسم کے انسان ایسے ہیں، جنہیں دوہرا اجر ملے گا:

۱۔ "رجل من أهل الكتاب " ایک وہ شخص جو اہل کتاب سے ہے، یہودی یا عیسائی ہے، " آمن بنبيه " جو اپنے نبی عیسیٰ علیہ السلام پر یا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا، "ثم أدركني " پھر مجھے بھی پا لیا: " ثم آمن بي " پھر میرے اوپر بھی ایمان لے آیا، تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔

۲۔ اور دوسرا " رجل عنده أمة " وہ شخص جن کے پاس کوئی لونڈی ہو، "فعلمها

فأحسن تعلیمها" وہ اس کو اچھی تعلیم دلوائے، اچھا ادب سکھائے، دین کی تعلیم کا انتظام کرے، "ثم أعتقها" پھر اس کو آزاد کردے، "فتزوجها" پھر اس سے نکاح کرلے، اسے بھی دوہرا اجر ملے گا، ایک اس لونڈی کو سکھانے کا، پڑھانے کا، تعلیم دینے کا اور دوسرا آزاد کر کے نکاح کرنے کا کہ اس نے ایک غلامی کا بندھن توڑ دیا اور ایک نفس کو آزاد کر دیا۔

امام بخاری کا انوکھا استدلال:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے بڑا عجیب استدلال کیا ہے کہ جب ایک لونڈی کو تعلیم دینے کا اتنا اجر و ثواب ہے، تو ایک آزاد عورت کو تعلیم دینے کا کتنا ثواب ہوگا؟ حالانکہ لونڈی کا دائرۂ کار محدود ہوتا ہے اور ایک آزاد عورت کا دائرۂ کار وسیع ہوتا ہے، جب محدود دائرۂ کار والی خاتون کو تعلیم کا یہ ثواب ہے، تو جس عورت کا دائرۂ کار وسیع ہوتا ہے، اسے دینی تعلیم دینے کا کتنا ثواب ہوگا؟

عورت کی تعلیم و تربیت کا ثواب:

اسی لئے پیغمبر علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جو شخص تین بہنوں یا تین بیٹیوں سے آزمایا جائے اور پھر پورے صبر و صدق کے ساتھ ان کی کفالت کرے اور ان کی تعلیم کا اہتمام کرے، یہ تین بیٹیاں اور بہنیں مل کر اس کے لیے جہنم سے پردہ بن جائیں گی، "كن له سترا من النار"[1] جہنم سے اس کو چھپالیں گی اور پردہ بن جائیں گی، صحابہ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! اگر دو ہوں؟ فرمایا کہ اگر دو بھی ہوں، پوچھا گیا کہ ایک ہو، فرمایا ایک بھی!

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الزكاة، باب اتقوا النار ولو بشق تمرة، والقليل من الصدقة، رقم الحديث (١٣٥٢) صحيح مسلم: كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل الإحسان إلى البنات، رقم الحديث (٢٦٢٩)

یہ تعلیم و تعلم کا اجر و ثواب ہے، یہ دوہرا اجر ہے۔

۳۔ اور تیسرا شخص کون ہے؟ "عبد مملوك أدى حق الله وحق مواليه" دوسرا وہ غلام، خادم اور ملازم جو اللہ تعالیٰ اور اپنے مالک کا حق پوری دیانت داری سے ادا کرے، جب مالک کی خدمت پر مامور ہو، تو پوری دیانت داری سے اس کا کام کرے، اس میں خیانت نہ کرے، کوتاہی نہ کرے اور جونہی اذان کی آواز سنے، تو پھر فوراً نماز کے لیے بھی حاضر ہو جائے، اللہ کا بھی حق ادا ہو رہا ہے، اور اپنے مالک مجازی کا بھی حق ادا ہو رہا ہے، فرمایا کہ اس شخص کو بھی دوہرا اجر ملے گا۔"[1]

دوہرے اجر کی توجیہ:

تو آپ نے فرمایا کہ اے ہرقل اگر تم اسلام قبول کر لو گے، تو تمھیں دوہرا اجر ملے گا، ایک اپنے پیغمبر عیسی علیہ السلام پر ایمان لانے کا اور دوسرا مجھ پر ایمان لانے کا، اس دوہرے اجر کی دوسری توجیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر تم اسلام لے آؤ گے، تو تمھیں دیکھ کر تمھاری رعیت اور تمھارے اَتباع بھی اسلام قبول کر لیں گے، یعنی تمھارا اسلام قبول کرنا ان کے اسلام قبول کرنے کا ایک سبب بن جائے گا، تو یہ دوہرا اجر ہوگا۔

ایک یہ کہ تم نے خود اسلام قبول کر لیا اور دوسرا یہ کہ تم دوسروں کے لیے سبب بن گئے اور اس طرح تمھیں بے تحاشا اجر و ثواب ملے گا۔

اگر تم اعراض و انحراف کرو گے اور اس دعوت کو قبول نہیں کرو گے: "فإنما عليك إثم الأريسيين" تو پھر تمام "أريسيين" کا گناہ بھی تمھارے ذمے ہوگا۔

---

[1] صحيح البخاري: كتاب العلم، باب تعليم الرجل أمته وأهله، رقم الحديث (٩٧) صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب وجوب الإيمان برسالة نبينا محمد صلى الله عليه وسلم إلى جميع الناس، رقم الحديث (١٥٤)

أریسیین کا معنی:

"أریسیین " اس کا اصل معنی فلاح ہے یعنی کھیتی باڑی کرنے والا، گویا ان لوگوں کی معیشت کا انحصار بہت سی چیزوں پر تھا، ان میں زراعت بھی تھی، اور عام طور پر زراعت پیشہ لوگ اندھے ہوتے ہیں اور وہ جلد ہی اطاعت قبول کر لیتے ہیں کہ ہمارا داعی مسلمان ہوگیا اور ہم بھی مسلمان ہوجائیں، کہا کہ اگر تم اسلام قبول نہیں کرو گے، تو گویا تم ان لوگوں کے لیے بھی رکاوٹ بن جاؤ گے، اس طرح تمہیں اپنا گناہ بھی ہوگا اور تمہاری رعیت کا گناہ بھی ہوگا۔

اہل کتاب کو دعوت:

پھر آپ نے قرآن پاک کی ایک آیت پیش کی:

﴿ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴾ [آل عمران: ٦٤]

اے اہل کتاب! (یہود و نصاریٰ) ایک کلمے کی طرف آجاؤ، جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے، اس کلمے کے تعلق سے ہم میں اور تم میں کوئی اختلاف نہیں، یعنی اس کلمے کا داعی قرآن پاک بھی ہے، تورات بھی تھی اور انجیل بھی تھی، قرآن، تورات اور انجیل میں اس کلمے کی بابت کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا، تو باقی باتیں تو بعد کی ہیں، نمازیں پانچ ہیں، دو ہیں، یہ فیصلے بعد میں کریں گے، لیکن جس کلمے پر ہماری شرائع متفق ہیں، جو کلمہ قرآن نے بھی پیش کیا، تورات نے بھی پیش کیا، انجیل نے بھی پیش کیا، پہلے اس پر تو آجاؤ، اس پر تو ہم اکٹھے ہو جائیں، مخالفت ترک کر کے ایک ہو جائیں اور آپس میں اتفاق و اتحاد کرلیں۔

کلمۂ توحید پر اتفاق کی دعوت:

وہ کلمہ کیا ہے؟ وہ کلمہ تین چیزوں سے عبارت ہے، یہ دعوت قرآن کی بھی ہے، تورات کی بھی تھی اور انجیل کی بھی تھی:

۱۔ ﴿ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ ہم نہ عبادت کریں مگر صرف ایک اللہ کی۔

۲۔﴿ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا ﴾ دوسری چیز یہ کہ اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، یہ دعوت متفقہ دعوت ہے، ایک اللہ کی عبادت ہو اور اس کی عبادت میں کوئی شریک نہ ہو۔

۳۔تیسری چیز یہ کہ ﴿ وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ اور ہم اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ مانیں، رب صرف ایک اللہ ہے، اسی کو مانیں، یعنی آپس میں ہم انسان ایک دوسرے کو اپنا رب نہ مانیں۔

رب نہ ماننے کی تفسیر:

رب نہ ماننے کی دو تفسیریں ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ تم عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہو، ان کو رب مانتے ہو اور کوئی عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں، ان کو رب مانتے ہیں، حالانکہ وہ انبیاء اور اللہ کے بندے ہیں، ہم جیسے انسان ہیں، وہ رب نہیں ہیں، ان کو رب نہ مانیں۔

۲۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ خود قرآن اپنی تفسیر کرتا ہے اور اس تفسیر میں ایک قصہ موجود ہے۔

عدی بن حاتم کا واقعہ:

عدی بن حاتم جب اسلام قبول کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ توبہ کی تلاوت کر رہے تھے، آپ قرآن پڑھتے پڑھتے یہاں تک پہنچ گئے

اور عدی سن رہے ہیں: ﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾
یہود و نصاریٰ نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء، راہبوں، مولویوں، پیروں اور مرشدوں کو اپنا رب بنا لیا۔

عدی سن رہے تھے، یہاں خاموش نہ رہے، کہا اے اللہ کے رسول! میرا ایک سوال ہے، یہاں ایک اشکال ہے اور وہ یہ ہے کہ " ما عبدناھم" ہم نے تو اپنے مولویوں اور علماء کی کبھی عبادت نہیں کی، پھر قرآن یہ بات کیسے کہہ رہا ہے کہ ہم نے انہیں رب بنا لیا؟

عبادت کا اصل معنیٰ:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: " ألستم تستحلون ما أحلوا لكم وتحرمون ما حرموا عليكم "

اے عدی! یہ بتاؤ کہ تمہارے علماء نے جس کو چیز حلال کہہ دیا، تم نے اس کو حلال نہیں مانا اور جس چیز کو حرام کہہ دیا، اسے حرام نہیں سمجھا؟

تم ان کے فتوے پر عمل پیرا تھے، ان کی باتیں سنتے، پڑھتے اور بیان کرتے، بغیر کسی سند اور دلیل کے ان کو قبول کرتے، ایسا تھا یا نہیں تھا؟ عدی نے عرض کیا ایسا تو ہوتا تھا، ہم ان کے پورے پورے پیروکار بن گئے، ان کے حلال کو حلال مانا اور اللہ کی وحی کو نہیں دیکھا، ان کے حرام کو حرام مانا، اللہ کی وحی کو نہیں دیکھا، فرمایا کہ "فتلك عبادتهم"[1] یہی ان کی عبادت ہے، تم نے ان کے حلال کو حلال مان کر اور ان کے حرام کو حرام مان کر انہیں اپنا رب اور اپنا معبود مان لیا، یہ ان کی پوجا اور ان کی عبادت ہے، جو شرک ہے۔

---

[1] سنن الترمذي: كتاب تفسير القرآن، باب تفسير التوبة، رقم الحديث (٣٠٩٥) سنن البيهقي (١١٦/١٠) نیز دیکھیں: السلسلة الصحيحة (٧٣/٩) برقم (٣٢٩٣)

تقلید شخصی شرک ہے:

اسی معنی میں کہتے ہیں کہ تقلید شخصی شرک ہے، کیونکہ تقلید کا معنی ہے " أخذ قول الغیر بلا حجة "[1] کسی غیر کی بات کو بغیر کسی دلیل کے ماننا، دلیل کا مطالبہ نہیں کرنا، یہ نہیں کہنا کہ کتاب وسنت کی روشنی میں بات کرو، نہیں، تم ہمارے امام ہو، ہمارے رہبر ہو، بس آپ فرما دیں کہ اس مسئلے کا کیا حل ہے؟ دلیل نہیں پیش کرنی، بلکہ بعض اوقات فتویٰ دینے والے مفتی حضرات سائل کو ڈانٹتے ہیں کہ تم نے اپنے سوال میں یہ شرط کیوں لگائی کہ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دو؟ کہتے ہیں کہ کیا یہ کافی نہیں ہیں کہ ہم مقلد ہیں؟ ہمارے لئے قولِ امام کافی ہے، قرآن وحدیث کی دلیل کے مطالبے کا کیا معنی؟ یہی شرک ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ تم نے بلا طلب دلیل ان کے حلال کو حلال مانا اور ان کے حرام کو حرام مانا تھا، یہی تو ان کی عبادت ہے، تو فرمایا:

﴿ وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾

کہ ہم سے کوئی کسی دوسرے کو اپنا رب مانے، نہ اس کا پیروکار بنے، ایسا نہ ہو اللہ تعالیٰ کی وحی کو چھوڑ کر اس کا فرمانبردار بن جائے، یعنی یہ وہ بات ہے، جو قرآن، تورات وانجیل کی دعوت کے درمیان قدر مشترک ہے۔

توحید ہر نبی کی بنیادی دعوت ہے:

یعنی توحید خالص کی دعوت دینا، بلکہ یہ دعوت تو ہر نبی کی دعوت تھی، قرآن کہتا ہے: ﴿ وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٤٥]

---

[1] إرشاد الفحول (٢/٢٣٩)

اے محمد ﷺ! ایک ایک نبی سے پوچھو، ابراہیم سے پوچھو، اسحاق سے پوچھو، اسماعیل سے پوچھو، یعقوب سے پوچھو، یونس سے پوچھو، موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام سب سے پوچھو کہ کیا ان انبیاء میں سے کسی کی دعوت میں غیر اللہ کی عبادت تھی کہ فلاں کو رب مان لو، فلاں کو معبود مان لو، فلاں کو تمام امور اور حلال وحرام میں اپنا مقتدیٰ مان لو، یہ دعوت تھی کہ نہ تھی؟ یا اللہ کیسے پوچھیں؟ یہ سب تو فوت ہو چکے اور اپنا اپنا دور گزار چکے ہیں، ان سے کیسے پوچھیں؟ فرمایا قرآن کے ذریعے ان سے پوچھو، کیونکہ قرآن پاک تمام انبیائے سابقین کی دعوت کا محاسب اور مہیمن ہے، تم کو اللہ بتائے گا۔

سابقہ انبیاء کی دعوت کیا تھی؟

چلو قرآن سے پوچھتے ہیں کہ سابقہ انبیاء کی دعوت کیا تھی؟ کیا کسی نبی کی دعوت میں غیر اللہ کی عبادت کا کوئی تصور موجود تھا؟ انسانوں کو ارباب ماننے کا کچھ تصور تھا؟ اللہ کی وحی کو چھوڑ کر کسی کی تقلید اور غیر اللہ کی عبادت کا کوئی تصور تھا؟ قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن اٹھاؤ، جا بجا دیکھو، فرمایا کہ

﴿ وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥]

آپ سے پہلے آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے انبیاء تھے، ان سب کی طرف ایک ہی وحی اور ان کی ایک ہی دعوت تھی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی عبادت اور اسی کی اطاعت کرو، وہی رب ہے، وہی معبود ہے، وہی مطاع ہے، اگر رسول کی اطاعت ہے، تو صرف اس معنی سے کہ رسول، اللہ کی وحی سے بات کرتا ہے:

﴿ وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ۝ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ يُّوۡحٰى ﴾ [النجم: ٣، ٤]

وہ اپنی بات نہیں کرتا۔

دینِ خالص اپناؤ:

﴿ اَلاَ لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ﴾ [الزمر: ٣] چونکہ دین خالص چاہیے اور دین خالص رکھنے کی ایک ہی صورت ہے کہ صرف اللہ کی وحی کا انتخاب کیا جائے، لوگوں کے فتوے آجائیں، قصے کہانیاں آجائیں، من گھڑت قصے آجائیں، ملفوظات آجائیں، دین خالص کہاں رہے گا؟ کیا یہ دین خالص کی بات ہے کہ کسی پر اعتراض نہ کرو، اگر تم دیکھ رہے ہو کہ وہ شراب سے دھلے ہوئے مصلے پر نماز پڑھ رہا ہے، تو اعتراض نہ کرو، تم کیا جانو وہ معرفت کی کس گھڑی پر ہے؟ کس منزل پر فائز ہے؟

لعنت ہے ایسی معرفت پر! یہ کونسا دین ہے؟ یہ دین خالص کی بات ہے؟ جس چیز کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کہہ دیا، کوئی دنیا کا دین اس کو حلال کہہ سکتا ہے؟ تو فرمایا کہ جاؤ ایک ایک نبی کی دعوت دیکھو اور ان سے پوچھو۔

دوسرا مقام اٹھا کر دیکھو، فرمایا:

﴿ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ [النحل: ٣٦]

ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا، اس رسول کی ایک ہی دعوت تھی کہ ایک اللہ کی عبادت کرو اور ہر طاغوت کا انکار کرو۔

طاغوت کیا ہے؟

ہر وہ چیز جس کو اللہ کے سوا پوجا جائے اور ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا اطاعت کی جائے، وہ طاغوت ہے!

بس فرق یہ ہے کہ کچھ طاغوت خود بن جاتے ہیں کہ ہماری عبادت کرو اور ہماری اطاعت کرو، جیسے فرعون تھا اور کچھ وہ ہیں جن کو پتا ہی نہیں ہوتا اور ان کی قومیں، ان کے مرید اور ان کے ماننے والے ان کو الٰہ بنا ڈالتے ہیں، وہ قیامت کے

دن چیخ چیخ کے اظہار براءت کریں گے یا اللہ! ہمیں کوئی علم نہیں:

﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ﴾ [البقرہ: ۱۶۶] یعنی براءت کا اقرار کریں گے کہ ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔

مشترکہ دعوت کی طرف آؤ:

فرمایا کہ یہ دعوت مشترک ہے، آؤ اس کلمے کی طرف آ جاؤ، ﴿سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ﴾ جو ہمارے اور تمہارے درمیان بالکل برابر ہے، یہ مشترک دعوت ہے، جو تین چیزوں سے عبارت ہے:

ایک اللہ کی عبادت ہو، اس عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے اور ہم انسان ایک دوسرے کو اپنا رب نہ بنائیں، رب بنانے کا مفہوم واضح ہو چکا، صرف ایک اللہ کی عبادت ہو اور محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہو اور یقین ہو کہ محمد رسول اللہ ﷺ صرف اللہ کی بات کرتے ہیں۔

رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے:

اللہ پاک نے فرمادیا ہے:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء: ۸۰]

جو رسول کی اطاعت کرے گا، اس نے اللہ کی اطاعت کر لی، اللہ نے یہ مقام اور کسی مائی کے لال کو نہیں دیا کہ فلاں کی اطاعت بھی میری اطاعت ہے، فلاں کی پیروی میری پیروی ہے، نہیں! فرمایا کہ اس زمین کے اوپر ایک ہی شخصیت ہے، جس کی اطاعت میری اطاعت ہے اور پھر میری اطاعت ہی نہیں، اس کی اطاعت میری محبت ہے اور اس کی اطاعت میری رضا ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ [آل عمران: ۳۱]

صرف اطاعت ہی نہیں، اس کی اطاعت تمہاری ہدایت ہے:

﴿ وَاِنْ تُطِيعُوْهُ تَهْتَدُوْا ﴾ [النور: ٥٤] اگر صرف اس کی اطاعت کرو گے، تو ہدایت پاؤ گے، اس کی اطاعت نہیں کرو گے، تو جس کی مرضی اطاعت کرلو، گمراہ ہو جاؤ گے۔

روشن دین:

کتنا واضح دین ہے؟ اس کو تم نے الجھا دیا اور خود پریشانی کا شکار ہو گئے، ورنہ دین تو واضح ہے، فرمایا:

" تركتكم على البيضاء، ليلها ونهارها سواء، لا يزيغ عنها إلا هالك"[1] میں تمہیں ایک چمکدار راستے پر چھوڑ کر جا رہا ہوں، اس میں کوئی خامی نہیں، کوئی التباس اور کوئی پیچیدگی نہیں، کوئی کجی نہیں، کوئی ٹیڑھ پن نہیں، بلکہ بیضاء ہے، یہ نور اور روشنی کا مینار ہے، ہمارے سورج کے لیے رات ہے، جس میں سورج چھپ جاتا ہے، لیکن دین وہ سراج اور ایسا سورج ہے، جس کے لیے کوئی رات نہیں، یہ دن میں بھی روشن ہے اور رات میں بھی روشن ہے، اس کا عقیدہ، منہج، خلق، عمل سب کچھ واضح ہے، جب یہ واضح ہے تو پھر مانتے کیوں نہیں؟ " لا يزيغ عنها إلا هالك" وہی شخص اس سے برگشتہ ہوگا، جس کے مقدر میں اللہ کا خوف نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ نے تقدیر میں لکھ دیا ہو کہ اس شخص کو تباہ اور ملیا میٹ کر دینا ہے، اتنی روشن اور کھلم کھلی دعوت کو نہیں مانتے اور خواہ مخواہ کی پیچیدگیوں کو مول لے لیتے ہیں!

عقیدے کا معاملہ دوٹوک ہوتا ہے:

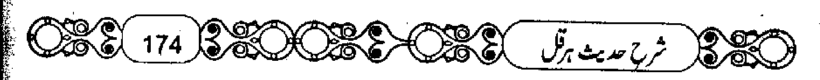
ان لوگوں کے عقیدے دیکھیں، ہر عقیدہ کسی تاویل سے ثابت ہوتا ہے، چونکہ

[1] سنن ابن ماجه، برقم (٤٣) مسند أحمد (١٢٦/٤) نیز دیکھیں: السلسلة الصحيحة (٩٣٧)

چنانچہ سے ثابت ہوتا ہے، یہ ایسا وہ ایسا لہٰذا یہ ثابت ہوگیا، عقیدے کا معاملہ غلط ہوگیا، عقیدے کا معاملہ دوٹوک ہوتا ہے، اور دوٹوک دلیل سے ثابت ہوتا ہے، لا إله إلا الله کتنی واضح بات ہے؟ کوئی پیچیدگی اور کوئی ابہام اس میں ہے؟ ابہام تو ان لوگوں کے نزدیک ہے، جو خود پیدا کرتے ہیں اور خود ہی اس کا شکار ہوتے ہیں، ورنہ کلمہ " لا إله إلا الله " میں " لا "کی تلوار ہر گردن پر چلتی ہے، کوئی معبود نہیں، صرف ایک اللہ ہے، کتنا واضح اور دوٹوک عقیدہ ہے؟ کتنی واضح بات ہے؟ ایک مشترک دعوت ہے، قرآن کی بھی، تورات کی بھی اور انجیل کی بھی، ﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا ﴾ اگر اس دعوت کو نہیں مانتے، اس سے اعراض کرتے ہیں اور منہ پھیرتے ہیں: ﴿ فَقُوْلُوْا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴾ تو ان سے کہہ دو کہ تم اگر نہیں مانتے، تو نہ مانو، لیکن گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔

اتمام حجت:

اس کا معنی یہ ہے کہ ان تین چیزوں کے ساتھ مخالف پر، جس کو دعوت دی جا رہی ہے، حجت قائم ہوجاتی ہے، تین چیزوں پر اکتفاء کرنا چاہیے، ان لوگوں کے منہج کو ہم نہیں مانتے، جو کسی کو سمجھانے کے لیے اپنی عقل سے کام لیتے ہیں، اللہ کا ثبوت عقل سے! رسولوں کا ثبوت عقل سے، نہیں! عقل نہیں، دین نقل ہے، ان تین چیزوں کی دعوت دے کر ہم نے تم پر حجت قائم کردی اور اللہ کا پیغام پہنچادیا، اب تم مانو یا نہ مانو، مان لوگے تو بہتر ہے، دوہرا اجر ملے گا، نہیں مانو گے، تو گواہ رہو، ہم تو مسلمان ہیں، ہم تو مانتے ہیں کہ صرف ایک اللہ کی عبادت ہوگی، کوئی شریک نہیں اور کوئی رب نہیں، لہٰذا ان تین چیزوں کو پیش کر دیا جائے، تو حجت قائم ہو جائے گی۔



مکتوب نبوی میں جامعیت:

یہ نبی ﷺ کا خط ہے، اس ایک خط میں سب کچھ آ گیا اور پورا دین آ گیا، دعوت دین کی اساس آ گئی، اس دعوت کو قبول کر کے دنیا میں کیا فائدہ ہوگا؟ آخرت کا کیا فائدہ ہے؟ قبول نہ کرنے پر کیا نقصان ہے؟ اور پھر یہ خط صرف قرآن کی دعوت کو پیش نہیں کرتا، ان دوسطروں نے منہج قرآنی کو پیش کر دیا، حتی کہ تورات اور انجیل کی دعوت کو پیش کر دیا۔

اس ایک ہی خط میں پیغمبر ﷺ کا منصب، پیغمبر ﷺ کا مقام اور دعوت کی حکمت ایسے اہم مسائل آ گئے۔

ردِعمل:

چنانچہ خط پڑھ دیا گیا، پورے دربار نے سن لیا، ابوسفیان کا کہنا ہے:

"فکثر عنده اللغط، وارتفعت الأصوات"

خط پڑھا گیا، تو خط پڑھتے ہی آوازیں آنے لگی۔

"لغط" ان آوازوں کو کہتے ہیں، جو سنائی دیں، لیکن سمجھ میں نہ آئے، کیا باتیں ہو رہی رہیں؟ اب سب باتیں کر رہے ہیں، کوئی اعتراض کر رہا ہے اور کوئی چیخ چلا کر انکار کر رہا ہے کہ یہ ہمارے دین، ہمارے مذہب اور ہماری دعوت کے خلاف ہے، ایک شور برپا ہو گیا۔

ابوسفیان کا تجزیہ:

ابوسفیان کا کہنا ہے کہ اس کے بعد ہمیں ہرقل کے دربار سے نکال دیا گیا، جب ہمیں نکال دیا گیا اور ہم الگ ہوئے، تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

"لقد أمر أمر ابن أبي كبشه" کہ ابن ابی کبشہ کا دین اور اس کا معاملہ

یہاں چھا چکا ہے، میں نے یہ محسوس کرلیا ہے: "يخاف منه ملك بني الأصفر" روم کا بادشاہ محمد (ﷺ) سے ڈر گیا۔اس کی ہیبت یہاں طاری ہوچکی ہے، ایوانِ روم میں لرزہ طاری ہے، ہرقل کی پیشانی پر ہم نے پسینہ بہتے ہوئے دیکھا ہے۔

ابوسفیان کے قبول اسلام کا سبب:

ابوسفیان کہتا ہے: "فما زلت موقنا به"

اس سارے منظر کو دیکھ کر میرے دل میں بھی یقین کی ایک چنگاری روشن ہوگئی کہ محمد ﷺ سچا ہے، لیکن میں نے قبول نہیں کیا، ایک چنگاری جل گئی اور ایک یقین پیدا ہوگیا کہ یہ سچائی اور صداقت ہے، یہ اللہ کا سچا نبی ہے، جس نبی کو ہم تکلیفیں دیتے ہیں، ان کے راستے میں کانٹے بچھائے، گڑھے کھودے، تین تین سال سوشل بائیکاٹ کیا، سجدے کی حالت میں اوجھڑی پھینکی، ساتھیوں کو ان کے سامنے مارا اور تنگ کیا، ان پر کھولتا ہوا پانی ڈالا، ہم اس کو جادوگر اور دیوانہ کہتے رہے، لیکن ہرقل کے ایوانوں کا لرزہ اس بات پر شاہد عدل ہے کہ محمد ﷺ سچا ہے، میرے دل میں یقین کی چنگاری روشن ہوگئی اور رفتہ رفتہ یہ آگ بڑھتی گئی۔ "حتى أدخل الله علي الإسلام" حتی کہ اللہ نے مجھ پر بھی اسلام داخل کر دیا اور میں نے اسلام قبول کرلیا۔

لمحۂ فکریہ:

تو یہ اس خط کا متن ہے، جو ہرقل کے دربار میں پڑھا گیا، یہ خط حقیقت میں ایک دعوت ہے، جس میں نبی ﷺ نے روم کے بادشاہ کو دعوت دی، تو یہ دعوت کن امور پر مشتمل ہے؟

یہ ان تمام لوگوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے، جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو پوجتے ہیں، یہ درگاہیں، یہ قبریں، یہ آستانے، یہ قبے اور یہ تقلید شخصی کے بت ان سب کو توڑ کر دین خالص کی طرف آجاؤ، ایک اللہ کی عبادت ہو اور محمد ﷺ کی سچی غلامی اور

آپ کی اطاعت ہو، اس خط میں ان تمام علائق کو توڑ پھوڑ دیا اور واضح کر دیا اور منہج صدق بتا دیا ہے، منہج حق یہ ہے کہ معبود حق صرف ایک اللہ ہے، باقی سب معبود باطل ہیں اور اطاعت صرف محمد رسول اللہ کا حق ہے اور کسی کا نہیں، ورنہ یہ دین ملاوٹی دین بن جائے گا، دین خالص تب تک ہے، جب تک اللہ کی وحی پہ اعتقاد ہو اور اللہ کی وحی پر اتفاق ہو، جب دوسروں کی باتیں آئیں گی، تو ملاوٹیں شروع ہو جائیں گی اور اللہ تعالیٰ ایسے دین کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔

دعوت عام:

یہ دعوت صرف ہرقل کے لیے نہیں، یہ دعوت عام ہے، اس پر توجہ دو، اس دعوت کو عام کرو، حقیقت یہ ہے کہ دین کے غلبہ اور حاکمیت کا یہی راستہ ہے، باقی تنظیمیں بناؤ، جماعتیں بناؤ، اقامت دین کے نعرے لگاؤ، بے تحاشا خرچ کر دو، کچھ نہیں ہوگا، جب تک اساس حاصل نہ ہو اور وہ اساس کیا ہے؟ ایک اللہ کی عبادت ہو اور محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہو، بس!

یہاں سے انحراف ہوگا، تو کچھ بھی ہو جائے، کبھی غلبہ اور کامرانی حاصل نہیں ہو سکتی، اس لئے اللہ پاک نے فرمایا:

﴿ يَأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ ﴾ [المائدة: ٥٤]

اے لوگو! اگر تم سب مرتد ہو جاؤ، تو اللہ تعالیٰ دین کو دوبارہ غالب کرنے پر قادر ہے۔

دین کیسے غالب ہوگا؟:

اللہ تعالیٰ ایسے کرے گا کہ ایک جماعت کو پیدا کرے گا، اس جماعت کی خوبی کیا ہوگی؟ پیسوں سے مالا مال ہوگی! نہیں، اس جماعت کی خوبی کیا ہوگی؟ دنیا کے

وسائل ہوں گے؟ نہیں، ﴿ يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ ﴾ اس کو اللہ سے محبت ہوگی اور اللہ کو اس جماعت سے محبت ہوگی، اور محبت کی اساس کیا ہے؟

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ ﴾ [آل عمران: ۳۱]

اگر اللہ کی محبت چاہتے ہو، تو میری غلامی قبول کر لو، یعنی اللہ کے پیغمبر کی اطاعت کرو۔

ان نصوص کو اگر جمع کریں، تو دین کے انقلاب اور دین کی اقامت کا کام اگر کسی جماعت کے لیے ممکن ہے، تو وہ جماعت اہل حدیث ہے، بس! باقی سب کے سب پاس علائق، تقلید اور فلاں فلاں ہے، سچا دین صرف جماعت اہلحدیث کے پاس ہے، نہ کوئی شخصیت ہے، صرف امام محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، ایک ہاتھ میں قرآن ہے، ایک ہاتھ میں حدیث ہے، اس دعوت میں کوئی جھول نہیں۔

اللہ اس قوم کے ذریعے دین کو غالب کرے گا، بس اللہ اس جماعت کو توفیق دے، اس کو ہدایت دے، غلطیاں ہیں، تو اصلاح کا موقع دے اور اصلاح کی توفیق دے دے۔

ابن ناطور کا قول:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس قصے کو نقل کرنے کے بعد اسی سند سے ابن ناطور کا قول پیش کیا ہے، ''ناطور'' عبرانی زبان میں اس شخص کو کہا جاتا ہے، جو باغات کی نگرانی پر مامور ہو، یہ ہرقل کی طرف سے اس کے باغات اور اس کی زمینوں کی نگرانی پر مامور تھا اور اس کا بیٹا، جو دین مسیحیت میں بڑا دین دار تھا، بہت بڑا عالم تھا اور ہرقل کے نزدیک صاحب الرائے تھا، اسے ہرقل کا بڑا قرب حاصل تھا، آگے اس کا بیان شروع ہوتا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہرقل ایلیاء میں تھا، ''ایلیاء'' عبرانی زبان میں بیت

المقدس کو کہتے ہیں، وہ چھ ہجری میں اس خط کے آنے سے پہلے بیت المقدس فلسطین میں موجود تھا۔

رومیوں کی فتح اور فارس کی شکست:

یہ ایلیاء میں ایرانیوں کے ساتھ جنگ کے تعلق سے موجود تھا، بلکہ فارس کو شکست دے چکا تھا اور یہ بڑی خوشی کی خبر تھی، ہرقل کے لئے بھی اور مسلمانوں کے لیے بھی، مسلمان بھی چاہتے تھے کہ رومیوں اور فارسیوں کی جنگ میں رومیوں کو فتح ہو، کیونکہ فارسی مجوسی تھے اور آتش پرست تھے اور رومی عیسائی اہل کتاب تھے، جو بہر کیف ان سے بہتر تھے اور اس کے برعکس کفار قریش یہ چاہتے تھے کہ فارسیوں کو فتح نصیب ہو، کیونکہ فارسی روز آخرت اور قیامت کے منکر تھے، اس لحاظ سے ان میں اور فارسیوں میں تشابہ تھا، لیکن مسلمانوں کی خواہش یہ تھی کہ رومی غالب آجائیں، ابتدائی جنگ میں فارسی غالب آگئے تھے، جس سے کفار مکہ خوش ہوئے اور مسلمان پریشان ہوئے، مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْۤ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۝ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ﴾ [الروم: ١-٤]

رومی مغلوب ہوگئے، یہ اللہ کا امر ہے، لیکن چند سالوں میں رومی غالب آجائیں گے، چنانچہ اس شکست کے تقریباً چھ سال کے بعد رومیوں کو غلبہ نصیب ہوا اور یہ چھ ہجری کا واقعہ ہے، جس میں مسلمانوں نے کفار قریش کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر دس سال جنگ نہ کرنے کی صلح کی تھی، جس کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فتح مبین تصور کرتے تھے، کیونکہ اس صلح سے دعوت کا راستہ ہموار ہوگیا، بڑے بڑے وفود اور قبائل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اسلام قبول کیا اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے

داعی مختلف علاقوں میں دعوت دین کے لیے بھیجے اور دوسری خوشی کی بات فتح خیبر تھی اور تیسری خوشی کی بات رومیوں کا فارسیوں پر غلبہ تھا۔

ابن ناطور کا بیان:

چنانچہ ہرقل ایلیاء یعنی بیت المقدس میں اسی تعلق سے موجود تھا کہ ایک دن ابن ناطور کہتا ہے: " أصبح يوماً خبيث النفس " ہم نے ہرقل کو ایک دن صبح کے وقت دیکھا کہ وہ خبیث النفس ہے، وہ بڑی بری حالت میں ہے، اس کے چہرے پر بڑی پریشانی اور بڑے گہرے کرب کے آثار ہیں، تو ہم نے حاضر ہو کر عرض کیا: "استنكرنا هيئتك" کہ آج ہم آپ کے چہرے پر بڑی ناگواری، بڑی پریشانی اور بڑے کرب کا اظہار اور برے آثار دیکھ رہے ہیں، کیا معاملہ ہے؟ ابن ناطور کہتا ہے: " وكان هرقل حذاء " ہرقل حذاء تھا، "حذاء" کا معنی کاہن ہے، یعنی اسے کہانت میں بھی بڑی دسترس حاصل تھی۔

کاہنوں کے اخباری مصادر:

کاہنوں کے دو اخباری مصادر ہوتے ہیں، ایک مصدر ستاروں کا علم یعنی علم نجوم، وہ ستاروں سے، ان کے اجتماع سے اور ان کی رفتار سے واقعات کا اندازہ لگاتے ہیں اور ان کا دوسرا طریق خبر شیاطین ہوتے ہیں، اس دور میں ان کی کرسیاں آسمانوں کے قریب لگی ہوتی تھیں، ان نشستوں پر جا کر وہ بیٹھتے اور آسمانوں کی خبریں، جو باتیں فرشتے اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کے تعلق سے کرتے، وہ ان فیصلوں کو سننے کی کوشش کرتے، ایک آدھ جملہ ان کے کانوں میں پہنچ جاتا اور وہ زمین میں آ کر ان کاہنوں تک اسے پہنچا دیتے، پھر وہ کاہن آگے بیان کرتے، تو ان کاہنوں کے یہ دو اخباری ذرائع تھے اور ہرقل بھی کاہن تھا۔

ہرقل کی کہانت:

چنانچہ وہ آج کی صبح کو خبیث النفس پریشان تھا اور اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے، ابن ناطور کہتا ہے کہ ہم نے پوچھا یہ پریشانی کیوں ہے اور یہ کرب کے آثار کیوں ہیں؟ تو اس نے کہا کہ "إني رأيت الليل لما نظرت في النجوم" رات جب میں نے ستاروں کو دیکھا، تو میرے علم کہانت نے مجھے اس بات سے آگاہ کیا کہ "أن ملك الختان قد ظهر "اب اس زمین پر اس بادشاہ کی حکومت آئیگی، جس بادشاہ کی قوم ختنہ کرتی ہے، ختنہ کرنے والی قوم کی حکومت آنے والی ہے، رات کو یہ بات مجھے سجھائی دی ہے، یہ خبر یا تو نجوم اور ستاروں کی ترکیب سے حاصل کی یا شیاطین کے القاء سے حاصل کی کہ اس زمین پر بادشاہت، غلبہ اور سطوت اس بادشاہ کا ظاہر ہونے والا ہے، جس کی قوم کا تمیز یہ ہے کہ وہ قوم ختنہ کرتی ہے۔

ہرقل کی جستجو:

ہرقل نے کہا کہ یہ کون بادشاہ ہے؟ جو ہمارے ایک عرصہ کے چھائے ہوئے سکہ کو کاٹ دے گا اور اس کی حکومت قائم ہو جائے گی؟ یہ ہماری حکومتیں کہاں جائیں گی؟ ہم جن وسائل سے مالا مال ہیں، ان کا کیا ہوگا؟ تو اس نے کہا:

" فانظروا من يختتن في هذه الأرض "

''پتا لگاؤ کہ اس زمین کی پشت پر ختنہ کرنے والی قوم کون سی ہے؟''

تو اس کی شوریٰ نے جواب دیا کہ ختنہ تو ہمارے علم کے مطابق ایک ہی قوم کرتی ہے اور وہ یہودی ہیں اور یہودی ہمارے ماتحت ہیں، ان میں اس قدر صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اتنی بڑی طاقتوں کو شکست دے کر غلبہ حاصل کر لیں، وہ تو ہر مقام پر ذلیل اور ہمارے زیر دست ہیں، وہ تو اٹھ ہی نہیں سکتے، ان میں نہ وہ صلاحیت ہے، نہ وہ کمال

ہے، نہ وہ طاقت ور ہیں، نہ وہ جرأت مند ہیں، تو یہودیوں سے ہمیں کیا خوف؟

اگر پھر بھی تمہارا علم اس بات پر مصر ہے کہ ختنہ کرنے والی قوم غالب آسکتی ہے، تو اپنی تمام ریاستوں میں یہ خط لکھو اور ہر ریاست کے گورنر کو حکم دو کہ اپنے علاقے سے ایک ایک یہودی کو چن کر قتل کر دو، اس میں ڈرنے کی کوئی بات ہی نہیں، یہود میں اتنی جرأت ہی نہیں کہ وہ اتنی بڑی طاقت سے ٹکرا سکیں اور ان کا معاملہ غالب آجائے، مگر پھر بھی کوئی اندیشہ ہے، تو یہ مٹھی بھر لوگ ہیں چند دنوں میں ان کا صفایا کر دیا جائے گا، تاکہ یہ اندیشہ ختم ہو جائے۔

مکتوب نبوی کی آمد:

یہ گفتگو جاری تھی کہ ہرقل کے ایک گورنر نے، جو بصرہ کا گورنر تھا، ایک شخص کو بھیجا، یہ شخص اللہ کے پیغمبر ﷺ کا صحابی تھا، جس کے ذریعے بصریٰ کے گورنر تک یہ خبر پہنچی تھی کہ ایک نبی ظاہر ہو چکا ہے اور وہ نبیٔ برحق ہے، اللہ کا سچا رسول ہے، بصریٰ کے گورنر نے اسی کے ہاتھوں ہرقل تک خط پہنچایا کہ ایک نبی ظاہر ہو چکا ہے، جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، کچھ لوگ اس پر ایمان لا چکے ہیں اور کچھ اس کی تکذیب کرتے ہیں اور ایمان لانے والوں اور مکذبین کے مابین لڑائیاں بھی ہو رہی ہیں، کبھی یہ جیتتے ہیں، کبھی وہ جیتتے ہیں اور پوری خبر تمہیں یہ پہنچا دے گا۔

قاصدِ نبوی دربارِ روم میں:

وہ نبی ﷺ کا صحابی تھا، اس کا نام مذکور نہیں ہے، ہرقل نے، جس پر ایک خوف طاری تھا، کہا کہ اس شخص کو چیک کرو، اس کا ختنہ چیک کرو، چنانچہ اسے خلوت میں لے گئے، اسے دیکھا گیا اور ہرقل کو خبر دی گئی کہ اس کا ختنہ ہوا ہے، ہرقل نے کہا کہ اس سے پوچھو کہ تم عرب کے علاقے سے ہو، کیا عرب بھی ختنہ کرتے ہیں؟ اس

نے جواب دیا کہ ہاں عرب بھی ختنہ کرتے ہیں۔ ہرقل نے کہا تو پھر اے قوم یہ بات سن لو کہ جس بادشاہ کی اطلاع مجھ تک پہنچی تھی، ختنہ کرنے والی قوم کا بادشاہ، جس کا معاملہ اس زمین پر چھا جائے گا اور کسریٰ اور قیصر کی حکومتوں کا خاتمہ کر کے جس کی سطوت اور غلبہ اس زمین پر قائم ہو جائے گا، وہ شخص محمد (ﷺ) ہے!

ضغاطر کی رائے:

ملک شام میں ایک شخص ضغاطر تھا، جس کا علم اور فراست ہرقل جیسی ہی تھی، بلکہ ہرقل اسے اپنے سے بہتر عالم قرار دیتا تھا، اس نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔

چنانچہ ہرقل نے اس کو خط لکھا اور اس کی رائے معلوم کی، اسے خط لکھ کر ہرقل سرزمین ایلیا سے حمص آ گیا، حمص ان دنوں ملک شام کا دارالخلافہ تھا، بعد میں دمشق دارالخلافہ ہو گیا، لیکن پہلے دارالخلافہ حمص تھا اور حمص کو ۱۶ھ میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فتح کر لیا گیا، جس کے فاتح ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ تھے۔

ہرقل حمص آ گیا اور حمص پہنچتے ہی اسے ضغاطر کا خط موصول ہوا، تو اس نے کہا کہ ہم نے جو تورات اور انجیل پڑھی، اس نبی کے دور اور اس نبی کی خوبیوں کے حوالے سے وہ سب کی سب صفات پوری طرح اس شخص پر منطبق آ رہی ہیں اور میں اس پر ایمان لا چکا ہوں، تم بھی ایمان لے آؤ۔

اہل روم کو ہرقل کی دعوت:

اب ہرقل نے بھی یقین کر لیا کہ یہ اللہ کا سچا نبی ہے، چنانچہ اس نے اپنے محل کا دروازہ بند کر لیا اور اپنی کابینہ کے خاص افراد کو جمع کیا، اس میں اس کی شوریٰ اور اس کے وزراء تھے، اس نے کہا:

"هل لكم في الفلاح والرشد، وأن يثبت لكم ملككم؟"

اے میرے ساتھیو! کیا تم چاہتے ہو کہ دنیا اور آخرت کی فلاح اور کامیابی تمہیں نصیب ہوجائے اور تمہارا یہ ملک تمھارے لیے ثابت اور محفوظ رہے؟ تو آؤ اس نبی کی اتباع کرلیں، کیونکہ یہ اللہ کا سچا نبی ہے۔

اہل روم کا ردعمل:

ہرقل کی یہ بات سنی تھی کہ اس کی پوری کابینہ جوش میں آگئی اور انہوں نے نفرت کا اظہار کیا: "حاصوا حیصة الحمر الوحش"

اس طرح چنگھاڑنے لگے، جیسے جنگلی گدھا چھنگاڑتا ہے۔ جو گھریلو گدھے ہوتے ہیں، ان کی چھنگاڑ کم ہوتی ہے، آواز ان کی بھی کریہہ ہوتی ہے، مگر کم ہوتی ہے، لیکن جنگلی گدھوں کی چنگھاڑ انتہائی مکروہ اور خوفناک ہوتی ہے اور گدھا اس لئے کہا کہ انہوں نے گدھے پن کا ثبوت دیا تھا، بات مان لیتے، دعوت قبول کرلیتے تو بہتر تھا، لیکن دعوت کا انکار کر کے وہ گدھے سے بھی بدتر ہوگئے اور دروازوں کی طرف بھاگنے لگے، لیکن دروازے بند تھے۔

ہرقل پھسل گیا:

یہاں ہرقل بھی آکر پھسل گیا، اب تک جو ہم نے سنا، وہ اس کی فراست اور اس کے فہم کی دلیل ہے، مگر یہاں آکر بہک گیا، اس نے حکم دیا کہ سب واپس لوٹ جاؤ اور کہا کہ میں تو تمہیں اسلام اور اس نبی کی غلامی کی دعوت اس لیے دے رہا تھا: "لأختبر شدتکم" میں تو یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم اپنے دین پر قائم ہو یا نہیں؟ میں تو تمہارا امتحان لے رہا تھا، تم سب کے سب قائم ہو، ثابت قدم ہو، تمہیں مبارک ہو۔ لوجی ساری کابینہ راضی ہوگئی، ہرقل کے سامنے سجدے میں گر گئے، اس طرح اس کو اسلام نصیب نہیں ہوا، یہاں تک ہرقل کی بات تھی، صحیح بخاری کی حدیث مکمل ہوئی۔

دروس ونتائج:

اس پورے قصے میں کئی دروس ہیں، کئی باتیں قابل بیان اور قابل غور ہیں:

۱۔ سب سے اہم بات یہ کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی صفات مبارکہ اور خوبیاں کفار کس طرح بیان کرتے ہیں؟ کفار کا ملک ہے، سوال کرنے والا کافر ہے، جواب دینے والا کافر ہے، اس جواب پر تبصرہ کرنے والا کافر ہے اور سننے والے بھی سارے کافر ہیں، ایک بڑی طاقت ور حکومت ہے، لیکن پیغمبر ﷺ کے بارے میں ان کی منصفانہ باتیں، آپ کے اوصاف، آپ کی خوبیاں کس طرح کفار کی زبان پر تھیں؟

" الفضل ما شهدت به الأعداء " فضیلت تو وہ ہے، جس کی دشمن بھی گواہی دیں، چنانچہ یہ سارا دشمنوں کا اجتماع ہے اور وہ اللہ کے پیغمبر ﷺ کی خوبیوں کی گواہی دے رہے ہیں، سب سے بڑی نبی ﷺ کی سیرت طیبہ، آپ کی صفات مبارکہ اور آپ کی خوبیاں اس حدیث سے نمایاں ہوتی ہیں کہ کفار بھی کس طرح آپ کی خوبیوں کا اقرار کرتے ہیں۔

۲۔ دوسرا کفار نے اس بات کا اقرار کیا کہ یہ اللہ کے سچے نبی ہیں:

﴿ فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ﴾ [البقرہ: ۸۹]

''جس نبی کو یہ جان چکے تھے کہ یہ واقعی اللہ کے نبی ہیں، جب وہ ایک داعی کی حیثیت سے ان کے سامنے پہنچا، تو انہوں نے انکار کر دیا۔''

لیکن نبی کی حقانیت کو جانتے تھے، ان کی صداقت کو وہ پہچانتے تھے کہ وہ اللہ کے سچے نبی ہیں: ﴿ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ ﴾[البقرہ: ١٤٦]

'' وہ نبی کی صداقت کو اس طرح پہچانتے تھے، جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔''

۳۔ لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا، تو قبول کیوں نہیں کیا؟ اس لئے کہ ہدایت دینا یا نہ دینا اللہ کے اختیار میں ہے، یہ کسی بندے کے اختیار میں نہیں، یہ بھی ایک درس ہے۔

چنانچہ ہرقل اور ضغاطر دونوں علم اور فراست میں مساوی تھے، لیکن ہرقل نے دعوت قبول نہ کی اور ضغاطر نے قبول کر لی، ہدایت اللہ دیتا ہے، نبی ﷺ مکہ کے معاشرہ میں دعوت دے رہے ہیں اور آپ کا سگا چچا ابولہب اس کا انکار کر رہا ہے، دعوت کو قبول نہیں کر رہا، حسن و جمال کا پیکر، اس کی چمڑی سرخ رنگ کی ہے، لہب آگ کے انگارے کو بولتے ہیں، اس لئے کہ وہ انگارے کی طرح سرخ و سفید تھا، خون ڈھلکتا تھا، خوبصورت چہرہ اور خوبصورت جسامت تھی، لیکن جہنم کا ایندھن بن گیا، اللہ نے ہدایت نہیں دی، کیوں نہیں دی؟ یہ بات اللہ جانتا ہے اور کالی چمڑی والا بلال حبشی! اس کو ہدایت نصیب ہوگئی، کیوں ہوگئی؟ یہ بات اللہ جانتا ہے۔

ہدایت اور گمراہی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ بھی اس واقعے کا درس ہے، ابو طالب آپ پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار ہے، اپنا مال خرچ کرتا ہے، کفالت کرتا ہے۔ مدد کرتا ہے، حفاظت کرتا ہے اور نبی ﷺ پورے اخلاص کے ساتھ اسے دعوت دے رہے ہیں، اللہ نے توفیق نہیں دی، کیوں نہیں دی؟ یہ اللہ جانتا ہے، یہ بات اللہ کا راز ہے، جسے ہدایت دیتا ہے، کیوں دیتا ہے؟ یہ اللہ کا راز ہے، جسے نہیں دیتا کیوں نہیں دیتا؟ وہ اللہ کا راز ہے۔

جنت کے قابل کون ہے؟ وہ اللہ جانتا ہے، یہ جنت کے قابل کیوں ہے؟ وہ اللہ کا راز ہے، جہنم میں کون جائے گا؟ وہ اللہ جانتا ہے، وہ جہنم میں کیوں جائے گا؟ وہ اللہ کا راز ہے۔

ابو طالب کو ہدایت نصیب نہیں ہوئی، نبی ﷺ بستر مرگ پر اسے دعوت دیتے

ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ ﴾ [القصص:٥٦]
جس سے آپ محبت کرتے ہیں، آپ تو اسے ہدایت دینے کا اختیار نہیں رکھتے، دوسروں کی بات ہی چھوڑو، جن کی آپ کو چاہت ہے، آپ تو اسے بھی ہدایت نہیں دے سکتے، یہ تو اللہ کا کام ہے۔
چنانچہ ابو طالب ہمارا مطلوب نہیں ہے، کیوں نہیں؟ یہ ہم جانتے ہیں، یہ کوئی انسان نہیں جانتا، یہ تقدیر کے اٹل فیصلے ہیں، جن کو کوئی توڑ نہیں سکتا، ہاں ہمارا مطلوب تو وہ ہے، جو فارس کی سرزمین سے نکلا، ہدایت کی جستجو میں دھکے کھا رہا ہے، ٹھوکریں کھا رہا ہے، کوڑیوں کے عوض بک رہا ہے، کبھی کسی کی غلامی کر رہا ہے، کبھی کسی کی غلامی کر رہا ہے، اسے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ جو نبی برحق ہے اور آنے والا ہے، اس کی تین خوبیاں ہیں، ایک یہ کہ اس کی دعوت کا مرکز وہ سرزمین ہوگی، جو کھجوروں کے باغات میں گھری ہوئی ہے، دوسرا اس کی پشت پر مہر نبوت ہوگی، تیسرا وہ صدقہ قبول نہیں کرتا، ہدیہ اور تحفہ قبول کر لیتا ہے۔
ملک فارس سے نکلا دنیا کو وہ نہیں جانتا تھا، رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں، فرمایا کہ وہ ہمارا مطلوب ہے، کیوں ہے؟ وہ ہم جانتے ہیں، بالآخر وہ کھجوروں کی سرزمین تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا، ایک نشانی پوری ہوگئی، وہ ایک دن اس نبیٔ برحق کے پاس جاتا ہے، کھجوروں کی بوری سر پر ہے اور کہا کہ یہ صدقہ لے کر آیا ہوں، آپ کھا لیجئے، آپ نے صحابہ کو بلایا اور کہا کہ تم کھاؤ، اللہ کا نبی صدقہ نہیں کھاتا، دوسرے دن کھجوروں کی بوری لے کر پھر آ گیا اور کہا کہ یہ ہدیہ ہے، آپ نے اسے کھولا اور خود بھی تناول فرمائیں اور صحابہ کو بھی کھلائیں، دو نشانیاں پوری ہوگئیں، نبی ﷺ نے محسوس کیا کہ یہ شخص پیچھے کی طرف جھانک کر کچھ دیکھ رہا ہے، آپ سمجھ گئے، اپنی

پشت مبارک سے کپڑا ہٹا دیا، اس نے مہر نبوت دیکھ لی اور کہا:

" أشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، وأشهد أن محمدا رسول الله "

یہ آنے والا کون ہے؟ وہ جو اپنا نسب بھول چکا ہے، لوگ پوچھتے ہیں کیا نام ہے؟ کہتے ہیں، سلمان فارسی، لوگ پوچھتے ہیں باپ کا نام کیا ہے؟ کہتے میرا باپ تو اسلام ہے، اپنے باپ کا نام فراموش کر چکا ہے، فخر کس چیز پر ہے؟ کہا کہ ایک دن نبی ﷺ نے ایک جملہ کہا تھا: " سلمان منا أهل البيت " اے میرے گھر والو! سلمان فارسی میرے فخر کی بنیاد ہے۔ فرمایا کہ یہ ہمارا مطلوب ہے، جو فارس کی سر زمین سے نکلا اور دھکے کھاتا کھاتا ایک لمبا سفر طے کرتے ہوئے مدینہ منورہ پہنچا۔[1]

اللہ نے کہاں سے اٹھایا؟ کہاں پہنچایا؟ ہدایت دینا اللہ کا کام ہے۔

۴۔ اور چوتھی بات یہ ہے کہ آپ دیکھیں نبی بننے سے پہلے نبی ﷺ کا چرچا ایک ایک زبان پر آچکا تھا، یہودی، عیسائی اپنی کتابوں میں یہ بات پڑھ چکے تھے کہ ایک نبی آنے والا ہے اور یہ اس کی خوبیاں ہیں، فلاں سرزمین میں ہوگا، فلاں دور ہوگا، فلاں زمانہ ہوگا، اسی طرح کہانت سچی ہو یا جھوٹی ہو، کاہنوں کو بھی اپنے علم اور شیاطین کے القاء سے یہ خبر مل چکی تھی کہ سچا نبی آنے والا ہے، اللہ کا آخری نبی آنے والا ہے، چنانچہ آپ کے نبی بننے سے پہلے آپ کی نبوت کا چرچا ایک ایک زبان پر تھا، سچوں کی زبانوں پر بھی تھا، جھوٹوں کی زبانوں پر بھی تھا، یہودی بھی جانتے تھے، کاہن بھی جانتے تھے، عیسائی بھی جانتے تھے، صحیح لوگ بھی جانتے تھے، غلط لوگ بھی جانتے تھے۔

جس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کی حجت قائم ہو چکی تھی، آپ کے ظہور سے پہلے ہی

---

[1] سير أعلام النبلاء (١/ ٥٠٦)

اللہ کی حجت قائم ہو چکی تھی اور نبی آنے کی خبر ہر زبان پر عام ہو چکی تھی کہ ایک نبی آنے والا ہے اور ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے، گویا آپ کی نبوت سے قبل ہی آپ کے نبی بننے کی خبر آ چکی تھی اور لوگ پہچان چکے تھے، اللہ کی حجت قائم ہو چکی تھی، جس کا معنی یہ ہے کہ وہی اللہ کا نبی ہے، اب باقی سارے ذرائع اور طرق بند ہو چکے ہیں، شیاطین اور جن اپنی کرسیاں لگائے آسمانوں کا ترصد کیا کرتے تھے، کوئی خبر ہم تک پہنچ جائے، کوئی راز ہم تک پہنچ جائے، کیونکہ اللہ رب العزت جب کوئی فیصلہ فرماتا ہے، اس فیصلے کی اطلاع فرشتوں کو ہوتی اور پھر فرشتے ایک دوسرے کو اس فیصلے سے آگاہ کرتے۔

تو بعض اوقات فرشتوں کا کوئی جملہ شیاطین تک پہنچ جاتا، تو کچھ نہ کچھ آسمانوں کی خبر اس راستے سے زمین پر آ رہی تھیں، لیکن جب نبیؐ آخر الزماں کے ظہور کا وقت آ گیا، اللہ نے ان کرسیوں کو توڑ دیا، اب جو بھی آسمانوں کا قصد کرتا، شہاب ثاقب کے ذریعے ان کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا، تو یہ جن بھی حیران و پریشان تھے، یہ خبریں کیوں بند ہو گئیں؟ کچھ آسمانوں کے راز آتے تھے، کچھ خبریں ملتی تھیں، زمین والوں کا بھلا ہو جاتا تھا، اللہ تعالیٰ کیا چاہتا ہے؟ کیا زمین کا بگاڑ چاہتا ہے اور زمین کی تباہی چاہتا ہے؟ اس کا معنی یہ ہے کہ جن بھی اس بات کو جانتے تھے کہ زمین والوں کی خیر اور زمین والوں کی عافیت آسمانوں کی خبر پر ہے، کچھ خبریں آتی ہیں اور کچھ پہنچ جاتی ہیں، ان کا بھلا ہو جاتا ہے، اب یہ خبریں کیوں بند ہو گئیں؟ کیا اللہ رب العزت زمین والوں کی بربادی کا فیصلہ فرما چکا ہے یا زمین کی اصلاح اور زمین کی عافیت کا فیصلہ فرما چکا ہے؟

وہ بھی متحیر ہو کر زمین پر پھیلے کہ آخر کیا انقلاب آ گیا؟ یہ خبریں کیوں بند ہو گئی

ہیں؟ آخر ایک جماعت مکہ پہنچنے میں کامیاب ہوگئی، جہاں محمد ﷺ اپنے مٹھی بھر صحابہ کے ساتھ تشریف فرما ہیں اور قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں، قرآن کی تلاوت کی آواز جنوں نے سنی، تو جن وہاں ٹھہر گئے کہ یہ تو وہی کلام اور وہی تاثیر ہے، جو اللہ کے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کے کلام میں تاثیر تھی، وہی لذت، وہی استماع اور وہی مزا آ رہا ہے، اس کلام کو سننے کے لیے وہ ٹھہر گئے، انہوں نے اس کلام کو سنا اور ایمان ان کے دلوں میں راسخ ہوگیا، انہوں نے وہیں اسلام قبول کرلیا:

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۞ قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ﴾ [الجن: ۱]

جن کہنے لگے کہ ہم نے ایک عجیب اللہ کا کلام سنا، جو صراط مستقیم کی ہدایت دیتا ہے، ہم اس پر ایمان لے آئے، ہم نے توحید قبول کر لی اور شرک سے توبہ کر لی، یہ مٹھی بھر جماعت متحیر اور پریشان تھی۔

ان تک بھی حق پہنچ گیا، تو اللہ کی حجت ہر شخص پر قائم ہوچکی ہے اور پیغمبر ﷺ کی بعثت کے ساتھ ہی ایک ایک زبان پر اس پیغمبر کی بعثت کی خبر ہے، اب کیا معاملہ ہے؟ معاملہ یہی ہے کہ اس پیغمبر کی اتباع کرلو۔

سارے راستے بند ہو چکے ہیں، جادو ٹوٹ چکا، کہانتیں ختم ہوچکیں، شیاطین کی کرسیاں توڑ دی گئیں، آسمانوں کی خبروں کے سارے ذرائع بند ہو چکے ہیں، اب ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ اللہ کی وحی کا ذریعہ ہے اور وہ وحی اس پوری کائنات میں ایک ہی شخصیت پر اترے گی، جس کا نام نامی محمد ﷺ ہے۔

۵۔ اب پوری کائنات کو اسی کی غلامی کرنی ہے، نمازیں پڑھنی ہے، اسی کے طریقے کے مطابق پڑھنی ہیں، ساری زندگی اور سارے امور اسی شخصیت کے طور

طریقے کے مطابق بسر کرنے ہیں، یہ شخصیت ایک مثال، ایک آئیڈیل اور ایک نمونہ ہے، اور قابل اتباع صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور کوئی نہیں، اب نہ کوئی شخصیت ہے، نہ کوئی پیر و مرشد ہے، نہ کوئی فرشتہ اور نہ کوئی جن، نہ کوئی کہانت ہے، کوئی چیز نہیں، سب باطل ہو چکے ہیں اور صرف ایک ہی پیغمبر برحق ہے، اس کی اتباع اور اس کی غلامی پوری کائنات پر ایک فریضے کی حیثیت رکھتی ہے۔

بس میرے دوستو اور بھائیو! یہ ہے معاملہ محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا، سارے راستے ٹوٹ چکے ہیں، اب کوئی پیر و مرشد نہیں اور کوئی لائق اتباع نہیں، لائق اتباع صرف محمد رسول اللہ ہیں اور کوئی نہیں۔

۶۔ اس سیرت کو پڑھو اور اس کے مطابق اپنے کردار، اپنے عمل، عبادات، معاملات کو استوار کرلو اور قائم کرلو، یہ نجات کا راستہ ہے، ورنہ جب قیامت کا دن ہوگا: ﴿ وَ هُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ﴾ [الفاطر: ۳۷]

لوگ جہنم کی آگ میں چیخیں گے، پکاریں گے، آہ و زاری کریں گے اور کہیں گے، یا اللہ ہم کو جہنم سے نکال دے، پھر جہنم سے نکل کر کیا کرو گے؟ ہم جہنم سے نکل کر نیک عمل کریں گے، جو واقعی نیک ہوں گے، نیک عمل پہلے بھی کرتے تھے، لیکن وہ نیک عمل وہ تھے جو ہم اپنی خواہش کے مطابق نیک سمجھتے تھے، عمل پہلے بھی کرتے تھے، لیکن اب جب ہم جہنم سے نکلیں گے، تو واقع ہی نیک عمل کریں گے، جو اللہ کے پیغمبر کی اتباع کے دائرے میں ہیں، لیکن اب کیا فائدہ؟ اب چیخ و پکار کس کام کی؟

﴿ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴾ [الکهف: ۱۰۳] ہم تمہیں بتائیں قیامت کے دن سب سے زیادہ نقصان کن کا ہوگا؟ ان کا ہوگا جو نیک عمل

کرتے ہیں اور یہ سوچ کر کرتے ہیں کہ ہم جو کر رہے ہیں ٹھیک کر رہے ہیں۔

حالانکہ وہ جو کر رہے ہیں غلط کر رہے ہیں، ٹھیک وہ کر رہا ہے، جس کی سوچ یہ ہے کہ کہ ہم جو کر رہے ہیں، اللہ کی وحی کے مطابق کر رہے ہیں، پیغمبر ﷺ کی سنت کے مطابق کر رہے ہیں، جن کو پوری بصیرت اور پورا یقین ہے، نماز پڑھنے کھڑے ہوتے ہیں، تو انہیں پورا یقین ہے کہ اللہ کے پیغمبر نے نماز میں سینے پر ہاتھ باندھے، وہ یہ نہیں کہتے کہ ہمارے بزرگ یہاں باندھتے ہیں، ہم نے بھی یہاں باندھنے ہیں، وہاں باندھتے ہیں، نیچے باندھتے ہیں، یہ تو سب ٹامک ٹوئیاں ہیں، یہ سب کے سب جہالت کے راستے ہیں۔

۷۔ میرے بھائیو! اللہ کی وحی علم ہے اور اللہ کی وحی کے مقابلے میں جو بھی راستے ہیں، وہ جہالت ہے، چاہے وہ کسی کا راستہ ہو، ان کو پورا یقین ہے کہ اللہ کے نبی نے اس طرح نماز پڑھی، اس طرح رکوع کیا، اس طرح سجدہ کیا، رفع الیدین کیا، اونچی آواز سے آمین کہی، ان کو ایک ایک عمل میں صحیح بخاری کی حدیث یاد ہے، صحیح مسلم کا حوالہ یاد ہے، انکا عمل بصیرت کے ساتھ ہے۔

یہ عمل صالح ہے، لیکن وہ بھی عمل کرتے تھے اور سمجھتے تھے ہم ٹھیک ہیں، حالانکہ جو کر رہے ہیں، وہ غلط تھا، ان کے عمل کی بنیاد ایک ایسا علم تھا، جو علم صحیح نہیں تھا، علم نافع نہیں تھا، بلکہ غیر نافع تھا، نبی ﷺ کی دعا ہے:

" اللهم إني أسئلك علم نافعاً " ''اے اللہ! میں تجھ سے علم نافع کا سوال کرتا ہوں۔''

دوسری دعا ہے:" اللهم إني أعوذ بك من علم لا ينفع."

''اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں ایسے علم سے جو نافع نہیں ہے۔''

علم کی دوقسمیں:

لہٰذا علم کی دوقسمیں ہیں:

۱۔ علم نافع ۲۔ علم غیر نافع

ان دونوں علموں میں فرق کیا ہے؟ علم نافع اللہ کی وحی کا علم ہے اور غیر نافع ہر وہ علم جو وحی کے مقابلے میں ہے، بس......!

اہل جہنم کی حالتِ زار:

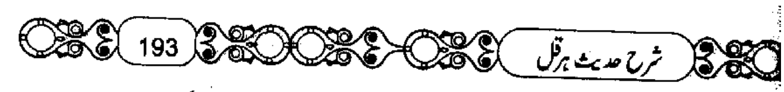
وہ جہنم میں چیخیں گے چلائیں گے، پکاریں گے، یا اللہ ایک موقع دے دے، ہم واقعی نیک عمل کریں گے، وہ نہیں جو پہلے عمل کرتے تھے، وہ نیک نہیں، نیک تو وہ ہے جو اللہ کے پیغمبر ﷺ کے اسوہ اور آپ کے طریقے کے مطابق ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

﴿ أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ﴾

[الفاطر: ۳۷]

ہم نے تمہیں اتنی عمر دی، جو سوچ بچار کے لیے کافی تھی، کسی کو ستر سال، کسی کو اسی سال، کسی کو سو سال اتنی عمر حق تک پہنچنے میں کافی ہوتی ہے، حق کو قبول کرنے میں سوچ کے لیے اور فکر کے لئے اتنی عمر کافی ہے اور دوسری بات یہ کہ ﴿ وَ جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ﴾ سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ میرا پیغمبر تمہارے پاس آچکا تھا، آنکھیں بند کر کے بھی اگر میرے پیغمبر کے دامن کو تھام لیتے، تو سیدھے جنت میں جاتے، لیکن تم نے خود سوچا، اپنی عقل سے پرکھا، نتیجتاً گمراہ ہوگئے۔

میرے بھائی! اللہ کی حجت قائم ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی بعثت اور ظہور سے قبل ہی ایک ایک زبان پر آپ کا تذکرہ جاری کر دیا۔



شیاطین کا القاء ختم ہوگیا، شہاب ثاقب ان کو جلا کر راکھ کر دیتے، سارے راستے بند ہیں، اب ایک ہی طریق اور ایک ہی اساس ہے اور وہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ اور یہ اساس کب تک ہے؟ ایک صدی کے لیے نہیں، دوصدیوں کے لیے نہیں، بلکہ قیامت تک کے لیے ہے اور یہ اساس کس کے لیے ہے؟ صرف علماء ہی کے لیے نہیں، علماء ہوں، عامی ہوں، حاکم ہوں، محکوم ہوں، آجر ہوں، تاجر ہوں، مستاجر ہوں، ملازم ہوں، مرد ہوں، عورتیں ہوں، ان سب کے لیے اساس، اسوہ، نمونہ اور آئیڈیل محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، اس حقیقت کو قبول کر لو، ہرقل نے قبول کیوں نہیں کی؟ اس نے اپنی چودھراہٹ، بادشاہت اور اپنی سرداری کو ترجیح دی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خبردار! دو چیزیں تمہارے دین کو نقصان پہنچاتی ہیں: ایک دنیا کی چودھراہٹ کی محبت، دوسرا دنیا کے مال کی محبت، تو ان محبتوں کو ختم کرو، تاکہ صحیح معنی میں تم حق کو قبول کر سکو اور اللہ کے پیغمبر کی اتباع کر سکو۔

شرح حدیث ہرقل

از

محدث العصر حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ

راویان حدیث:

۱۔ شعیب امام زہری کے شاگردوں میں سے ہیں، امام مالک کے ہم پلہ ہیں۔
۲۔ عبیداللہ وہی ہیں جو فقہاء سبعہ میں شمار ہوتے ہیں۔
۳۔ عبداللہ بن عباس خبر دیتے ہیں کہ اس نے ابوسفیان بن حرب سے سنا۔
۴۔ یہ ابوسفیان امیر معاویہ کے باپ ہیں، جو پہلے حضور ﷺ کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے اور کفار مکہ کی فوج کی کمان بھی ان کے ہاتھ میں تھی، فتح مکہ کے موقع پر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، **مؤلفة القلوب** میں داخل تھے، اس کے بعد حکومت ہی ان کے خاندان میں آ گئی، معاویہ بادشاہ بن گئے۔ پھر ایک وقت آیا کہ ابو سفیان مخلصین میں داخل ہوگئے، مطلب یہ ہے کہ پہلے یہ ضد اور ہٹ دھرمی پر مصر رہے، جب انہوں نے عہد شکنی کی تھی، تو بعد میں جبراً مسلمان ہوئے۔

رومیوں اور ایرانیوں میں نبرد آزمائی:

بطور مقدمہ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ رومیوں اور ایرانیوں میں نبرد آزمائی ہوئی، اس میں میدان مبارزت ایرانیوں کے ہاتھ رہا اور وہ غالب آگئے، ایرانی مذہباً مجوسی تھے، اہل کتاب نہیں تھے، نصاریٰ مجوسیوں کی نسبت مسلمانوں کے زیادہ قریب تھے، اس لئے مسلمانوں کو ایک قسم کا صدمہ ہوا کہ مجوسی غالب آ گئے ہیں، اس فتح پر کافر بڑے خوش ہوئے اور کہنے لگے: اے محمد! اہل ایران جو اہل کتاب نہیں، اہل کتاب نصاریٰ پر غالب آ گئے ہیں، اسی طرح ہم مسلمانوں پر غالب آ جائیں گے، اس پر قرآن پاک کی یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿ الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ وَ يَوْمَئِذٍ

يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ [الروم: ۱، ۲، ۳، ۴]

''رومی مغلوب ہوگئے، سب سے قریب زمین میں اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آئیں گے، چند سالوں میں، سب کام اللہ ہی کے اختیار میں ہے، پہلے بھی اور بعد میں بھی اور اس دن مومن خوش ہوں گے۔''

قرآن مجید کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی:

اس وقت ایرانیوں کی طاقت رومیوں کے مقابلہ میں بظاہر زیادہ تھی، قرآن کی اس پیشین گوئی کے بظاہر کوئی اسباب نظر نہیں آتے تھے کہ ایرانی لوگ مغلوب ہوجائیں گے، ایرانیوں میں بڑے بڑے شہ زور پہلوان تھے، ہزارہا برس سے ان کی حکومت منظم اور مستحکم چلی آرہی تھی، اس کے پیش نظر کافر کہنے لگے کہ تم ہمارے ساتھ ایک شرط باندھ لو، اس وقت شرط لگانی جائز تھی، ابھی تک قمار کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی، شرط قمار ہی کی ایک صورت ہوتی ہے، کافر کہنے لگے کہ تمہارے ساتھی نے کہا ہے کہ رومی چند سال میں ایرانیوں پر غالب آجائیں گے، یعنی مغلوب ہونے کے بعد پھر غالب ہوں گے، چند سال کتنے ہیں؟ اس کے پیش نظر کفار کہنے لگے کہ تین یا پانچ سال کی شرط لگا لو، نبی ﷺ سے اس بات کا ذکر ہوا، آپ نے فرمایا کہ احتیاط کرنی چاہیے، کیونکہ "بضع" کا لفظ سات سال بلکہ دس سال تک بولا جاتا ہے، بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے پانچ سال کی شرط لگائی تھی، نبی ﷺ نے فرمایا تم نے غلطی کی ہے، اس لئے کچھ شرط بڑھا لو اور میعاد ذرا زیادہ کرلو، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کفار سے کہا کہ شرط بڑھا لو، کیونکہ "بضع" کے لفظ کا یہی تقاضا ہے، اس کا اطلاق دس تک ہوتا ہے، کفار نے یہ بات تسلیم کرلی، میعاد بڑھا کر سات برس کرلی اور شرط میں سو اونٹ کردیئے، خدا کی قدرت رومی ایرانیوں پر غالب آگئے۔[1]

[1] سنن الترمذي: كتاب تفسير القرآن، باب من سورة الروم، رقم الحديث←

رومی کیسے غالب آئے؟

اس غلبہ کی صورت کیا تھی؟ غلبہ اس طرح ہوا کہ ایرانی فوج کے امیر سے ذرا سی سستی ہوگئی، کسریٰ کا ارادہ ہوا کہ اسے معزول کر کے دوسرا آدمی اس کی جگہ مقرر کر دے، کسریٰ نے اسے خط لکھا کہ میں تمہیں معزول کرتا ہوں، لہٰذا تم چارج فلاں شخص کو دے دو، اس نے کسریٰ کے اس حکم کی کوئی پروانہ کی اور اپنے خیال میں اسے برا محسوس کیا، جب کسریٰ نے دیکھا کہ کام نہیں بنتا، تو اس کے بھائی کو خط لکھا کہ میں تمہیں امیر الافواج مقرر کرتا ہوں اور تمہارے بھائی کو اس عہدہ سے معزول کرتا ہوں، شاید یہ بھی لکھا ہو کہ اسے قتل کر دو، اس نے سوچا کہ میں امیر عساکر بن جاؤں گا، لہٰذا اسے قتل کر دوں، اس کے بھائی کو جب اس کا علم ہوا، تو اس نے کہا کہ میری طرف تو وہ پہلے اس قسم کا خط لکھ چکا ہے، میں نے تو اس پر عمل نہیں کیا، تم نے کیوں ایسا ارادہ کیا؟ اس ملاقات پر دونوں بھائی متحد ہوگئے اور فیصلہ کر لیا کہ اسے چھٹی کا دودھ پلانا چاہیے، انہوں نے ہرقل کے ساتھ سازباز کی اور خود بخود ہی شکست کھا لی، اس طرح رومیوں کو ایرانیوں پر فتح ہوئی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ فتح و کامرانی کے آثار نظر نہیں آتے تھے، یہ چیز من جانب اللہ ہی تھی۔

غزوہ بدر:

اسی روز مدینے میں کچھ ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ کفار مکہ اور مسلمانوں کے درمیان جنگ بدر ہوئی، اس میں مسلمان کافروں پر غالب آئے اور بڑے بڑے سردار میدان کارزار میں کام آئے اور جہنم رسید ہوئے:

← (۳۱۹۳، ۳۱۹٤) وقال الترمذي: "هذا حديث حسن صحيح"، وصححه ابن حبان والحاكم والذهبي والألباني رحمهم الله۔

﴿ يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ [الروم: ٤،٥،٦]

"اور اس دن مومن خوش ہوں گے، اللہ کی مدد سے، وہ مدد کرتا ہے، جس کی چاہتا ہے اور وہی سب پر غالب، نہایت رحم والا ہے، اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلاف نہیں ہوسکتا، قرآن نے ایسے زور دار الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

ہرقل بیت المقدس کیوں آیا؟

جب رومیوں کو یہ فتح نصیب ہوئی، تو ہرقل نے منت مانی ہوئی تھی کہ اگر ہم فتح یاب ہوجائیں، تو پیدل بیت المقدس جاؤں گا، وہاں اللہ کا شکر ادا کروں گا، نماز پڑھوں گا، شکر کے طور پر عبادت کروں گا، اس نازک انسان کے لیے اتنا لمبا سفر پیدل کرنا بھی آسان نہیں تھا، لہٰذا اس کے لیے فرش بچھا دیے گئے، بیت المقدس پہنچنے میں کافی وقت لگا، چھٹی صدی عیسوی میں وہاں پہنچا اور اپنی منت پوری کی۔

روم کی تاریخ:

روم کا لفظ اٹلی پر استعمال کرتے ہیں، اطالیہ سب سے پہلا ملک ہے، جس نے عیسائیت قبول کی، اس کی وجہ سے باقی ملکوں نے بھی عیسائیت قبول کر لی، اس وقت اٹلی، قسطنطنیہ اور شام ایک ہی حکومت کے زیر اثر تھے، ان کا لقب قیصر تھا، آج کل بھی روم کے سربراہوں کا لقب قیصر ہی ہے اور اٹلی کو روم کہتے ہیں، ان کا مذہبی پیشوا بھی وہیں رہتا ہے، یورپ میں انہی کے حروف استعمال کیے جاتے ہیں، بعض اوقات صرف

عیسائیوں پر بھی روم کا لفظ بولا جاتا ہے، حافظ ابن حجر کا خیال ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں، روم بن عیص بن اسحاق بن ابراہیم، علامہ عینی کا بھی یہ خیال ہے،[1] مگر موجودہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے نہیں ہیں، یہ کوئی اور قوم ہے، صحیح بات یہی ہے، ابن حجر وغیرہ سے یہ تاریخی غلطی ہوگئی ہے۔

مکتوب نبوی دربار ہرقل میں:

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار سے دس سال کے لیے صلح کر لی تھی، اس دوران میں کفار کو بھی تجارت کا عام موقع مل گیا، ابوسفیان تجارت کی غرض سے تیس یا کم وبیش آدمی لے کر شام کی طرف گیا، اس تجارت میں ابوسفیان کی اپنی زبان کے مطابق عورتوں نے اپنے زیور تک دے دیئے تھے، ابوسفیان کہتا ہے کہ ہم ابھی غزہ شہر میں ہی تھے کہ چند سپاہی آگئے اور ہرقل کے پاس چلنے کو کہا، ہرقل خود بھی کاہن تھا، نجومی تھا، اس نے نجوم سے بھی استدلال کیا، خواہ وہ غلط تھا یا صحیح تھا، کہانت کی وجہ سے کچھ خبریں شیاطین نے بھی دی ہوں گی، صبح اٹھا تو حیران ہی تھا کہ اسے غسان کے بادشاہ کا ایک خط پہنچ گیا کہ یہاں ایک مدعیٔ نبوت نبی پیدا ہو چکا ہے۔ کچھ تو ہرقل کو کہانت اور نجوم سے پتہ چل گیا تھا، مزید برآں خط موصول ہوگیا، بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گرامی نامہ بھی پہنچ گیا، جونہی خط ملا، رنگ فق ہوگیا، حیران وششدر رہ گیا کہ اب اس کی حکومت کا خاتمہ ہونے والا ہے!

ابوسفیان دربار ہرقل میں:

ابوسفیان کا بیان ہے کہ ہمیں سپاہی ہرقل کے پاس لے گئے، اس وقت میں سواروں کی رفاقت اور معیت میں تھا، " في ركب " کے الفاظ آئے ہیں، " ركب "

---

[1] فتح الباري (١/ ١٤٤) عمدة القاري (١/ ١٨)

دس یا دس سے اوپر کو کہتے ہیں، "راکب" کی جمع ہے، جس طرح "صاحب" کی جمع "صحب" ہے، بعض اسے اسم جنس بنا دیتے ہیں، کیونکہ فاعل کی جمع "فَعْل" پر نہیں آتی۔

" فأتاه إلى هرقل " پھر وہ ہرقل کے پاس آئے، اس وقت ہرقل ایلیا میں تھا، ہرقل نے ابوسفیان کو اپنی مجلس میں بلوایا، ہرقل کے اردگرد بڑے بڑے رومی سردار بیٹھے ہوئے تھے، ترجمان کو بھی بلایا گیا، ترجمان کی وساطت سے پوچھا کہ اس کا ان میں سے زیادہ قریبی کون ہے؟ جو کہتا ہے کہ میں نبی ہوں!

"هذا الرجل" کی تشریح:

یہاں بریلوی حضرات کے ایک استدلال کا جواب دیا جاتا ہے، بریلوی کہتے ہیں حدیث میں آتا ہے کہ قبر میں میت سے نبی ﷺ کے متعلق سوال ہوتا ہے: " ما تقول في هذا الرجل؟[1] " هذا کا لفظ بتاتا ہے کہ نبی ﷺ وہاں حاضر ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ حاضر ناظر ہیں، کیونکہ "هذا" کا لفظ محسوس مبصر حاضر کے لیے استعمال ہوتا ہے، جو چیز نظر آتی ہو، اس کے لیے "هذا" کہتے ہیں، خدا کے لیے جو لفظ "هذا" آیا ہے، وہ مجازی ہو جائے گا۔

یہاں ہرقل نے " هذا الرجل " کہا ہے، میں اس رجل کے متعلق سوال کرتا ہوں، حالانکہ ان کے خیال کے مطابق تو ابھی تک ان کی نبوت ہی ثابت نہیں ہوئی، وہ حاضر ناظر تو نہیں سمجھ رہا ہے، " هذا الرجل " ہی کہہ رہا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ "هذا" کا لفظ حاظر ناظر کے لئے ضروری نہیں، جواب کمزور ہے، اس لئے کہ جب "هذا" لغت کے اعتبار سے محسوس مبصر کے لیے ہے، تو یہاں استعمال نہیں ہوا، وہ اس

[1] صحيح البخاري: كتاب الجنائز، باب الميت يسمع خفق النعال، رقم الحديث (١٢٧٣) صحيح مسلم: كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب عرض مقعد الميت من الجنة أو النار عليه، رقم الحديث (٢٨٧٠)

کی مجازی صورت ہوگی، معلوم ہوتا ہے یہاں عقلی قرینہ ہوگا، یہاں " ھذا الرجل " کا لفظ ایک غیر محسوس مبصر پر بولا جا رہا ہے، کیونکہ اس کا عقیدہ نہیں، عقلی دلیل ہے، عقلی دلیل سے اگر کسی شے کا کسی معنی میں استعمال ثابت ہو جائے، تو وہ حقیقت نہیں ہوتی، اس لئے یہ جواب معقول نہیں، ایک استعمال بتا دیا جائے خواہ حقیقی ہو یا مجازی اس کی حقیقت تو نہیں ہوتی، ان کا استدلال حقیقت سے ہے۔

اس کا جواب اس طرح ہوسکتا ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ وہ حقیقت نہیں، یا وہ حقیقت شہادی نہیں مثالی حقیقت ہے، خواب میں اگر کوئی نبی ﷺ کو دیکھ لے، خواب میں دیکھنے سے ان کی آمد و جود شہادی سے نہیں ہوتی، یہ تو ایک حماقت ہے کہ خواب میں دیکھے اور دن میں جا کر پوچھے کہ رات تم کس طرح ہمارے پاس آ گئے تھے؟

ایک واقعہ:

ایک آدمی کہتا ہے کہ ایک بریلوی میرا دوست تھا، میں بردوان میں رہتا تھا، میرے پاس آیا اور کہنے لگا مولوی صاحب! میں نے کہا کیا بات ہے؟ کہنے لگا رات تم نے جس بزرگ کی زیارت کروائی تھی، وہ کون تھے؟ اس نے یہ سمجھا کہ یہ مولوی صاحب رات کو ان کے ساتھ تھے، یہ بھی گئے ہوں گے، وہ کہتے ہیں مجھے تو معلوم نہیں، اس پر وہ بریلوی صاحب کہنے لگا ہاں، ہاں اسی طرح ہے، رات آپ میرے ساتھ گئے تھے، اب کہتے ہو مجھے پتہ نہیں، بریلوی بے وقوف ہی ہیں!

عالم برزخ:

یہ واقعہ تو برزخ کا ہے، عالم برزخ میں اگر کسی شے کی حاضری ہو، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عالم شہادت میں بھی حاضری ہوگی، جس طرح خواب میں اگر کوئی حاضر ہو، اس کا یہ مطلب نہیں کہ واقعی وہ موجود ہے، تلاش کرتا پھرے کہ دروازہ تو بند

تھا، پھر کیسے آ گئے؟ یہ خوابی یا کشفی باتیں ہیں، کشف میں ایک شخص آ جاتا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ گھر کا دروازہ کھول کر آ گیا ہے، وہ تو ایک شکل نظر آ جاتی ہے، جس طرح خواب میں نظر آ جاتی ہے، اسی طرح عالم برزخ میں بھی بعض چیزیں نظر آ جاتی ہیں۔

قبر میں حضور ﷺ کی صورت:

نبی ﷺ اس کو نظر آئے، کہہ دیا کہ اس مرد کے متعلق تم کیا کہتے ہو:

"ما تقول في هذا الرجل" یہ بھی ہو سکتا ہے کہ واقعی حضور ﷺ کی صورت دکھا دی گئی ہو، اس سے حاضری ثابت نہیں ہو جاتی، جیسا کہ ٹیلی ویژن میں بولنے والا آ تو نہیں جاتا، وہ تو وہیں ہے، وجود خارجی وہیں ہے، جہاں سے بول رہا ہے، صورت اس کی یہاں ہے، اسی طرح اگر خواب میں کوئی صورت نظر آ بھی جائے، اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ محسوس مبصر کے لئے "هذا" ہوتا ہے، لہٰذا حضور حاضر ناظر ہو گئے، یہ ایک بیوقوفی ہے کہ وجود برزخی کو وجود شہادی پر قیاس کر لینا اور ما فی الاذہان کو ما فی الاعیان سمجھ لینا، جیسا کہ ابن قیم کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ما فی الاذہان کو ما فی الاعیان سمجھ لیا ہے، ان پر ما فی الاذہان ما فی الاعیان سے مشتبہ ہو گیا ہے، اس میں یہ خرابی ہے،[1] یہ بات معقول ہے، پہلا جواب معقول نہیں، ہاں اگر دوسرے دلائل کے ساتھ ثابت کر لیا جائے کہ نبی ﷺ قبر میں حاضر نہیں ہوتے، تو پھر یہ جواب معقول ہو جاتا ہے۔

برزخی وجود:

پہلے تو یہ ہے کہ یہ برزخی وجود ہے، یہ دوسری بات تھی، ایک دوسرے طریقہ

---

[1] منهاج السنة النبوية (١/ ٤٠١) الصفدية (١/ ١٢٥)

سے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک آدمی مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا، وہ فوت ہوگیا، رات کا وقت تھا صحابہ نے آپ کو زحمت دینا گوارا نہ کی اور راتوں رات دفن کردیا، حضور ﷺ کو جب وہ نظر نہ آیا، تو آپ نے دریافت فرمایا کہ فلاں خادمِ مسجد کہاں ہے؟ صحابہ نے عرض کیا وہ رات کو فوت ہوگیا تھا، ہم نے آپ کو تکلیف نہ دینا چاہی، اس لئے اسے دفن کر دیا، آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے مجھے بتایا ہی نہیں![1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر حضور قبر میں حاضر ہوتے، تو انہیں معلوم ہوجانا چاہیے تھا کہ وہ خادم مسجد فوت ہوگیا ہے، دوسرے دلائل سے بھی ثابت ہوجاتا ہے، پھر اس جگہ مجازی معنی مراد لیا جائے گا، خیر! دوسری بات عام فہم ہے، لوگ اسے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

ابوسفیان سے استفسار:

" هذا الرجل الذي يزعم أنه نبي " اس رجل کے متعلق جو کہتا ہے کہ وہ نبی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ہرقل نبوت کا قائل نہیں ہوا، اسی لیے کہتا ہے کہ وہ شخص جو مدعیٔ نبوت ہے، اس کے متعلق میں سوال کرتا ہوں۔

ابوسفیان نے کہا: " أنا أقرب من النسب " میرا نسب زیادہ قریب ہے، ہرقل نے یہ سوال اس لئے کیا ہوگا کہ قریبی نسب والا صحیح صورت سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے، خواہ مخالف ہی ہو، مخالف تو ضرور اس کے کچھ عیوب و نقائص بیان کرے گا، اگر اس میں ہوں گے، دوسرے لوگوں کو بعض اوقات بعض نجی اور خاندانی حالات کا صحیح علم نہیں ہوتا، ابوسفیان کہتا ہے کہ عبد مناف میں سے کوئی دوسرا آدمی وہاں نہیں گیا تھا۔

---

[1] صحيح البخاري: أبواب المساجد، باب كنس المسجد والتقاط الخرق والقذى والعيدان، رقم الحديث (٤٤٦) صحيح مسلم: كتاب الجنائز، باب الصلاة على القبر، رقم الحديث (٩٥٦)

نسب نامہ:

عبد مناف کے چار لڑکے تھے، عبد شمس، ہاشم، نوفل، مطلب، ابوسفیان عبد شمس کی اولاد سے اور نبی ﷺ ہاشم کی اولاد میں سے ہیں، یعنی ابوسفیان بن حرب بن امیہ بن شمس، گویا درمیان میں دو واسطے آئے ہیں، ادھر آنحضور ﷺ کے نسب میں بھی دو ہی ہیں، عبداللہ بن عبدالمطلب، ہاشم اور عبد شمس، عبد مناف کے دو لڑکے تھے، گویا ان کی طرح اپنے باپ کو فرض کرلیا، اس واسطے ابن عم (چچا زاد) ہوگئے۔

مجلسِ مکالمہ:

جب ابوسفیان نے کہا کہ نسبی لحاظ سے میں سب سے زیادہ قریب ہوں، تو ہرقل نے ترجمان کے واسطہ سے کہا کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو میرے قریب کرو، اسے آگے اور اس کے ساتھیوں کو اس کی پشت پیچھے بٹھا دو، جب میں سوال کروں گا تو دیکھ لوں گا کہ اس کی تکذیب کرتے ہیں یا نہیں، رو برو تکذیب کرنا ذرا مشکل سا ہوتا ہے، پس پشت اس کی بہ نسبت آسان ہوتا ہے، لیکن ان لوگوں نے تو پیچھے بھی ابو سفیان کی تکذیب کہاں کرنی تھی، کیونکہ سب مخالفت و عداوت میں متفق تھے، جب یہ لوگ بیٹھ گئے، تو ہرقل ترجمان سے مخاطب ہوا کہ ان سے کہو، میں اس سے ایک سوال کرنے والا ہوں اور اگر یہ (ابوسفیان) جھوٹ بولے تو تم اس کی تکذیب کرو۔

ایک کافر جھوٹ سے بچتا ہے:

ابوسفیان کہتا ہے کہ اگر مجھے حیا نہ ہوتی کہ لوگ مجھ پر جھوٹ نقل کریں گے، بخدا میں ضرور جھوٹ بولتا، اگرچہ مجھے یہ تو خطرہ نہیں تھا کہ وہیں پر میری تکذیب کریں گے، البتہ یہ خطرہ تھا کہ یہاں سے باہر جا کر کہیں گے کہ اس آدمی نے جھوٹ بولا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر بھی جھوٹ کو بہت برا سمجھتے تھے، "کنت امرأ

سیداً أتکرم عن الکذب " میں قوم کا سردار تھا، میں ذرا جھوٹ سے پرہیز کرتا تھا، مجھ پر کہیں اتہام نہ لگ جائے کہ سردارِ قوم جھوٹ بولتا ہے۔

ہرقل کا پہلا سوال:

آگے ہرقل ابوسفیان سے دس گیارہ سوال کرتا ہے، سب سے پہلا سوال یہ ہے: " کیف نسبه فیکم؟ " اس مدعیٔ نبوت کا نسب تم میں کیسا ہے؟ ہم نے کہا: " ھو فینا ذو نسب " وہ ہم میں ذونسب ہے، نسب میں تنوین تعظیم کی ہے، یعنی اس کا نسب بلند اور عظمت والا ہے، عظمتِ نسب اور بلندی کا یہی مطلب ہے کہ اس کے خاندان میں جو لوگ گزرے ہیں، ان کے اخلاق اور ان کے اعمال اچھے ہیں، گویا یہاں اخلاقی بلندی مراد ہے، ورنہ ویسے تو وہ لوگ بھی مشرک ہی تھے، عبد مناف کا نام ہی مشرکوں والا ہے، عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم، سارے ہی مشرک تھے، عبد مناف کے دوسرے لڑکوں کے نام بھی عبدالعزیٰ وغیرہ مشرکوں والے نام ہیں، شیعہ ان کو مسلمان بناتے ہیں، مگر مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں، شیعہ حضرات کا خیال ہے کہ عبد مناف، ہاشم، عبدالمطلب وغیرہ سب مسلمان تھے، بہر حال اس سے انکار کرنا ناانصافی ہے کہ ان کا اخلاقی کردار بہت اونچا تھا۔

معیار فضیلت:

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس موقع پر بڑی عجیب بات کہی ہے، اس لائق ہے کہ اسے ذہن نشین کرلیا جائے۔

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے دو فریق بنائے ہیں، ایک عرب اور دوسرا عجم، مجھے دونوں میں سے بہتر میں بنایا ہے اور وہ ہے عرب، عربوں میں پھر قریش اور غیر قریش، قریش جو دوسرے قبائل سے بہتر تھے، اس میں مجھے بنایا، ان میں سے پھر

ہاشم کو پسند کیا، پھر آپ نے فرمایا: "فما زلت مصطفاً في مصطفیٰ " میں ہمیشہ چنے ہوئے لوگوں میں سے چنا رہا ہوں، خاندان بھی اس قسم کا ہے، اس پر بھی حافظ ابن تیمیہ نے بڑی عجیب بحث کی ہے، کہتے ہیں یہ فضیلت اصل میں علم اور عمل کے اعتبار سے ہے، ان دونوں کی وجہ سے ہی عام طور پر لوگ دنیا میں شہرت حاصل کرتے ہیں۔

علم کی بنیاد:

علم کی بنیاد دو چیزوں پر ہے، ایک تو کسی قوم کا حافظہ، ذہانت اور دوسرا یہ کہ اس کی زبان زیادہ وسیع اور فصیح ہو، جس قوم کی زبان وسیع و فصیح ہو، اس کے اذہان عالیہ ہوں، ایسی قوم کے لوگوں میں علمی استعداد زیادہ ہوتی ہے، علمی استعداد دوسروں کی نسبت عربوں میں زیادہ تھی، یہ قاعدہ کلیہ نہیں اکثریت کے اعتبار سے ہے، ورنہ ایسا بھی ممکن ہے کہ بعض دوسرے عجمی عربوں سے زیادہ ذہین ہوں، زبان گو عربوں کی فصیح ہے، مگر حافظہ اور ذہانت میں عجمی عربوں پر فوقیت رکھ سکتے ہیں، اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔

عمل کی بنیاد:

عمل کی بنیاد انسان کی اندرونی خوبیوں پر ہے، یعنی شرافت، شجاعت، سخاوت وغیرہ، مثلاً ایک قوم شجاع ہے، بہادر اور دلیر ہے، ایک بزدل، ڈرپوک اور کم ظرف ہے، بہادر قوم میدانِ کارزار میں بہادری کے جوہر دکھائے گی، اس کے مقابلے میں بزدل قوم کے لیے لڑائی کرنا مشکل ہے، اگرچہ ایسی قوم کو بھی کچھ تربیت اور ٹریننگ دے کر اس طرح بنایا جا سکتا ہے، بہر حال فطری کمزوری موجود رہے گی، جس کی وجہ سے لڑائی کرنا مشکل ہوگا۔

عربوں کے عام اوصاف:

عرب میں چونکہ مرکزی قیادت نہیں قبائلی نظام تھا، ہر قبیلے کا سردار ہوتا تھا، جو اس قبیلے کا گویا حاکم ہوتا تھا، ہر قبیلے کو حفاظت خود اختیاری کے اصول پر اپنی حفاظت آپ کرنا ہوتی تھی، اس لئے ہر قبیلے کو اپنے نوجوانوں میں شجاعت، بہادری اور دلیری کا جوہر زیادہ پیدا کرنا پڑتا تھا اور نوجوانوں کو بہادرانہ یادگاری کارنامے انجام دینے پڑتے تھے، قبیلے کے سردار میں چند نمایاں امتیازات اور اوصاف ہوتے تھے، مثلاً سخی ہوتا تھا، شریف النفس ہوتا تھا، بارعب اور قوی ہوتا تھا، سخاوت کا جزو اس میں زیادہ نمایاں ہوتا تھا، یہ ناگزیر تھا، کیونکہ عرب میں میلے لگتے تھے، وہ اس میں جاتے، قبائل کے سردار سخاوتیں کرتے، جو زیادہ دیگیں پکوا کر تقسیم کرتا، اس کا سر اونچا رہتا، شعراء اپنے اپنے قبائل کے اوصاف کے پل باندھتے، سردار قبیلہ کی بہادری، سخاوت اور شرافت کے تذکرے ہوتے۔

ان اوصاف جمیلہ کے ساتھ ساتھ ان میں مے خوری بھی تھی، جسے وہ حلال سمجھ کر پیتے تھے، ان میں چور اور زانی بھی تھے، مگر اکثریت کے لحاظ سے اچھے لوگ تھے، یہی وجہ تھی جس کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ کی رگ حمیت اس وقت بہت زیادہ پھڑکی، جب صلح حدیبیہ ہو رہی تھی، ایک کافر نے حضور ﷺ سے کہا کہ آپ کے اردگرد جمع ہونے والے لوگ مختلف قبائل سے تعلق رکھتے ہیں، بوقت ضرورت اور میدان جنگ میں تو اپنے ہی کام آتے ہیں، حضرت ابوبکر نے نہایت طیش اور غصہ میں کہا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم ضرورت کے وقت آپ کو چھوڑ دیں گے؟ "امصص بظر اللات!" یہ بڑا سخت لفظ انھوں نے استعمال کیا، اس آدمی نے پوچھا یہ کون شخص ہے، جو یہ لفظ بول رہا ہے؟ لوگوں نے کہا: ابوبکر ہے، اس نے کہا ابوبکر نے مجھ پر

ایک احسان کیا ہے، میں نے اس کا بدلہ اب تک نہیں دیا، بدلہ دے چکا ہوتا، تو آج میں جواب دیتا۔ [1] باوجود کافر ہونے کے اخلاقی رنگ میں یہ خیال آیا کہ اس کے احسان کا بدلہ چکا لوں، پھر جواب دوں گا، اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اخلاقی لحاظ سے بڑے بلند تھے۔

حضور ﷺ کے خاندان کا بلند تر درجہ:

حضور ﷺ کا خاندان اس میدان میں سب سے بلند حصہ رکھتا تھا، ان کا حافظہ بھی نہایت اچھا تھا، ذہین تھے، شجاع تھے، بقول ابن تیمیہ یہ اوصاف اور امتیازات بنو ہاشم میں دوسرے قبائل سے زیادہ تھے، یہاں حضور ﷺ کو ''ذو نسب'' اس معنی سے کہا گیا ہے، خواہ خاندان کے اسلاف کافر ہوں یا مسلمان، اس سے بحث نہیں۔

ہرقل کا دوسرا سوال:

" قال: فهل قال هذا القول منكم أحد قط قبله؟ " کیا یہ بات تم میں سے پہلے بھی کبھی کسی نے کہی ہے؟ ابوسفیان کہتے ہیں، میں نے نفی میں جواب دیا، ہرقل نے یہ بات اس لئے پوچھی کہ اگر کسی نے ان کے خاندان میں سے پہلے اس قسم کا دعویٰ کیا ہوگا، تو پھر تو دوسری صورت ہوگی، اس کی صورت اسی طرح کی ہوگی کہ شریر آدمی میں آسانی سے شرافت پیدا نہیں ہوسکتی، جس طرح قاعدہ ہے کہ سفید رنگ والے آدمی کے ہاں سفید رنگ کے بچے ہی پیدا ہوں گے، سیاہ ہو تو سیاہ پیدا ہوں گے، رنگ، خدوخال، قدوقامت عموماً بچہ والدین سے لے کر آتا ہے، اسی طرح ان

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الشروط، باب الشروط في الجهاد والمصالحة مع أهل الحرب وكتابة الشروط، رقم الحديث (٢٥٨١)

کے اخلاق و عادات بھی لے کر آتا ہے، اسی طرح ایک شریر انسان کی اولاد ناممکن سی بات ہے کہ وہ انتہائی شریف ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ تعلیم و تربیت کی وجہ سے اپنے آپ پر کنٹرول کر لے، اس کے باوجود جبلت اور فطرت نہیں بدل سکتی، اسی طرح رہے گی، آہستہ آہستہ کچھ فرق پڑے گا۔

اَلوَلدُ سِرٌّ لِاَبیْہِ :

کہتے ہیں مرزا قادیانی کے سب لڑکے شرابی اور زانی تھے، اسی لئے کہتے ہیں کہ اگر مرزے میں کوئی صلاحیت ہوتی، تو اس کی نرینہ اولاد میں ظاہر ہوتی، جب لڑکے اس قماش کے نکلے، تو معلوم ہوتا ہے کہ خود مرزا جی بھی اسی محفلِ رنداں کے ہی ایک فرد ہوں گے، کہتے ہیں:

"گندم از گندم بروید جو از جو
از مکافات عمل غافل مشو" [1]

شرافت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں کنٹرول کا ملکہ ہو، یا تعلیم کے حصول کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہو کہ یہ چیزیں قبیح ہیں، اس لئے ان سے پرہیز کرنے لگے، یا شریعت کا زیادہ ہی معتقد ہوگیا، اس کا اس کے اخلاق پر زیادہ دباؤ پڑ گیا ہو، معلوم ہوا کہ فطری مہذب الاخلاق ہونا اور چیز ہے، ایسا شخص عقلی طور پر زیادہ کنٹرول کر سکتا ہے، جو شخص ڈر کے مارے یا ڈنڈے کے خوف سے یا اللہ تعالیٰ کی سزا اور اس کی گرفت سے ڈرتے ہوئے اپنے اوپر کنٹرول کر لے، تو اسے فی نفسہ مہذب الاخلاق نہیں کہا جا سکتا، مشہور ہے " الولد سر لأبیہ " بچہ باپ کا راز دان ہوتا ہے، اگر باپ کنٹرول کر لے تو عموماً اولاد بھی کنٹرول کر لیتی ہے، ورنہ اولاد باپ کے مخفی اور پس پردہ کردار کو طشت از بام کر دے گی۔

[1] گندم سے گندم اور جو سے جو ہی برآمد ہوتا ہے، تم مکافاتِ عمل سے غافل نہ رہو!

تشریح الفاظ:

" قال: فهل قال هذا القول منكم أحد قط قبله؟ " اس میں "قط" کا لفظ آ گیا ہے، جو عام طور پر منفی فعل کے بعد آتا ہے، بعض کہتے ہیں، " هل " کا لفظ استفہام کے لیے ہے، یہ گویا نفی کے معنی میں آ جاتا ہے، خواہ کسی نے کہا ہو یا نہ کہا ہو، مطلب یہی ہوتا ہے، نفی غیر موجب کلام کی سی صورت بن گئی، " هل " کے ساتھ غیر موجب تو بن جاتی ہے۔

ہرقل کا تیسرا سوال:

پھر ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا کہ ان میں کوئی بادشاہ بھی ہوا ہے؟ ابو سفیان نے کہا: نہیں۔ مرزا قادیانی کی طرح تو نہیں کہا کرتے تھے کہ ہماری تو عادت چلی آ رہی ہے کہ میرے فلاں دادا نے انگریز کی بڑی مدد کی، یہ کیا وہ کیا، اس طرح کے مفاخر مرزا جی بیان کیا کرتے تھے۔

ہرقل کا چوتھا سوال:

پھر پوچھا کہ اشراف لوگ اس کی اتباع کرتے ہیں یا ضعفاء؟ ابوسفیان کہتے ہیں: میں نے کہا ضعفاء! اکثریت کے لحاظ سے کہا، ورنہ چند آدمی شریف بھی تھے، "أشراف" سے طاقت ور یا خاندانی مالدار لوگ مراد ہیں، بعض کہتے ہیں کہ "أشراف" کا مطلب یہ ہے کہ متکبر اور اکڑ رکھنے والے لوگ، اس قسم کے لوگ اتباع کرنے میں اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں، ان کا زعم ہوتا ہے کہ ہم نمبردار ہیں، ہم سردار قوم، محلّہ یا گاؤں کے چوہدری ہیں، ہم ان قلاش لوگوں کے پیچھے کیسے لگ جائیں؟

ہرقل کے دیگر سوالات:

پھر پوچھا: " أيزيدون أم ينقصون " بڑھتے ہیں یا کم ہوتے ہیں؟ ابوسفیان

نے کہا کم نہیں بلکہ زیادہ ہی ہوتے ہیں، کیا کوئی مرتد بھی ہوتا ہے؟ یعنی داخل ہونے کے بعد دین کو ناپسند کرتے ہوئے کوئی مرتد بھی ہوتا ہے؟ اس نے کہا نہیں، کیا تم اسے نبوت کا دعویٰ کرنے سے پہلے جھوٹ کے ساتھ متہم سمجھتے تھے؟ اس نے کہا نہیں، پھر ہرقل نے پوچھا کیا وہ غدر بھی کرتا ہے؟ میں نے کہا نہیں ہم اس کے ساتھ ایک مدتِ معاہدہ میں ہیں، ہم نہیں جانتے وہ کیا کرنے والا ہے؟ اسے یقین تھا کہ نبی ﷺ غدر نہیں کریں گے، لیکن یہ کلمہ داخل کر دیا، ابوسفیان کہتا ہے، اس کلمے کے سوا مجھے یہ ہمت نہیں ہوئی کہ کسی اور قسم کا کلمہ داخل کروں، ہرقل نے پوچھا کیا تم نے لڑائی کی ہے؟ ابوسفیان نے کہا ہاں، لڑائی کیسی تھی؟ ابوسفیان بولا لڑائی ہمارے اور اس کے درمیان ڈول کی طرح تھی، کبھی ڈول اس ہاتھ میں کبھی اس ہاتھ میں ہوتا ہے، کبھی ہم غالب آتے ہیں اور کبھی وہ غالب آجاتا ہے، کبھی وہ ہمیں تکلیف پہنچاتا ہے اور کبھی ہم اسے تکلیف پہنچاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات:

ہرقل نے پوچھا: وہ تمہیں کس چیز کا حکم دیتا ہے؟ ابوسفیان کہتا ہے کہ وہ ہمیں حکم دیتا ہے:

" اعبدوا اللّٰہ، ولا تشرکوا بہ شیئا، واترکوا ما یقول آباؤکم " صرف ایک خدا کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اپنے آباء واجداد کی باتیں نہ کیا کرو، اس کے علاوہ ہم کو نماز کا حکم دیتا ہے، سچائی، صدق، عفاف کا حکم دیتا ہے، صلہ رحمی اور صلح جوئی کا حکم دیتا ہے۔

نبی علیہ السلام کی صفات وتعلیمات اور ہرقل کا تجزیہ:

پھر ہرقل ساری باتوں کا ذکر کرتا ہے اور ترجمان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

میں نے اس سے اس کے نسب کے بارے میں سوال کیا تھا، اس نے اس کا جواب دیا ہے کہ وہ ذونسب ہے، پیغمبر اپنی قوم میں ذونسب ہی بھیجے جاتے ہیں اور وہ خاندانی لوگ ہوتے ہیں، یہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ قوم کے لوگ اتباع اور پیروی کرنے میں عار نہ سمجھیں، میں نے پوچھا تھا کہ اس کا ذکر پہلے بھی کسی نے کیا ہے؟ تو اس نے کہا نہیں، اگر پہلے ان کے خاندان میں سے کسی نے کہا ہوتا، جو بادشاہ ہوتا، تو میں سمجھتا کہ اپنے کسی بڑے کی بات کہہ رہا ہے، یعنی ایک آدمی اگر اس قسم کا دعویٰ کرے اور اس کے پیچھے کچھ لوگ لگ جائیں، تو دوسرے بھی کہتے ہیں کہ یہ بات بڑی اچھی ہے، نبی ﷺ نے دعویٰ نبوت کیا، پھر مدینے میں آئے، وہاں ایک اسلامی ریاست قائم ہوگئی، قریش نے پھر سمجھا کہ اب ایک نبی پیدا ہوگیا ہے، یہ ریاست قائم کرنے کا اچھا طریقہ ہے۔

عرب میں مدعیانِ نبوت:

اسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف قبائل میں مدعیٔ نبوت کھڑے ہوگئے، مسیلمہ کذاب نے یمامہ میں دعویٰ کر دیا، بنی اسد میں طلیحہ کھڑا ہوگیا، بنی تمیم میں سجاح نامی عورت دعویدار بن گئی، یمن میں اسود عنسی نے دعویٰ کر دیا، انہوں نے سمجھا کہ اس طرح ایک ریاست قائم ہوجاتی ہے۔

مرزا قادیانی کے اخلاقِ رذیلہ:

اسی طرح ہندوستان میں مرزا قادیانی نے بتدریج دعویٰ کر دیا، پہلے مہدی کا دعویٰ کیا، آہستہ آہستہ نبوت کا دعویٰ کر دیا، حالانکہ مرزے کا باپ ستر سال کا تھا، اس نے کبھی نماز تک نہیں پڑھی تھی، بلکہ باپ مرزے کو کہا کرتا تھا کہ یہ نمازی بن گیا ہے! باپ کے بے نماز ہونے کی شہادت خود مرزا نے دی ہے، مرزا کہتا تھا کہ میرا باپ ستر

سال کا ہوگیا ہے، مگر نماز نہیں پڑھتا۔ مرزا کا باپ بڑا متکبر آدمی تھا، ایک مرتبہ ایک پٹواری اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا، اس نے پٹواری کو حقارت سے کہا کہ یہ کمیں آدمی میری چارپائی پر کیوں بیٹھ گیا ہے؟ معاشرے کے ایک قابل احترام آدمی کو کمیں سمجھا اور اپنے آپ کو چوہدری تصور کیا کہ ہماری یہاں زمین ہے، وہ پٹواری اس کے ایسے کھتے (پیچھے) پڑا کہ ان کے سب مکانوں کا کرایہ داروں کو مالک بنا دیا، اس پٹواری نے کہا کہ ان سارے کمیوں کو تیرے برابر بٹھاؤں گا، جب یہ مرا تو تحصیلدار نے دریافت کیا کہ فیصلہ ازروئے شریعت چاہتے ہو یا ملکی قانون کی رو سے؟ مرزے نے کہا ملکی قانون کی رو سے فیصلہ چاہتا ہوں، شریعت کی رو سے نہیں۔ مرزا جی کا اپنا یہ حال تھا کہ اس نے حقیقی بہن کو میراث کا حصہ تک نہیں دیا، یہ واقعہ سید محمد شریف، جو پٹواری رہے ہیں، کہتے ہیں کہ میں نے اس وقت کے تحصیلدار سے من وعن اپنے کانوں سے سنا ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تو یہ ہے:

﴿ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ [النساء: ١٤]

”اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی حدوں سے تجاوز کرے، وہ اسے آگ میں داخل کرے گا، ہمیشہ اس میں رہنے والا ہے اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔“

ایک دفعہ مرزائیوں سے بات ہوئی، ہم نے کہا کہ مرزا مسلمان ہی نہیں کیونکہ اس نے اپنی سگی بہن کو اس کا حصہ نہیں دیا تھا، کہنے لگے نہیں دیا ہوگا، اس کے بعد ان مرزائیوں نے قادیان خط لکھا کہ بتائیں مرزا جی نے اپنی بہن کو اس کا حصہ دیا تھا یا نہیں؟ وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا، جواب کیا خاک دیتے جب حصہ دیا ہی نہیں!

نام نہاد مہدیوں کا تذکرہ:

مہدی پہلے بھی بہت ہوئے ہیں، دو آدمی تو ایران میں ہوئے ہیں:

۱۔ باب اللہ۔ ۲۔ بہاء اللہ۔

ایک کی کتاب ''الواح قدسیہ'' ہے، اسی طرح مرزا کی کتاب ''آئینہ کمالات اسلام'' ہے، یہ کتاب بالکل اس کی ہو بہو کاپی ہے، مرزے نے ان میں ایک خرابی محسوس کی کہ وہ اسلام کو دائمی مذہب نہیں سمجھتے تھے، اس لئے مسلمان ان کے پیچھے نہیں لگتے تھے، مرزے نے اس سے پرہیز کیا ہے اور ادھر ادھر سے ہاتھ پاؤں مار کر نبوت بنانے کی کوشش کی، اگر حکومت برطانیہ رہتی، مرزا جس کے ثناء خواں تھے اور جس کی مدح سرائی میں الماریاں کتابیں لکھنے کا دعویٰ کیا ہے، تو ان کا دائرہ کافی وسیع ہوسکتا تھا۔

مرزا قادیانی کے دعاویٰ کا ذبہ:

مرزا جی نے اس قسم کی بہت سی باتیں کی ہیں کہ اب مدینے اور مکے کی چھاتی میں دودھ خشک ہوگیا ہے، سب کچھ قادیان میں ہے، اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کے نزدیک قادیان ان سے بہتر اور مقدس جگہ ہے، بلکہ ایک مرزائی قادیان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا تھا، گویا اس کے نزدیک اب قبلہ اس طرف ہوگیا ہے، انگریز بہادر یہاں سے چلا گیا، اب انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ہم مسلمان ہیں، حالانکہ مسلمان تو یہ پہلے ہی نہیں تھے، کیونکہ یہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ انکا مذہب نیا ہے، کہتے ہیں جس طرح عیسائیوں اور مسلمانوں میں فرق ہے، اسی طرح ہمارے اور مسلمانوں میں فرق ہے، صرف سیٹیں حاصل کرنے کی خاطر یونہی شور مچاتے تھے، تاکہ مسلمانوں کے حقوق غصب کر لیں۔

مرزا جی نے مہدی کا دعویٰ باب اللہ اور بہاء اللہ کی طرف دیکھ کر کیا تھا کہ یہ بہترین مجرب نسخہ ہے، مسلمانوں میں دعویٰ کرو، کام چل جائے گا، حیدر آباد دکن میں بھی ایک آدمی نے دعویٰ کیا تھا، لوگ اس کے پیچھے بھی لگ گئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی بڑی تعریف کی ہے کہ بڑا اچھا آدمی ہے، سادات میں سے ہے، ساتھ ہی مرزے کی بھی تائید کر دی، اس کو بھی الہام کا مغالطہ ہوا تھا، اسے بھی یہی مغالطہ ہوگیا۔ تکملہ مجمع البحار والے نے (ص: ۱۸۰) پر دکنی مہدی کا ذکر کیا ہے، اس نے اپنے خلفاء کے بھی ابوبکر جیسے نام رکھ لئے تھے، پھر وہاں لڑائی ہوئی، جس میں کچھ مارے گئے اور کچھ تائب ہوگئے، ابھی تک اس کے ماننے والے دکن میں موجود ہیں، صاحب مجمع البحار بھی اس لڑائی میں شریک تھے، اس لئے انہوں نے اس کا ذکر کیا ہے، اس نے وہاں اچھی خاصی طاقت پکڑ لی تھی۔

ہرقل کا تبصرہ:

بہرحال ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا تھا کہ اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ ہوا ہے؟ ابوسفیان نے کہا تھا کہ نہیں، ہرقل نے کہا کہ اگر اس کا کوئی بڑا دادا پردادا بادشاہ ہوتا، تو میں کہتا کہ یہ شخص اپنا آبائی تاج وتخت حاصل کرنا چاہتا ہے، کیونکہ آدمی ایسا تبھی کرتا ہے کہ اس کے آباء واجداد ایسے ہوں۔

ہرقل نے کہا کہ میں نے سوال کیا کہ کیا تم نے اسے کذب سے متہم سمجھا ہے؟ تم نے کہا کہ نہیں۔

مرزا قادیانی کے جھوٹ:

مرزائی مرزا کی صداقت پر یہ دلیل لاتے ہیں کہ مرزا نے پہلے کبھی جھوٹ نہیں بولا، پہلی بات یہ ہے کہ مرزے کا کوئی واقف تو رہا نہیں، جو اسے دیکھتا رہا ہو کہ مرزا

نے جھوٹ بولا ہے یا نہیں؟ البتہ اس کی کتابوں سے جھوٹ ثابت ہوگیا ہے، سو کے قریب تو ایک مولوی صاحب نے مرزا کے جھوٹ ثابت کئے ہیں، مولانا محمد یوسف کلکتوی نے ایک مناظرے میں سو کے قریب اس کے جھوٹ ثابت کیے۔

۱۔ مرزا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مولوی ثناء اللہ لوگوں کے کفن کے کپڑے پہنتا ہے اور جنازے کی روٹیاں کھاتا ہے، میرے ساتھ آجائے تو اتنی کثیر رقم اکٹھی کر دوں گا، حالانکہ ثناء اللہ جب سے پڑھ کر آیا ہے، اس نے کبھی امامت نہیں کی، اس طرح کے جھوٹ بولتا رہا ہے۔

۲۔ ایک دفعہ مولوی عبدالرحمٰن لکھوی سے کہنے لگا کہ آپ اللہ کی طرف متوجہ ہوں، آپ کو میرے متعلق الہام ہوگا، کیونکہ مرزا یہ سمجھتا تھا کہ ان کو الہام ہوتا ہے، وہ متوجہ ہوئے تو انہیں الہام ہوا:

﴿ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ ﴾ [القصص: ۸]

مرزا کہنے لگا اس میں کوئی میرا نام آیا ہے؟ پھر توجہ کی تو الہام ہوا کہ مرزا فرعون ہے، حج پر گئے وہیں فوت ہوگئے، مرزے نے کہا مولوی صاحب نے جھوٹ بولا تھا، اس لئے مر گیا ہے، حالانکہ انہوں نے مباہلہ تو نہیں کیا تھا، محی الدین ان کا لقب تھا، پیر ہندی انہیں کہا گیا ہے، اس طرح کے جھوٹ اگر جمع کئے جائیں، تو ان کی تعداد ہزار ہا تک پہنچ جاتی ہے۔

۳۔ دوسروں کی کتابوں کے غلط حوالے دیئے، شروع سے ہی یہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا، کوشش کرتا رہا کہ میں کسی طرح وکیل بن جاؤں، امتحان دیا، ناکام ہوا، کاروبار نبوت اسے پھب گیا، پہلے الہامات کا ڈھونگ رچایا، پھر نبی بن بیٹھا، اس نے بھی یہی سوچا کہ پہلے بھی مختلف ملکوں میں لوگوں نے دعوے کیے، لوگ

ان کے پیچھے لگ گئے، میں بھی دعویٰ کروں تو ضرور لوگ میرے پیچھے لگ جائیں گے، یہاں کی تو مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

مولانا عبداللہ غزنوی کے ایک مرید نے ایک کتاب لکھی ہے، اس میں لکھتے ہیں کہ جب ہم غزنوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے، تو دل کی روشنی بڑھ جاتی، فرحت اور اطمینان قلب محسوس ہوتا، مگر جب کبھی اس مرد بے روح کے پاس جاتے، تو حالتِ قلب خراب ہوجاتی اور اطمینان قلب کافور ہوجاتا، اس سے معلوم ہوا کہ اہل اللہ کی حالت ایسے فریبی انسانوں کے پاس خراب ہوجاتی ہے۔

حضور ﷺ کے صادق ہونے کی شہادت:

"وهل كنتم تتهمونه بالكذب قبل أن يقول؟ " ابوسفیان نے کہا کہ ہم اس کو جھوٹ کے ساتھ متہم نہیں کرتے، یعنی جھوٹ بولنا تو کجا کسی نے حضور ﷺ پر اتہام بھی نہیں لگایا، بعض وقت دشمن جھوٹ کا ویسے بھی اتہام لگا دیتے ہیں، حضور کی زندگی ایسی صاف اور پاکیزہ ہے کہ کسی نے بھی اتہام نہیں لگایا، ہرقل نے کہا میں سمجھتا ہوں کہ جو انسان اپنے ایسے انسانوں پر جھوٹ نہیں بولتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کیسے بول سکتا ہے؟ میں نے اس سے سوال کیا تھا کہ اس کی اتباع اُشراف کرتے ہیں یا ضعفاء؟ اس نے کہا کہ ضعفاء، تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کی اتباع ضعفاء ہی کرتے ہیں، بڑے متکبر اور سرمایہ دار لوگ دوسرے کے پیچھے لگنے میں عار سمجھتے ہیں اور یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ انہیں کمزور طبقہ کے لوگوں کے برابر ہونا پڑے گا، بلکہ ان کے پیچھے رہنا پڑے گا، اس لئے ایسے لوگ انبیاء و رسل کی پیروی کرنے میں اپنی توہین اور عار تصور کرتے ہیں، البتہ اس طبقہ کے لوگوں میں سے باوجود متموّل اور صاحب اثر و رسوخ ہونے کے بعض افراد اپنی طبعی شرافت و نجابت اور انکساری کی وجہ سے انبیاء کی اتباع کر لیتے ہیں، جیسے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

حضور ﷺ کے پیروکار بڑھ رہے ہیں:

" سألتك أيزيدون أم ينقصون " میں نے تجھ سے سوال کیا تھا کہ اس کے پیروکار کم ہوتے ہیں یا زیادہ ہوتے ہیں؟ تو تم نے کہا زیادہ ہوتے ہیں، ایمان اسی طرح کامل ہوتا ہے، یہاں تک کہ بعد میں پھر وہ پورا ہوجاتا ہے، لوگ بڑھتے رہتے ہیں۔ میں نے سوال کیا کہ دین کو ناپسند سمجھ کر کوئی مرتد بھی ہوتا ہے؟ طمع اور لالچ کی وجہ سے کوئی اگر مرتد ہوجائے تو دوسری بات ہے، تو نے کہا کہ نہیں، دل میں جب شمع ایمان روشن اور فروزاں ہوجاتی ہے اور انشراح قلب اور اطمینان قلب میسر آجاتا ہے، تو اچھی طرح سوچ سمجھ کر اسلام قبول کرنے والا پھر اس سے روگرداں نہیں ہوتا، میں نے تجھ سے سوال کیا کہ آیا وہ غدر بھی کرتا ہے؟ تو نے کہا نہیں، تجربہ ماضی یہ بتاتا ہے کہ رسول غدر نہیں کرتے ہیں، غدر وہ لوگ کرتے ہیں، جو دنیا دار ہوتے ہیں، ان کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں سے کام نکلے ادھر چلو، چلو ادھر ہوا ہو جدھر کی، یہ قانون صرف سچے لوگوں کے لئے ہے، جھوٹے آدمیوں کے لئے اس کا کوئی فائدہ نہیں، میں نے تجھ سے پوچھا کہ وہ کس کا حکم دیتا ہے؟ تو تم نے کہا وہ یہ حکم دیتا ہے کہ صرف اللہ واحد کی عبادت کرو اور شرک نہ کرو۔

عبادت کی حقیقت:

عبادت کا لفظ قرآن وسنت میں عام ذکر ہوتا ہے اور انسان کی زندگی کا اصل مقصد بھی یہی ہے، مگر اس کی اصل حقیقت سمجھنے میں کچھ کوتاہی ہوئی ہے، عبادت کا حقیقی مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے شرک کے سمجھنے میں بھی غلطی ہوگئی ہے، اگر عبادت صحیح طور پر سمجھ میں آجائے، تو شرک بھی سمجھ میں آجائے گا۔

ا۔شرک بالذات:

اس کا تو کوئی قائل نہیں، ثنویہ فرقہ اس کا قائل ہے، لیکن یہ فرقہ بھی ایک خالق خیر اور ایک خالق شر ماننے کے باوجود دونوں کو برابر نہیں سمجھتا، ایک کو حکیم اور دوسرے کو سفیہ کہتے ہیں، اس کا درجہ کم رکھتے ہیں، لیکن کہتے یہی ہیں کہ عبادت دونوں کی ہونی چاہیے، کیونکہ وہ خالق شر ہے، اس کے شر سے بچنے کے لیے اس کی بھی عبادت کرنی چاہیے اور وہ خالق خیر ہے، اس سے خیر حاصل کرنے کے لیے اس کی عبادت ہونی چاہیے، گویا ایک جیسے دو خداؤں کا کوئی قائل نہیں، ان کے علاوہ جو دوسرے گروہ ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ما سوا کسی چیز کو ازلی اور ابدی تسلیم نہیں کرتے، البتہ ہندو اور بعض فلاسفہ عالم کو بھی قدیم مانتے ہیں، ہندو ارواح کو بھی قدیم مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ غیر متناہی ہیں، زمانے کو بھی قدیم مانتے ہیں، زمانے کی تو کچھ حقیقت ہے، وجود فی الخارج ہے، فلسفی کہتے ہیں وجود فی الخارج ہے، متکلمین خارج میں وجود نہیں مانتے، ہندو ارواح اور مادہ دونوں کو قدیم مانتے ہیں۔

اسلام میں صرف اللہ تعالیٰ عزوجل کی ذات اقدس ہی واجب الوجود ہے، ہندو واجب الوجود کا بھی مطلب نہیں سمجھتے ہوں گے، یہ شرک فی الذات ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ کسی اور کو واجب الوجود سمجھ لیا جائے۔

۲۔شرک فی الصفات:

دوسرا شرک فی الصفات ہے۔دو صفتیں ہیں، جن کے متعلق زیادہ نزاع آتا ہے، ایک علم، دوسری قدرت، ان دو ہی سے شرک پیدا ہوتا ہے، کسی اور شے میں اگر علم غیب سمجھ لیا جائے یا تصرف کی قدرت سمجھ لی جائے اور اس کو مشکل کشا، حاجت روا سمجھ لیا جائے، تو اس سے شرک شروع ہوجاتا ہے، پھر عبادت شروع ہو جاتی ہے،

شرک کی اصل جڑ یہی ہے، اسی لیے قرآن مجید میں اس بات پر بڑا زور دیا گیا ہے کہ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے، اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتا ہے، مختلف مثالیں دے کر اس حقیقت کو آشکارا کیا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [مومن: ٥٧]

''یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا (کام) ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

اسی طرح کی بے شمار مثالوں سے مسئلہ علم غیب اور قدرت کی وضاحت کی گئی ہے، تاکہ لوگ شرک کی دلدل سے بچ سکیں، معبودان باطلہ کے بارے میں قرآن نے صاف طور پر فرمایا ہے کہ ان کے قبضۂ اختیارات میں کچھ نہیں ہے، محض نام کے معبود ہیں، علم وقدرت کی صفات سے کورے ہیں، ارشاد ہے:

﴿ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٩٥]

''کیا ان کے پاؤں ہیں، جن سے وہ چلتے ہیں، یا ان کے ہاتھ ہیں، جن سے وہ پکڑتے ہیں، یا ان کی آنکھیں ہیں، جن سے وہ دیکھتے ہیں، یا ان کے کان ہیں، جن سے وہ سنتے ہیں؟''

گویا کچھ بھی نہیں، دوسرے مقام پر فرشتوں کا ذکر کیا ہے، مسیح کا بھی ذکر کیا ہے، جنوں کا ذکر بھی کیا ہے، سب کے متعلق یہ فتویٰ لگایا گیا ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴾ [بنی إسرائیل:٥٦]

''کہہ! پکارو اب جنہیں تم نے اس کے سوا گمان کر رکھا ہے، پس وہ نہ تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ بدلنے کے۔''



اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی تکلیف دور نہیں کر سکتا:

یعنی یہ تصرف ان میں نہیں ہے، تکلیف کو اٹھا دینا یا تکلیف کو پھیر دینا، ایک سے دوسرے کو لگا دینا، ان کے اختیار و قبضہ میں نہیں، یہاں تفسیروں میں لکھا ہے کہ اس میں مسیح، عزیر اور فرشتے سبھی داخل ہیں، [1] مولوی عمر اچھروی نے بھی اس آیت میں اقرار کیا ہے کہ اس میں فرشتے، مسیح اور عزیر داخل ہیں، لیکن اس کا معنی یہ ہے کہ تم میں سے جو لوگ بزرگوں کو نہیں مانتے، بزرگ ان سے کشف الضر کی طاقت نہیں رکھتے، ﴿لَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَ لَا تَحْوِيْلًا﴾ [بني إسرائيل: ٦]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ بزرگوں کو مانتے ہیں، ان سے تو اٹھاتے ہیں اور جو نہیں مانتے ان کا یہ حال ہے کہ فرشتے، مسیح، عزیر ان سے کوئی تکلیف دور نہیں کر سکتے۔

تمام انبیاء اور لوگ اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں:

﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ﴾

[بني إسرائيل:٥٧)

''وہ لوگ جنہیں یہ پکارتے ہیں، وہ (خود) اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں۔''

قرآن نے کہا ہے کہ جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں، یعنی فرشتے یا مسیح یا عزیر ان کے علاوہ بھی جو کوئی ہے، وہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی وسیلے کے متلاشی ہیں کہ ایسا ذریعہ مل جائے، جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جائے، وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، اچھے اور نیک عمل کرتے ہیں، خود اللہ تعالیٰ کا قرب تلاش کرتے ہیں۔

﴿يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا﴾

[بني إسرائيل: ٥٧]

---

[1] دیکھیں: تفسیر الطبري (٩٤/٨) تفسیر ابن كثير (٦٦/٣) فتح القدير (٣/ ٣٤٠)

''اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں،
بے شک تیرے رب کا عذاب وہ ہے جس سے ہمیشہ ڈرا جاتا ہے۔''

اس میں اگرچہ لفظ نہیں ہے، مگر شان نزول یہی ہے، جن، فرشتے وغیرہ اس میں داخل ہیں، دوسری آیت میں صراحت آ چکی ہے اور مسیح علیہ السلام کا ذکر آیا ہے:

﴿ مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ﴾

[المائدہ: ۷۵]

''نہیں ہے مسیح ابن مریم مگر ایک رسول، یقیناً اس سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے اور اس کی ماں صدیقہ ہے، دونوں کھانا کھایا کرتے تھے، دیکھ ان کے لیے ہم کس طرح کھول کر آیتیں بیان کرتے ہیں۔''

﴿ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ﴾

[المائدہ:۷٦]

ایسی چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو جو تمہارے لئے ضرر و منفعت کا اختیار نہیں رکھتیں۔

یعنی مسیح کے ہاتھ میں نفع و ضرر نہیں، صاف لفظ آ گئے، نہ اس کے ہاتھ میں ہے اور نہ اس کی ماں کے ہاتھ میں، ''ما'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ ''ما'' غیر ذوی العقول کے لیے ہے، اس واسطے اس کا مطلب یہ ہے کہ ضرر و منفعت کے عدم اختیار میں عقلمند بھی بے عقل کی طرح ہی ہے، '' ما '' کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ گویا مسیح اور بتوں میں کوئی فرق نہیں، یعنی ایسے شخص کو چیز ہی بنا دیا ہے، شخص نہیں کہا، گویا ایسی بے جان چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو، وہی لفظ یہاں استعمال کیا گیا ہے:

﴿ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴾ [المائدہ:٧٦]

''کیا تم اللہ کے سوا اس چیز کی عبادت کرتے ہو، جو تمہارے لیے نہ کسی نقصان کی مالک ہے اور نہ نفع کی۔''

معبودان باطلہ کی عبادت کیوں؟

خدائے قادر وقدیر اور علیم وخبیر کو چھوڑ کر معبودان باطلہ اور خود ساختہ بتوں کی عبادت یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ یہ ان کی مشکلات حل کر دیں گے، ان کی پوجا کی اس سے اور کیا غرض اور وجہ ہو سکتی ہے؟ کسی کی عبادت کوئی اسی لئے کرتا ہے کہ پہلے اسے حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ لیتا ہے، پھر اس کی پوجا پاٹ اور عبادت کرتا ہے۔

ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ محرفین کتاب اللہ ہوتے ہیں، اصل اور حقیقی مفہوم ومطلب کو نظر انداز کر کے اپنی من مرضی کا غلط معنی کر دیتے ہیں، تاکہ ان کا مقصد حاصل ہو جائے، ان پڑھ اور کم علم و عقل اور سادہ لوح عوام یہ سمجھ لیتے ہیں کہ شائد کتاب اللہ میں یہ لکھا ہے کہ لوگ مشکل کشا اور حاجت روا ہیں، مثلاً قرآن کی اس آیت کا معنی ملاحظہ ہو:

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ [الجاثیہ:١٣]

''اس نے تمہاری خاطر جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کو اپنی طرف سے مسخر کر دیا۔''

اس آیت کی تاویل میں کہتے ہیں کہ اس سے مراد انبیاء اور اولیاء اللہ ہیں، انبیاء اور اولیاء کے لئے زمین و آسمان کی جملہ چیزیں مسخر ہیں، جس طرح چاہیں ان میں تصرف کریں، سورج بھی ان کے حکم سے طلوع ہوتا ہے، انہیں کے فرمان سے غروب

ہوتا ہے، البتہ اولیاء کے مراتب ہیں، ایک مرتبہ ہے قیومیت کا، چار قیوم گزرے ہیں، ان کو اختیار ہوتا ہے کہ جب تک وہ حکم صادر نہ فرمائیں، سورج مشرق سے طلوع نہیں ہوسکتا۔ اس قسم کی اور بہت سے لایعنی اور بے معنی تاویلیں اور تحریفیں کرتے ہیں، جن سے عوام فریب کاری اور دھوکے کا شکار ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ تسخیر کا یہ مطلب ہرگز نہیں، جو ان حضرات نے بیان کیا ہے، تسخیر شمس وقمر اور تسخیر کائنات سے یہ مراد ہے کہ جس کام پر انہیں مامور کیا گیا ہے، وہ تمہارے فائدے کے لیے ہے:

﴿وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ﴾

[إبراهيم: ٣٣]

''اور تمہاری خاطر سورج اور چاند کو مسخر کردیا کہ پے در پے چلنے والے ہیں اور تمہاری خاطر رات اور دن کو مسخر کردیا۔''

انہیں تمہارے فائدے کے لیے مامور کر دیا، حالانکہ یہ معنی پہلے کسی نے نہیں کیا، نہ صحابۂ کرام نے اور نہ کسی امام نے، یہ چیزیں تو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ہیں، پھر تم غیر اللہ کی پوجا کیوں کرتے ہو؟ نافع اور مفید تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے۔

سیدنا مسیح علیہ السلام بھی کچھ نہیں کر سکتے:

مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کا قرآن نے خاص طور پر ذکر کیا ہے، یہ ذوی العقول میں سے تھے، پیغمبر بھی تھے، ماں صدیقہ تھی، صدیق کا مرتبہ عوام الناس میں سب سے اونچا ہوتا ہے اور انبیاء کا مرتبہ دوسرے سب لوگوں سے اونچا ہوتا ہے، ان کے ذکر کے بعد تو کوئی شبہ نہیں رہنا چاہیے کہ یہ کچھ نہیں کر سکتے، قیامت کے روز اسی لئے اللہ تعالیٰ مخاطب ہوکر مسیح علیہ السلام سے دریافت فرمائے گا:

﴿ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾

[المائدة: ١١٦]

”کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بنا لو؟“

بعض عیسائی کہتے ہیں کہ ہم مریم کو الٰہ نہیں سمجھتے، اس کے لڑکے کو الٰہ سمجھتے ہیں، لیکن یہ لوگ ان کی والدہ کے ساتھ جو معاملہ کرتے ہیں، اسلام میں الٰہ بنانے کے وہی معنی ہیں، عام طور پر مصیبت کے وقت پادری عیسائیوں کو دعا سکھاتے ہیں کہ اے خدا کی ماں! میری اس مصیبت میں خدا یسوع مسیح کے آگے سفارش کرنا کہ مشکل دور ہو، اسلام میں الٰہ کا یہی معنی ہے، اسلام میں الٰہ بمعنی خالق نہیں، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔

الٰہ کا معنی:

الٰہ کا معنی یہی ہے کہ کسی کو عام سلسلۂ اسباب کے علاوہ مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ لیا جائے، سلسلۂ اسباب میں کسی کو یہ سمجھنا کہ فلاں میری ضرورت پوری کرتا ہے، یہ الگ چیز ہے، اس کے متعلق تو قرآن کا ارشاد ہے:

﴿ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ﴾ [المائدہ:۲]

برّ اور تقویٰ میں ایک دوسرے سے تعاون کرو۔

موسیٰ علیہ السلام سے استغاثہ:

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آتا ہے کہ ایک اسرائیلی اور قبطی باہم دست بگریباں تھے، ادھر موسیٰ علیہ السلام کا گزر ہوا، اسرائیلی نے فریاد رسی کے لیے درخواست کی:

﴿ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِىْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِىْ مِنْ عَدُوِّهٖ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ﴾ [القصص: ۱۵]

”تو جو اس کی قوم سے تھا اس نے اس سے اس کے خلاف مدد مانگی جو اس کے دشمنوں سے تھا، تو موسیٰ نے اسے گھونسا مارا تو اس کا کام تمام کر دیا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گھونسہ دے مارا اور اس کا کام تمام ہو گیا، اس قسم کا اغاثہ یا طلب اعانت جائز ہے، کیونکہ اس میں مستغیث یہ سمجھ کر فریاد رسی کی اپیل نہیں کرتا کہ وہ حقیقی طور پر اس کا مشکل کشا اور حاجت روا ہے، یہاں استغاثہ صرف بشری قدرت کے مطابق ہی لیتا ہے، جس سے فریاد رسی کی جائے، اس کو حکم ہے کہ مدد کرے: ﴿ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ﴾ [المائدہ: ۲]

جائز اور ناجائز استغاثہ:

یہ زیر بحث نہیں ہے، بلکہ زیر بحث یہ ہے کہ جس وقت انسان کی اپنی کوشش سلسلۂ اسباب میں ختم ہو جاتی ہے، تو پھر غیبی سہارا تلاش کرتا ہے، تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار نہیں، قرآن نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ جو چیز وہ ان سے مانگتے ہیں، وہ دے نہیں سکتے، ایسی چیز میں جو اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے، ایسی جگہ میں اس سے مدد لیتا ہے یا وہ کر تو سکتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتا، وہ بھی نہ کرنے کے برابر ہی ہے، مثلاً فرشتے ہیں، سب کچھ کر سکتے ہیں، چونکہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اور تابع ہیں، وہ بحکم تفویض جو کام ان کے سپرد ہوا، وہی کریں گے۔

عزرائیل سے اب کوئی مدد نہیں لے سکتا کہ میرا بیٹا اکلوتا بیٹا ہے، اسے چھوڑ دینا چاہیے، آج تک اس قسم کی درخواست کسی نے ان سے کی بھی نہیں، کیونکہ ہر ایک سمجھتا ہے کہ عزرائیل کسی کی نہیں مانتا، عزرائیل اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جان قبض کرتا ہے، دوسرے فرشتے بھی اسی طرح ہیں، دو فرشتے ہمارے ساتھ بھی رہتے ہیں، ان سے اگر ہم یہ کہیں کہ ہماری مدد کرو، تو یہ بھی جائز نہیں، اس لئے کہ ان کو اجازت ہی نہیں، وہ وہی کام کرتے ہیں جن کا انہیں حکم دیا گیا ہے، ان فرشتوں کو یہ کہنا بھی درست نہیں کہ مجھے صبح بیدار کر دیں، فرشتوں سے براہ راست اس قسم کی درخواست

کرنا درست نہیں کہ اسے صبح جگا دیں، یہ صرف اللہ تعالیٰ سے کہنا چاہیے، اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا، یہ الگ چیز ہے۔

تفویض و تکلیف:

اسی طرح بزرگوں کی حالت ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ بزرگ جب فوت ہوجاتے ہیں یا انبیاء جب وفات پا جاتے ہیں، تو ملائکہ میں ان کی ارواح کا دخول ہوجاتا ہے، فرشتوں میں ارواح کے داخل ہونے کا مطلب یہی ہے کہ جس طرح فرشتے کام کرتے ہیں، اسی طرح وہ کام کرتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی کام پر لگا دیا ہے، تو وہ بحکم تفویض کرتے ہیں، یہ نہیں کہ انہیں کلی اختیار دے دیا گیا ہے کہ جو چاہے ان سے مدد لے اور وہ ان کی مدد کریں، اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ارواحِ انبیاء فرشتوں میں داخل ہو جاتی ہیں، تو ان کے اعمال بحکم تفویض ہوتے ہیں، بحکم تکلیف نہیں۔ [1]

دنیا میں انسان مکلف ہوتا ہے، ثواب لینے کے لیے دعا کرتا ہے، آگے اللہ تعالیٰ قبول کرے یا نہ کرے، مرنے کے بعد وہ دعا نہیں کرسکتا، کیونکہ وہی کام جو اس کے سپرد ہے، اگر یہ تفویض ہوئی کہ کوئی اگر تم سے کام لینا چاہے، تو اس کی مدد کرو، تو اس کا ذکر آنحضرت ﷺ علانیہ کرتے، کیونکہ یہ بہت بڑی چیز تھی، اس پر صحابہ کرام عمل کرتے، اس قسم کا کوئی ایسا واقعہ نہیں سوائے ایک شخص کے، جس نے کہا تھا [2] کہ بارش کی دعا کرو، اس کے سوا اور کوئی ثابت نہیں، اگر یہ چیز ہوتی تو عام صحابہ اس طرح کرتے، جب کوئی مشکل پیش آتی یا مصیبت میں مبتلا ہوتے تو روضۂ پاک پر جا کر

---

[1] یعنی اصل بات یہی ہے کہ ارواحِ انبیاء فرشتوں میں داخل نہیں ہوتیں، کیونکہ قرآن وسنت سے اس کی کوئی دلیل نہیں۔ (ناشر)

[2] یہ روایت ثابت نہیں ہے، تفصیل کے لیے دیکھیں: سنن الدارمي (١/٥٦) الكامل في الضعفاء (١/٤١١، ٥/١٥٠)

کہتے کہ حضور دعا کریں، لیکن نبی ﷺ نے کسی حدیث میں یہ نہیں بتایا کہ فوت ہونے کے بعد میری قبر پر آنا اور دعا کرنا اور نہ صحابۂ کرام نے ایسا کام کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد انسان خواہ اس کا کتنا بلند اور بڑا مقام کیوں نہ ہو، وہ جو کام کرتا ہے، بحکم تفویض ہی کرتا ہے۔

حضور ﷺ کا امت کے لیے استغفار:

کہا جاتا ہے کہ حضور ﷺ ہمارے لیے استغفار کرتے ہیں یا سلام پڑھا جائے تو اس کا جواب دیتے ہیں،[1] یہ ایک قسم کی دعا ہے، اس قسم کی چیزیں تو ثابت ہیں، باقی اس سے زیادہ کہ آپ سے مدد لی جائے اور آپ ہمارے لئے دعا کریں، اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں آیا، ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز جائز نہیں، صحیح بات تو یہی ہے، جیسا کہ ابن تیمیہ وغیرہ کا خیال ہے کہ قبر پر جا کر درخواست کرنا درست نہیں، مگر اسے انہوں نے شرک قرار نہیں دیا، صرف یہ کہتے ہیں کہ اس کا ثبوت نہیں ہے۔[2]

جن اور ملائکہ سے مدد مانگنا:

یہ مسئلہ ضمناً بیان کر دیا گیا ہے، ورنہ بات یہ چل رہی تھی کہ فرشتوں میں قدرت تو ہے، اس کے باوجود ان سے مدد اس لئے نہیں لی جا سکتی کہ ان کے اعمال بحکم تفویض ہیں، بحکم تکلیف نہیں کہ ان کو تکلیف دی گئی ہو کہ لوگوں کی مدد کرو۔

باقی جن رہ جاتے ہیں، بعض ایسے امور میں جن انسان کی مدد کر سکتے ہیں،

---

[1] استغفار کرنے کا کوئی ثبوت نہیں، البتہ سلام کا جواب دینے کا ذکر بعض احادیث میں موجود ہے، دیکھیں: سنن أبي داود، برقم (٢٠٤١)

[2] لیکن قبر پر جا کر صاحب قبر سے استغاثہ کیا جائے گا، یا اس عقیدے کے تحت دعا کی جائے گی کہ صاحب قبر ہماری دعا سن رہا ہے، یا وہ دلوں کے حال سے واقف ہے اور وہ اللہ کی بارگاہ میں ہماری سفارش کرے گا، یہ دونوں صورتیں شرک ہیں۔ أعاذنا الله منها (ناشر)

جن امور پر انسان کی مقدرت نہیں، لیکن جنوں میں اس کی قدرت ہے، مگر ہمیں اس سے استغاثہ کی اجازت نہیں، اس لئے کہ جنّ ہمارے دشمن ہیں، وہ تو موقع کے متلاشی رہتے ہیں کہ لوگ ان کی طرف رجوع کریں، ان کی عبادت ہو، ان کی بڑائی ہو، اس واسطے شریعت نے روک دیا ہے کہ ان سے مدد کی درخواست کی جائے:

﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ وَ قَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ﴾ [الأنعام: ١٢٨]

"اے جنوں کی جماعت! بلاشبہ تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا بنا لیا اور انسانوں میں ان کے دوست کہیں گے، اے ہمارے رب! ہمارے بعض نے بعض سے فائدہ اٹھایا۔"

استمتاع یہی تھا کہ لوگ ان کو پکارتے تھے، چڑھاوے وغیرہ ان سے لے لیتے تھے، یہ جنوں کی مدد ہوگئی، وہ چوری چوری ان کی مدد کرتے تھے۔

﴿ وَّ بَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ ﴾ [الأنعام:١٢٨]

"اور ہم اپنے اس وقت کو پہنچ گئے، جو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا، فرمائے گا آگ ہی تمہارا ٹھکانا ہے۔"

استمداد کے لیے چار چیزیں ضروری ہیں:

کسی سے مدد لینی ہو تو اس کے لیے چار چیزوں کا ہونا ضروری ہے، یہ بات سمجھنے والی ہے:

۱۔ پہلی چیز تو یہ کہ اسے ہمارے اس استغاثے کا علم ہونا چاہیے، جو ہم اس سے کر رہے ہیں کہ ہمیں روٹی دو، پتھر سے یہ کہنا شروع نہ کر دے کہ اے پتھر! ہمیں روٹی دو یا ایک آدمی سو رہا ہے اور اسے معلوم ہے کہ وہ سو رہا ہے جاگتا نہیں، یا ایسی جگہ میں بیٹھا ہے کہ سنتا نہیں، ایسے آدمی سے فریاد کرنا، ضرورت طلب کرنا

درست نہیں، کیونکہ اسے مستغیث کی کسی قسم کی حرکت کا علم ہی نہیں۔

۲۔ دوسری چیز یہ ہے کہ اسے قدرت ہونی چاہیے کہ جو کام ہم اس سے مانگتے ہیں، اس کے کرنے کی اس میں قدرت ہے، اگر قدرت ہی نہیں تو کام کیسے کرے گا؟۔

۳۔ تیسری چیز یہ ہے کہ اس قدرت کے استعمال کی اسے اجازت بھی ہونی چاہیے، اس صورت میں فرشتے نکل جائیں گے، کیونکہ ان کو یہ اجازت نہیں ہے کہ اپنی قدرت کو جس طرح چاہیں استعمال کریں۔

۴۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ ہم کو بھی اس سے مدد لینے کی اجازت ہو، یہ نہ ہو کہ کسی مصلحت کی بنا پر روک دیا گیا ہو کہ اگر ان سے مدد مانگیں گے تو انکار کر دیں گے:

﴿ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا﴾ [الجن: ٦]

''بلاشبہ بات یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے بعض لوگوں کی پناہ پکڑتے تھے، تو انہوں نے ان (جنوں) کو سرکشی میں زیادہ کر دیا۔'' وہ جنوں سے پناہ مانگتے تھے۔

جن وشیاطین کی مدد:

ابن کثیر نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک آدمی کسی جنگل میں چلا گیا اور اپنی عادت کے مطابق اس نے اس وادی کے جن سردار سے " فأعوذ بسيد هذا الوادي" کہہ کر پناہ مانگی، اس کے پاس بکریاں تھیں، وہ کہہ کر ابھی خاموش ہی ہوا تھا کہ ایک جانب سے بھیڑیا آیا اور ریوڑ میں سے ایک بکری اٹھا کر لے گیا، اس نے پھر کہا:

" يا سيد هذا الوادي إني أستعيذ بك " اے سردار وادی میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں، مگر بھیڑیا میری بکری لے گیا ہے، اسی وقت دوسری طرف سے ایک اور جانور جو اس بھیڑیے سے بڑا تھا، بھیڑیے کے پیچھے لگا ہوا ہے، بھیڑیا آگے اور وہ

پیچھے حتی کہ اس بھیڑیے نے بکری چھوڑ دی، بکری بچ گئی۔ [1]

یہ واقعہ لکھنے کے بعد توجیہ یہ کی ہے کہ بھیڑیے کی صورت میں شیطان گمراہ کرنے آیا تھا، پہلے شیطان نے بصورت بھیڑیا بکری پکڑ لی اور دوبارہ فریاد رسی پر دوسرا بڑا شیطان اس کے پیچھے ہولیا، تو پہلے نے بکری چھوڑ دی، تاکہ اس کا عقیدہ پختہ ہو جائے کہ شیطان و جنات واقعی ہماری مدد کرتے ہیں، شیطان تو انسان کو گمراہ ہی کرتا ہے۔

مدد کس سے مانگی جائے؟

اصل بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ سمجھنا ہی بڑا مشکل ہے کہ یہ چار چیزیں اس میں جمع ہیں یا نہیں؟ پہلی چیز علم، دوسری قدرت اور تیسری یہ کہ اسے اس قدرت کے استعمال کی اجازت بھی ہو، اس میں اولیاء اللہ کے ارواح بھی آجاتے ہیں، وہ بحکم تکلیف کام نہیں کرتے، وہ بحکم تفویض کام کرتے ہیں، [2] اس واسطے ان کو اجازت نہیں کہ خود بخود ہی جس کی چاہیں مدد کریں، جن کے نزدیک وہ فرشتوں کے زمرے میں داخل ہوگئے ہیں، ان کے کچھ افعال اس قسم کے ہیں کہ وہاں ان کے ارواح حاضر ہوجاتے ہیں، وہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حاضر ہوتے ہیں، چوتھی چیز یہ کہ ہمیں بھی ان سے مدد لینے کی اجازت ہونی چاہیے، یہ چار چیزیں جب اچھی طرح ذہن نشین ہوجائیں، پھر قرآن و حدیث کا مطالعہ کرے، تو یہ بات اچھی طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/ ٥٥٠)

[2] ارواح اولیاء کا بحکم تفویض کام کرنا، یہ قرآن و سنت سے ثابت نہیں ہے، اس کی مزید وضاحت مولف رحمہ اللہ نے آگے بیان کر دی ہے۔

بزرگ علم غیب نہیں جانتے:

عام طور پر بزرگوں کے متعلق عوام کے ذہن میں پہلی چیز علم غیب ہی ہوتی ہے، کہتے ہیں کہ بزرگ بھی علم غیب رکھتے ہیں، یہ نظریہ سرے سے ہی درست نہیں، مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانی کو لیجئے، وہ صرف عربی زبان جانتے ہیں، دوسری کسی زبان کے ماہر نہیں، اگر مان لیا جائے کہ وہ دوسری زبان سے بھی شناسائی رکھتے ہیں، تو اتنی لمبی مسافت اور دور سے سن بھی نہیں سکتے، جب فریاد رس کی فریاد سنتے ہی نہیں، تو فریادرسی کس طرح کریں گے؟

بعض لوگ یہاں یہ سمجھتے ہیں کہ خاص آدمیوں کے معاملات بھی خاص ہوتے ہیں، ان کا تعلق شیخ عبدالقادر جیلانی سے ہوجاتا ہے، پھر شیخ عبدالقادر انہیں نظر آنے لگتے ہیں، سوال یہ ہے کہ جو کچھ ان خاص حضرات کو نظر آتا ہے، انہیں کیا معلوم کہ وہ کیا ہے؟ اس نے تو شیخ صاحب کی شکل وصورت دیکھی ہی نہیں، دیکھا بھی اگر ہو تو شیطان بھی اس شکل میں آسکتا ہے، کیونکہ وہ پیغمبر تو نہیں، پیغمبر کی شکل میں شیطان نہیں آسکتا، پھر پیغمبر علیہ السلام کو بھی ہم نے دیکھا نہیں، اُس زمانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم شکل آدمی پندرہ کے قریب تھے، کیا بعید ہے ان میں سے کسی کی شکل وصورت میں آجائے؟

کیسے امتیاز ہوگا جب کہ ہم نے دیکھا ہی نہیں؟ اس واسطے شیطان یہاں بھی دھوکہ دے سکتا ہے، خاص اور عام کا کوئی فرق نہیں، مولوی اشرف علی تھانوی نے بھی ایک جگہ لکھ دیا ہے کہ خواص کے لیے کوئی حرج نہیں، کیونکہ ان کا تعلق عالم مثال سے قائم ہوتا ہے، اس میں وہ حاضر ہوجاتے ہیں۔

علماء کی غیر محتاط باتیں:

ایک دفعہ انور شاہ صاحب لاہور تشریف لائے، مولوی نجم الدین وہاں پروفیسر تھے، ان کے ہاں ان کا قیام تھا، کسی نے مسئلہ پوچھا کہ "یا شیخ عبد القادر جیلانی

شیئا للّٰہ " پڑھنا جائز ہے؟ انہوں نے کہا مولوی رشید احمد گنگوہی کے دو قول ہیں، بعض جائز سمجھتے ہیں اور بعض ناجائز، مولوی نجم الدین نے کہا مولوی صاحب! ہم نے یہاں شرک اکھاڑنے میں سخت محنت کی تھی، آپ نے ایک لفظ میں ساری محنت و کاوش پر پانی پھیر دیا، یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ سن کر خاموش ہوگئے۔

اس قسم کی باتوں سے کم علم اور باطل عوام دلیل پکڑتے ہیں کہ چلو مولوی اشرف علی نے خواص کے لیے جائز کہہ دیا ہے، بس ٹھیک ہے، دیوبندی مکتب فکر کے عالم فاضل آدمی ہیں، غلط تھوڑا کہا ہے! لہٰذا ہر شخص خواص کو آواز دے سکتا ہے اور ان کے زمرہ میں داخل ہوسکتا ہے، کیونکہ خواص وہی تو ہیں جنہیں نظر آجائے اور تعلق پیدا ہوجائے، اس کے وہ سامنے ہے، اس کا سینہ کھل گیا، کیسی فضول اور نا معقول بات ہے، ابلیس کو پکارو تو اسی وقت سینہ کھل جائے گا اور چودہ طبق روشن ہوجائیں گے!

پیر یعقوب کا واقعہ:

مریدکے میں ایک پیر یعقوب تھے، کسی آدمی نے ان سے کہا کہ ایک آدمی میرا مخالف ہے، مجھ سے بڑی دشمنی رکھتا ہے اور بہت تنگ کرتا ہے، مجھے کوئی وظیفہ بتاؤ کہ وہ تنگ کرنے سے باز آجائے، پیر یعقوب نے کہا سورۂ ناس پانچ سو مرتبہ پڑھ کر "أیھا الوسواس الخناس" کو بلا کر کہو:

"اذھبوا إلیٰ فلان بالسیوف والحراب واذکروا عندہ اسمي و کنیتي"

اس نے اسی طرح پڑھا، شیطان اسی وقت اس کے دشمن کے گھر چلا گیا، اسے بڑا ڈرایا، گویا کوئی اسے مارنے آیا ہے، اس نے بھیجنے والے کا نام بھی بتایا تھا، اس لئے وہ صبح سویرے آیا کہ مجھے معاف کردو، آج کے بعد میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا، دیکھا شیطان کو اس نے مدد کے لیے پکارا، تو کتنی جلدی مدد کو پہنچا اور کام کر دیا، یا ابلیس کہو،

پھر دیکھو وہ کتنی جلدی آتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ یہ اب میرا چیلہ بن گیا ہے، سورۂ ناس پڑھنے سے مقصد یہ تھا کہ پڑھنے والے کو یقین ہو جائے کہ وہ قرآن پڑھ رہا ہے۔

"یاشیخ عبدالقادر شیئاً للہ" کا وظیفہ

یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں خواص میں سے ہوگیا ہے اور اس کا تعلق عالم مثال میں شیخ عبدالقادر سے ہوگیا ہے، تو "یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاللّٰہ" کہنے میں کیا حرج ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ بریلوی عام کے لیے سمجھتے ہیں اور دیو بندی خواص کے لیے، فیض الباری میں ایک جگہ لکھا ہے کہ یہ کلمہ نہیں کہنا چاہیے:

"من قال شیئاً للہ بعض یکفر یخشی علیه الکفر بعض یقرر"

کون مدد کرتا ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ جس میں متذکرہ بالا چار چیزیں ہوں، اس سے استغاثہ کرنا چاہیے، دنیاوی امور اور ان چار چیزوں میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ مستغیث کو علم ہوتا ہے کہ ایک شخص سامنے بیٹھا ہے، وہ روٹی دے سکتا ہے، اور روپیہ پیسہ پکڑا سکتا ہے، اگر اس کے پاس ہے، تو اس طرح مدد لینی اور مدد دینی دونوں جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، مسئلہ تو یہ ہے کہ جو چیزیں انسان کے بس کی نہیں، اگر چہ فرشتوں کے بس میں ہوں، جنوں کے بس میں ہوں، ایسی چیزوں میں انسان سے استغاثہ کرنا جائز نہیں، خواہ زندہ ہو یا مر گیا ہو، مرنے کے بعد تو اس سے دعا ہی کرائے گا،[1] دعا کے علاوہ اگر کہے کہ مجھے دو، تو وہ بھی شرک ہو جائے گا، دنیا کی زندگی میں بھی اگر کہے کہ مجھے اولاد دے، تو بھی شرک ہو جائے گا، ہاں اولاد دینے کا مطلب اگر یہ ہو کہ میرے لئے اولاد کی دعا کرو اور یہ مجازاً کہتا ہے، تو اس

[1] مراد یہ ہے کہ فوت شدہ شخص سے دعا کرانے کا بھی ثبوت نہیں، جب وہ سن ہی نہیں سکتا، تو یہ کہنا کہ آپ ہمارے لیے دعا کریں، کیونکہ صحیح ہوگا؟ (ناشر)

صورت میں شرک نہیں ہوگا، مگر اللہ کے ہاں ٹھیک نہیں، مجازاً مثلاً ایک شخص بیمار ہے، مولوی صاحب سے کہے کہ مجھے اچھا کردو، مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سے میری تندرستی اور صحت کی دعا کرو، تو اسے شرک نہیں کہا جائے گا۔

جنوں سے مدد لینا:

جنوں سے اس وقت مدد لے سکتا ہے، جب وہ خود بخود مدد کریں، یعنی از خود کام کر دیں، لیکن یہ کہنا کہ میری مدد کرو، اس سے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں، شریعت نے انسانوں اور جنوں کا استمتاع روک دیا ہے، کیونکہ ہمیں علم نہیں کہ جن شریر ہے یا شریف؟ جنوں سے بھلائی کی توقع رکھنا کار بے سود ہے، ان کا اصل مشن تو انسان کو گمراہ اور بد راہ کرنا ہے، نہ کہ خیر خواہی اور بھلائی کرنا، جنوں سے مقاطعہ یعنی بائیکاٹ قسم کا معاملہ ہے، تو ان کی بات قابل اعتماد اور قابل بھروسہ نہیں، کیونکہ وہ دھوکہ باز اور فریب کار ہوتے ہیں، قسم کھا کر مکر جاتے ہیں، حالانکہ اپنے آپ کو بڑے پکے مسلمان اور مومن کہتے ہیں، ڈپلومیسی چال چلتے ہیں، دعویٰ ایمان کا رکھتے ہیں، قسمیں بھی اٹھاتے ہیں، معلوم نہیں کس قسم کے مسلمان اور مومن ہیں؟

جنات کی تسخیر:

جنات کی تسخیر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو، تو ''ایں چیزے دیگر است'' جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسخر کر دیا تھا:

﴿ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّاۤءٍ وَّغَوَّاصٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۝ هٰذَا عَطَاۤؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ ﴾

[ص: ۳۷، ۳۸، ۳۹]

''اور شیطانوں کو، جو ہر طرح کے ماہر معمار اور ماہر غوطہ خور تھے، اور کچھ

اوروں کو بھی (تابع کر دیا) جو بیڑیوں میں اکٹھے جکڑے ہوئے تھے، یہ
ہماری عطا ہے، سو احسان کر، یا روک رکھ، کسی حساب کے بغیر۔"

ایک مرتبہ نبی ﷺ نے ایک جن کو پکڑ لیا، جو آپ کی نماز خراب کرنے آیا تھا، آپ نے فرمایا" لولا دعوة أخي سليمان " اگر میرے بھائی سلیمان کی دعا نہ ہوتی، تو میں اسے باندھ دیتا، میرا ارادہ تھا کہ اسے ستونوں سے جکڑوں اور تم اسے جکڑا ہوا دیکھتے، لیکن سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد آ گئی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جناب سے تسخیرِ جنات حضرت سلیمان علیہ السلام کی تخصیص ہے، میں نے اس شوریدہ سر جن پر اپنی روحانی قوت کے بل بوتے پر قابو پایا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی مدد تو نہیں ہے، جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کو تھی، ایسا نہ ہو کہ دوسرے شیاطین مجھے اذیت پہنچائیں یا میرے اہل وعیال کو تکلیف دیں یا اہل ایمان کو تکلیف دیں۔ اس واسطے میں نے اسے چھوڑ دیا باندھا بھی نہیں، حالانکہ وہ جن بڑا سرکش تھا، اس نے شرارت بھی کی تھی کہ نبی ﷺ کی نماز توڑ دے، اس کے لئے ایک انگارا بھی لایا تھا کہ اسے آپ پر پھینک دے اور آپ کی نماز ٹوٹ جائے، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے " أعوذ بالله منك "بھی پڑھا، وہ پیچھے نہ ہٹا۔ " ألعنك بلعنة الله "کہا، پھر بھی پیچھے نہ ہٹا، پھر " أمكنني الله منه "اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قابو دیا، " فذعته " پھر میں نے اس کا گلہ دبایا، اس وقت مجھے اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد آ گئی اور میں نے اسے باندھے بغیر ہی چھوڑ دیا،[1] اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ ان سے مدد نہیں لینی چاہیے۔

---

[1] صحيح البخاري: أبواب العمل في الصلاة، باب ما يجوز من العمل في الصلاة، رقم الحديث (١١٥٢) صحيح مسلم: كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب جواز لعن الشيطان في أثناء الصلاة والتعوذ منه وجواز العمل القليل في الصلاة، رقم الحديث (٥٤١)

جنات پر سختی کرنا:

بعض لوگ جو جنات نکالتے ہیں، وہ ان پر بغیر سوچے سمجھے بسا اوقات سختی کرتے ہیں، اگر شرعاً وہ سختی جائز ہو، پھر تو کوئی حرج نہیں، مثلاً کسی عورت کو جن چمٹ جائے، عورت اجنبی ہو، تو اسے مس کرنا جائز نہیں ہوتا، اس جگہ سختی کرے تو کوئی حرج نہیں، اگر آدمی کو لگ جائے اور جن یہ کہے کہ اس نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے، اس صورت میں اس کے ساتھ انصاف سے بات کرے، اگر اس کا رویہ ظالمانہ ہو تو اس کو مار بھی سکتا ہے، بعض وقت جن بہت شریر اور خبیث بھی ہوتے ہیں، اس لئے نکالنے والا پہلے اپنی طاقت دیکھ لے، ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی یہی مشورہ دیتے ہیں کہ پہلے اپنی قوت کا اندازہ لگا لے۔

ایک عامل کا واقعہ:

بعض لوگ جنات کو مسخر کرنے کے لیے وظیفہ کرتے ہیں، ایسے آدمی کو ہر وقت باوضو رہنا پڑتا ہے، پاک وصاف رہنا پڑتا ہے، ہندوستان میں ایک آدمی تھا، اس نے جن مسخر کئے ہوئے تھے، اس کا مال باہر تھا، اگر کوئی چور مال چوری کرنے یا پھل توڑنے آجاتا، تو جن اسے پکڑ کر درخت کے اوپر الٹا لٹکا دیتے، نیچے نہیں اتر سکتا تھا، اس نے بڑے بڑے آدمیوں کو اپنی تسخیر کا قائل کرلیا، جنات اس کی قید سے کافی نالاں تھے، ایک مرتبہ وہ صاحب جنبی تھے، ابھی غسلِ جنابت نہیں کیا تھا، جنات آئے اور کہنے لگے مولوی صاحب ایک مسئلہ دریافت کرنا ہے، ذرا باہر تشریف لائیں، مولوی صاحب اسی حالت میں باہر آگئے اور اپنی حالت بھول گئے، جنوں نے اسے پکڑ لیا، خوب گوشمالی کی اور ایک کنویں میں پھینک دیا، اس کنویں میں ایک طرف خشکی تھی، وہاں مولوی صاحب نے وضو کیا اور غسل کر کے پاک ہوئے، پھر بیٹھ کر وظیفہ پڑھا،

جن پھر آ گئے اور کنویں سے باہر نکال لیا، یہ جنات اس طرح بھی کرتے ہیں، اس لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

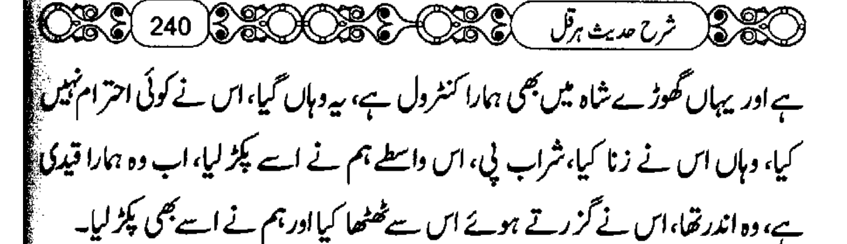
لوگ کیوں گمراہ ہوتے ہیں؟

شرک کا ذکر ہو رہا تھا، اس ضمن میں چار چیزوں کا ذکر کیا گیا تھا، عوام الناس عام طور پر بزرگوں اور خانقاہوں کے متعلق جو خیال پیدا کر لیتے ہیں، ان کی صورت یہی ہوتی ہے کہ بعض ایسے واقعات ہوتے ہیں، جن کی بنا پر وہ سمجھتے ہیں کہ وہ مشکل کشا اور حاجت روا ہیں، لوگ یہ مقصد، جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، قرآن کی تحریف کر کے حاصل کرتے ہیں یا بعض اوقات طبیعیات کے شعبدے ہوتے ہیں، ان کو اس کا علم نہیں ہوتا اور کبھی کبھی شیاطین کی شرارتیں ہوتی ہیں، جسے لوگ بزرگوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

جنات کے تسلط کی حقیقت:

ایک عورت کو جن چمٹ گیا، مجھے بلایا گیا، جب میں گیا، تو معلوم ہوا کہ وہ جن اہلحدیث ہے، اس نے بتایا کہ قبروں پر جو کچھ ہوتا ہے، وہ سب کچھ ہم ہی کرتے ہیں، بزرگوں کا تو صرف لوگ نام ہی لیتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے یہ کیا اور فلاں نے یہ کیا، جو کچھ وہاں ہوتا ہے، سب کچھ ہم جن ہی کرتے ہیں۔

یہاں ایک آدمی کو بھی جن چمٹ گیا، مجھے وہاں بھی بلایا گیا، میں گیا اور اس جن کو حاضر کیا، میں نے اس سے پوچھا کہ تو نے اسے کیوں پکڑا ہے؟ اس نے کہا اس نے گزرتے ہوئے ہمارے قیدی کے ساتھ مذاق اور مسخری کی ہے، ہمارے قیدی سے مذاق گویا ہم سے مذاق ہے، میں نے پوچھا وہ قیدی کون ہے؟ اس نے کہا برتنوں والے بازار کا ایک آدمی ہے، وہ ایمن آباد گیا، وہاں ایک قبر ہے، وہاں ہمارا کنٹرول



ہے اور یہاں گھوڑے شاہ میں بھی ہمارا کنٹرول ہے، یہ وہاں گیا، اس نے کوئی احترام نہیں کیا، وہاں اس نے زنا کیا، شراب پی، اس واسطے ہم نے اسے پکڑ لیا، اب وہ ہمارا قیدی ہے، وہ اندر تھا، اس نے گزرتے ہوئے اس سے ٹھٹھا کیا اور ہم نے اسے بھی پکڑ لیا۔

جنات سے مدد لینے میں احتیاط کرنی چاہیے:

اس لئے ان سے مدد نہیں لینی چاہیے، اگر از خود بھی کوئی کام کر دیں، پھر بھی خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں حرام کام تو نہیں کر رہا ہے، مثلاً نقدی لے آیا، کیا معلوم کہ وہ چوری کی ہو یا پھل فروٹ لے آیا، وہ بھی چوری کا ہوگا، ان کے پاس اپنے پیسے تو نہیں ہوتے، اس لیے احتیاط اچھی ہے۔

ایک شخص کا دعویٰ تھا کہ اس کے پاس جن ہیں، میں نے کہا کہ یہ لو دو سو روپیہ، اپنے جن سے کہو یہ روپے لے کر سعودی عرب جائے اور وہاں جا کر کرنسی تبدیل کرا کر ریال حاصل کرے اور وہاں سے إعلام الموقعین خرید کر لا دے، وہ کہنے لگا یہ تو نہیں ہوسکتا، میں نے کہا پھر تم یوں ہی بڑ مارتے ہو، تمہارے پاس کچھ بھی نہیں۔

عبادت کا مفہوم:

ضمنی مسائل پر گفتگو ذرا طویل ہوگئی، بات چل رہی تھی عبادت کی، عبادت کا لفظ بڑا ہی اہم ہے، ﴿ اِیَّاكَ نَعْبُدُ ﴾ [الفاتحہ: ٥] میں عام مفسرین اس پر بحث کرتے ہیں اور عبادت کا معنی ومفہوم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ عبادت "غایة الخضوع" کو کہتے ہیں اور کبھی " أقصىٰ غاية الخضوع" اقصیٰ مزید کا اضافہ کر دیتے ہیں، یعنی خضوع کی غایت کا اقصیٰ۔

شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ اقصیٰ درجہ ظاہری طور پر تو سجدہ ہی ہے، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس تعریف کو اگر صحیح مان لیا جائے، تو پھر تو یہ سجدہ آدم علیہ السلام کو بھی کیا

گیا ہے، یہ تعریف نہ جامع ہے نہ مانع، [1] جامع اس لئے نہیں کہ رکوع اس سے نکل جاتا ہے، قیام نکل جاتا ہے اور عبادت کی دیگر ساری صورتیں نکل جاتی ہیں، اس لئے اقصیٰ وہ نہیں، مانع اس لئے نہیں کہ آدم کا سجدہ بھی اس میں داخل ہوگیا، حالانکہ آدم کو سجدہ عبادت کا سجدہ نہیں ہے۔

غیر اللہ کی عبادت شروع سے ہی منع ہے:

غیر اللہ کی عبادت تو شروع سے ہی منع ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿ وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ﴾ [الزخرف: ٤٥]

”سب رسولوں سے پوچھ لو ہم نے کسی اور کو بھی الٰہ بنایا ہے کہ اس کی عبادت ہو؟“

﴿ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ [النحل: ٣٦]

”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔“

﴿ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴾ [یسین: ٦٠،٦١]

”کیا میں نے تمھیں تاکید نہ کی تھی، اے اولاد آدم! کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا، یقیناً وہ تمھارا کھلا دشمن ہے اور یہ کہ میری عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔“

گویا اگر عبادت کا یہ مطلب لیا جائے، تو یہ تعریف نہ جامع ہوتی ہے اور نہ مانع۔

---

[1] حجة الله البالغة (١/ ١٢٤)

عبادت کے اجزاء:

بعض لوگوں کو دھوکہ لگ جاتا ہے کہ سجدہ ہی غایۃ الخضوع ہے اور اس کے علاوہ عبادت اور کوئی چیز نہیں، بعض تفسیروں میں یہ لکھا ہے کہ صرف سجدہ ہی عبادت ہے، شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ نماز کے باقی ارکان رکوع، قیام وغیرہ یہ سب بھی عبادت ہی ہوتے ہیں، صرف سجدہ ہی عبادت نہیں ہے، سجدہ میں عاجزی اور انکساری زیادہ پائی جاتی ہے، اس طرح یہ تعریف جامع نہیں، ان افراد کو نکال دیتی ہے۔

اس کے بعد پھر جواب یہ دیا ہے کہ اس جگہ "غاية الخضوع" یا "أقصىٰ غاية الخضوع" جو کہا گیا ہے، بلحاظ نیت کہا گیا ہے، صورت کے لحاظ سے نہیں کہا گیا، صورت کے لحاظ سے تو سجدہ ہی سب سے زیادہ " ضرب من الخضوع بالغ حد النهاية " نہایت کی انتہاء ہے۔

حاجت روا کون ہے؟

اس قسم کا خضوع عقیدہ کی بناء پر ہو کہ یہ میرا مشکل کشا اور حاجت روا ہے، اس استشعار قلب کی بناء پر ہو کہ ما وراء الاسباب اس کا حاجت روا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ﴾ [الأحقاف: ٥]

"اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے، جو اللہ کے سوا انہیں پکارتا ہے، جو قیامت کے دن تک اس کی دعا قبول نہیں کریں گے، اور وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں۔"

یہ لوگ جو غیر اللہ کو پکارتے ہیں، کسی مقصد کے لیے پکارتے ہیں، ان وہ

مقصد ان سے حل نہیں ہوتا، وہ مقصد تو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی حل کرتا ہے، یہ نادان لوگ ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں، جن کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں:

﴿ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ﴾ [الأحقاف: ٥، ٦]

''اور وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں اور جب سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے، تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت سے منکر ہوں گے۔''

قرآن میں کہیں دعا آیا ہے، کہیں عبادت آیا ہے، مطلب یہ ہے کہ جو بھی کوئی دعا کرتا ہے یا عبادت کرتا ہے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے فائدہ حاصل کرے، ایسی چیزوں کو پکارنا، جو ان کی دعا سے بھی غافل ہیں اور عبادت سے بھی غافل ہیں، کوئی مشکل حل نہیں کرتے، اس کا نام شرک رکھا ہے، مثلاً کسی زندہ شخص کو پکارتا ہے کہ مجھے قلم دو، وہ قلم اسے دے سکتا ہے، یہ شرک نہیں اور نہ یہ عبادت ہے، شرک اس صورت میں ہوتا ہے، جب انسان ما وراء سلسلۂ اسباب میں غیبی سہارا تلاش کرتا ہے اور مدد مانگتا ہے۔

﴿ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ [حم سجده: ٣٧]

''نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو اور اس اللہ کو سجدہ کرو، جس نے انہیں پیدا کیا، اگر تم صرف اس کی عبادت کرتے ہو۔''

پہلے سجدہ ہے بعد میں عبادت ہے، مطلب یہ ہے کہ ما وراء سلسلۂ اسباب حصول مقصد کے لیے کسی کو پکارنا شرک ہے۔

مشرکوں کے مغالطے:

بریلوی حضرات کہتے ہیں کہ ہم تو یہ نہیں کہتے کہ حل نہیں کر سکتے، اس طرح یہ مسئلہ پھر دوسرا پہلو اختیار کر لیتا ہے کہ واقعی حل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ ہم تو کہتے ہیں کہ حل نہیں کر سکتے، اس کے لیے قرآن کو دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

قرآن میں صاف طور پر مسیح علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے:

﴿ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ﴾

[المائدہ: ٧٦]

”کیا تم اللہ کے سوا اس چیز کی عبادت کرتے ہو، جو تمہارے لیے نہ کسی نقصان کی مالک ہے اور نہ نفع کی۔“

اس طرح کی قرآنی آیات بتا رہی ہیں کہ اولیاء ہوں یا انبیاء، جنات ہوں یا ملائکہ، کوئی بھی حقیقی طور پر نفع وضرر کا مختار نہیں، کوئی اپنی طرف سے اگر کسی کو مختار بنا لے تو یہ اس کی اپنی مرضی ہے، جو غلط ہے۔

یہ حضرات کہتے ہیں کہ شرک تو یہ ہوتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفت سمجھی جائے، یہ تم بھی کہتے ہو کہ فرشتے اس قسم کا کام کر سکتے ہیں، یہ شرک بجبرئیل ہوا نہ شرک باللہ، جبریل تو کسی پہاڑ کو آناً فاناً ٹکڑے کر سکتا ہے، کسی بزرگ سے مدد لی جائے کہ تم جبریل کے ذریعہ اس پہاڑ کو ٹکڑے کر دو، یہ تو شرک بجبریل ہوا نہ شرک باللہ، اس طرح کا دھوکہ دیتے ہیں۔

اصل مطلب یہ ہے کہ انسان کی طاقت محدود ہے، اگر اس میں بعض اوقات معجزات یا کرامات کی بناء پر خرق عادت کوئی طاقت ہوتی ہے، تو وہ فعل اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے، انسان کا اپنا فعل نہیں، انسان سے جو مدد لی جاتی ہے، ” إلا باذن الله “ اس میں کوئی اختیار ہی نہیں، باقی یہ بات کہ وہ اس کام میں اس سے مدد لے رہا ہے، یہ

کام تو فرشتہ بھی کرسکتا ہے، یہ شخص اس کو فرشتہ نہیں سمجھتا کہ اس سے مدد لے رہا ہے، وہ تو یہی سمجھتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ عطا ہوا ہے، اس واسطے اس میں اختیار ہے اور اس قسم کا کام کرسکتا ہے، جبریل کی معیت وہاں خیال نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی کچھ عطائی خیال کرتا ہے، اگرچہ وہ خدا جتنی طاقت تو نہیں رکھتا، لیکن اس نوع کی طاقت تو رکھتا ہے، انسان کی قوت تو محدود ہے، شریعت نے انسان کی ماوراء قوت کے بارے میں تو کہا ہے کہ یہ منبع شرک ہے، گویا اسے خدا بنا دیا گیا ہے، جبریل تو اپنی قوت سے کام کرتا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے قوت ہی ایسی دی ہے، اس میں اپنی ذاتی قوت تو نہیں، نہ جبریل اس میں حلول کر چکا ہے، اس سے اگر مدد لے گا، تو یہی سمجھے گا کہ خدا نے اسے طاقت دی ہے، وہ خدائی قوت ہے ذاتی نہیں۔

عبادت کی تعریف:

اس لئے عبادت کی اصل تعریف یہ ہے کہ کسی کے آگے عاجزی کرنا، عاجزی کے تمام افراد اس میں آجائیں، قیام، رکوع، سجدہ، طواف، ہاتھ جوڑنا، دست بستہ کسی کے روبرو کھڑا ہونا، گڑگڑانا وغیرہ، یہ سب عبادت میں شامل ہیں، اس عقیدہ سے یہ چیزیں بجالائے کہ یہ شخص یا یہ چیز میری مشکل کشا اور حاجت روا ہے، کیونکہ اس میں ذاتی قوت ہے اور انسانوں کی محدود عطائی قوت سے زیادہ ہے، یا یہ سمجھ کر کہ یہ شخص یا یہ چیز اللہ تعالیٰ سے شفاعت کر کے بزور اسے منوا سکتا ہے اور میری حاجات اور ضروریات اس سے پوری ہوسکتی ہیں، اس کا نام عبادت ہے، اس طرح عبادت کی تعریف جامع مانع ہوگئی، صورت کے لحاظ سے نہیں بلکہ نیت کے لحاظ سے یہ معنی کیا گیا ہے، جو کام انسان کرسکتا ہے، اس میں بھی یہ خیال رکھنا چاہیے کہ یہ شخص مستقل

نہیں ہے، مثلاً کسی کے ہاں نمک ختم ہوگیا، حدیث کی رو سے کہ اگر جوتے کا تسمہ تک بھی ٹوٹ جائے، تو وہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہیے،[1] اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو چیزیں انسانوں کی بساط میں ہوں، ان کے بارے میں بھی یہ خیال ہونا چاہیے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی جناب سے تحریک نہیں ہوگی، اسے یہ چیز نہیں ملے گی۔

عبادت کی اس تعریف میں طاعت بھی داخل ہوگئی، مثلاً کسی کے حکم کی یہ سمجھ کر تعمیل کرنا کہ یہ حکم شرعی ہے اور اسے حکم دینے کے اختیارات ہیں، اس صورت میں یہ بھی شرک میں شامل ہوجائے گی۔ ﴿ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ﴾ [یوسف: ٤٠] کیونکہ حکم تشریعی اور حکم تکوینی صرف اللہ کا حق ہے، کسی کے حکم کو ان دو احکام الٰہی کی طرح سمجھے، تو یہ شرک کی واضح شکل بن جاتی ہے، اگر یہ دو چیزیں نہیں سمجھتا، مثلاً اس کا باپ ہے، اس کا استاد ہے، بڑا بھائی ہے، ان میں سے کوئی اسے کسی کام کے انجام دینے کا حکم دے رہا ہے اور وہ اسے انجام دیتا ہے، تو یہ تعمیل حکم اور اطاعت بمنزل احترام اور تعظیم کے ہے۔

تعظیم کی تین اقسام:

تعظیم اور احترام کی بھی تین اقسام ہیں، ان میں سے ایک تو جائز ہے، ایک وہ ہے جو شرک ہے اور اور ایک ایسی قسم ہے جو شرک نہیں ممنوع ضرور ہے:

ا۔ تعظیم و احترام کی جائز صورت تو یہ ہے کہ کسی نے پینے یا کسی اور ضرورت کے لیے پانی طلب کیا۔ قابل احترام اور بڑا سمجھتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل میں اسے پانی لا دیا، یا کسی نے کہا کہ مجھے کمر میں یا کندھوں میں درد ہو رہا ہے، ذرا

---

[1] ایک حدیث میں ہے کہ اگر کسی کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے، تو وہ إنا لله وإنا إليه راجعون پڑھے، لیکن اس کی سند ضعیف ہے، دیکھیں: مجمع الزوائد (٣/٧٨) فيض القدير للمناوي (١/٣٠٨)

دبانا کہ قدرے سکون ہوجائے، وہ دبانا شروع کر دے یا کوئی اور کام ہے جو کر دیتا ہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ معزز اور محترم انسان ہے، ایک انسان کو دوسرے کے دکھ درد اور مصیبت میں اور بوقت ضرورت کام آنا انسانی شرافت ہے، یہ تو جائز صورت ہے۔

۲۔ دوسری وہ صورت جو شرک ہے، وہ وہی ہے کہ کسی کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے ہوئے کسی کی تعظیم اور احترام بجا لائے، جیسا کہ ایک آدمی باہر سے آئے اور لوگ احتراماً کھڑے ہوجائیں اور اس کی خواہش یہ ہو کہ یہ لوگ جب تک میں بیٹھا ہوں میرے احترام اور تعظیم میں دست بستہ کھڑے رہیں، یہ ممنوع چیز ہے، نبی ﷺ کا فرمان ہے:

"من أحب أن يتمثل له الرجال قياماً فليتبوأ مقعده من النار"[1]

۳۔ اسی طرح ایک آدمی دوسرے سے ملتا ہے، اس کے آگے جھک جاتا ہے، اس میں ایک تو ہے ہاتھ سے سلام کرنا، اگر وہ بہرہ ہے یا دور ہے، آواز کا وہاں پہنچانا ذرا دشوار ہے، وہاں اشارہ بھی کر سکتا ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ جیسا کہ ترمذی میں ہے:

" الرجل يلقىٰ صديقه أو أخاه أينحني له؟ قال لا، قال: أفيلتزمه ويقبله؟ قال لا، قال: أ ياخذ بيده يصافحه؟ قال نعم، قال الترمذي هذا حديث حسن"[2]

---

[1] سنن أبي داود: كتاب الأدب، باب في قيام الرجل للرجل، رقم الحديث (٥٢٢٩) سنن الترمذي: كتاب الأدب باب ما جاء في كراهية قيام الرجل للرجل، رقم الحديث (٢٧٥٥) وقال الترمذي: "هذا حديث حسن"

[2] سنن الترمذي: كتاب الاستئذان، باب ما جاء في المصافحة، رقم الحديث (٢٧٢٨)

بوسہ لینے سے بھی روک دیا، مگر آج کل عربوں میں عام طور پر یہ عادت ہے، حالانکہ صرف مصافحہ کرنا درست ہے، جھک جانے سے بھی روک دیا، آج کل عرب ہاتھ اور پیشانی دونوں کو چومتے ہیں، ہاتھ چومنے میں کوئی قباحت اور مضائقہ نہیں، کیونکہ چومنے کے لیے جھکنا ضروری نہیں، جھکنا طبعی ہوتا ہے، ورنہ گاجر، مولی یا کسی گری پڑی چیز کو اٹھانے کے لیے جھکتا ہے، یہ جھکنا منع نہیں، تبعاً جھکنا اور قصداً جھکنے میں فرق ہے۔

ماتھا ٹیکنا:

کسی کے آگے ماتھا ٹیکا جائے، اس کی بھی تین قسمیں ہیں، ایک قصداً اور ایک تبعاً، قصداً یہ ہے کہ ماتھا زمین پر رکھنے سے مقصود ہی احترام اور تعظیم ہو، تبعاً یہ ہے کہ آپ نے پاؤں کو بوسہ دینا ہے، ظاہر ہے کہ اس کے لیے منہ نیچے کرنا پڑھے گا، یہ تبعاً ہوتا ہے، یا کسی چیز کو نیچے سے اٹھانے کے لیے جھکنا پڑتا ہے، یہ بھی تبعاً میں شامل ہے۔

تبعی سجدہ:

بعض وقت اس طرح تبعی سجدہ بھی ہوجاتا ہے، تبعی سجدہ تو خود بخود ہوجاتا ہے، جیسا کہ بریلوی حضرات کہتے ہیں کہ رانوں میں عورتوں کو سجدہ کرتے ہو، کیا یہ منع ہے؟ اس کے جواب میں ایک آدمی کہنے لگا کہ آپ بھی اس طرح کا سجدہ کروالیں! وہ سجدہ تبعی ہے، قصداً اور عمداً جھکنا اور چیز ہے، تبعاً جھکنا اور چیز ہے، ہر چیز منع نہیں ہے اور نہ ہی ہر چیز شرک بن جاتی ہے، کسی کے پاؤں چومنے کے لیے تبعاً جھک گیا، تو پاؤں چومنا اگرچہ جائز نہیں ہے، تاہم یہ جھکنا تبعاً ہے، اس لیے شرک نہیں ہے پاؤں چونکہ نیچے ہوتے ہیں، اس لئے تبعی طور پر سر نیچے ہوجاتا ہے، حدیث میں پاؤں چومنا منع ہے، یہ اس وقت ہے جب معانقہ کر کے چومتے ہیں، اس سے منع کیا

ہے، یہ تو شہوت انگیز ہوتی ہے، ایسا نہ ہو کہ آگے کرنا شروع کردے۔

" كان أصحاب النبيﷺ إذا تلاقوا تصافحوا، وإذا جاؤا من سفر تعانقوا " [1]

''اصحاب رسول ﷺ جب سفر سے واپس آتے تو معانقہ کرتے اور ملاقات کے وقت مصافحہ کرتے تھے۔''

شرح بخاری میں ہے کہ اصحاب رسول ﷺ معانقہ بھی کرتے تھے اور مصافحہ بھی، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب بھی ملتے اس وقت معانقہ کرتے، بلکہ جب سفر سے واپس آتے تھے، تو ایسا کرتے تھے۔

ہاتھ پاؤں کو بوسہ دینا:

نبی ﷺ کے پاس دو یہودی آئے، انہوں نے آپ سے چند باتوں کا سوال کیا، پھر " وقبّلا يديه ورجليه " انہوں نے آپ ﷺ کے ہاتھوں اور پیروں کو چوما۔ [2] اس قسم کی اور روایات بھی ہیں، حضور ﷺ نے ان یہودیوں کو نہیں روکا، صحابہ کرام تو ایسا نہیں کرتے تھے، بعض لوگ اس سے جواز کی صورت نکالتے ہیں، لیکن ممانعت کی حدیث بھی ہے، اس لئے کہتے ہیں کہ پہلے جائز ہوگا، پھر بعد میں منع فرما دیا، اس لئے بہتر یہی ہے کہ احتیاط ملحوظ رکھی جائے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسا بوسہ نہیں دیا کرتے تھے اور نہ ہی کسی کی عادت تھی۔

حضور ﷺ کا ایک واقعہ:

ابن قیم رحمہ اللہ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ حضور نبی کریم ﷺ بازار تشریف لے گئے، آپ نے سراویل کے لیے کپڑا خریدا، اس کے بعد آپ نے

[1] المعجم الأوسط (١/٣٧) نیز دیکھیں: السلسلة الصحيحة (٢٦٤٧)

[2] سنن الترمذي: كتاب التفسير، باب من سورة بني إسرائيل (٣١٤٤)

فرمایا کہ اسے پیسے دے دو، چاندی ذرا جھکا کر دینا، یہ سن کر وہ دوکاندار حیران ہوا اور پوچھنے لگا کہ یہ کون صاحب ہیں جو یہ کہہ رہے ہیں کہ ذرا جھکا کر دو؟ ایسی بات آج تک کسی گاہک نے نہیں کی، صحابی نے کہا تجھے پتہ نہیں یہ نبی ﷺ ہیں، اس نے کھڑا ہو کر آپ کے دست مبارک کو بوسہ دینا چاہا، آپ نے ہاتھ کھینچ لیا،[1] مطلب یہ تھا کہ تم مجھ سے ڈر گئے ہو یا احترام کرنا چاہتے ہو، میں ایک عورت کا لڑکا ہوں، جو خشک گوشت کھایا کرتی تھی، آپ کا مطلب یہ تھا کہ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں کہ تم خوف زدہ ہو گئے اور ہاتھ چومنے کو تیار ہو گئے ہو، حضور ﷺ نے اپنے ہاتھ کا بوسہ دینے سے روک دیا، کیونکہ اس طرح ذرا سی نرمی سے آہستہ آہستہ پھر عادت پڑ جاتی ہے۔

پیروں کی رعونت:

بعض پیر ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان سے کوئی مصافحہ کرنا چاہے، تو ہاتھ اوپر نہیں کرتے، بلکہ ہاتھ نیچے رکھتے ہیں، تاکہ مصافحہ کرنے والا جھک کر مصافحہ کرے، گویا ایسے لوگوں کے دل و دماغ میں رعونت اور تکبر ہوتا ہے کہ ہم اونچے رہیں اور دوسرے ان سے نیچے رہیں، اگر یہ لوگ خود چارپائی پر بیٹھے ہوں، تو دوسروں کو نیچے فرش پر بٹھاتے ہیں۔

تعظیم میں احتیاط:

طاعت اور تعظیم میں ہر چیز کو غور وفکر سے دیکھنا چاہیے، بعض اوقات ایک ہی چیز ہوتی ہے، کبھی وہ عبادت بن جاتی ہے اور بعض وقت عبادت نہیں ہوتی، اسی طرح

---

[1] المعجم الأوسط (٦/٣٤٩) مسند أبي يعلىٰ (١١/٢٣) اس کی سند ضعیف ہے، دیکھیں: مجمع الزوائد (٥/١٢٢) فیض القدیر (٤/ ١٨٨) الفوائد المجموعة للشوكاني (ص: ١٩٠)

کبھی ایک چیز شرک بن جاتی ہے اور کبھی وہی چیز نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت بن جاتی ہے، إنما الأعمال بالنیات ![1]

سجدۂ تعظیمی بھی حرام ہے:

آج کل سجدہ تین قسم کا ہے، ایک سجدۂ عبادت، اگر یہ نیت ہو کہ فلاں مشکل کشا اور حاجت روا ہے، جیسا کہ عام طور پر یہ لوگ پیروں کو سمجھتے ہیں، یہ سجدہ شرکیہ ہے، ایک سجدہ محض احترام کے لیے ہے، یہ حرام ہے۔

کہتے ہیں بابا فرید اپنے مرشد قطب الاقطاب کو سجدہ کیا کرتے تھے اور مرشد بختیار کاکی انہیں منع نہیں کیا کرتے تھے، دونوں بڑے بزرگ آدمی تھے، مطلب یہ ہے کہ بابا فرید کرنے والے ہیں اور قطب الاقطاب بختیار کاکی کو کر رہے ہیں، کرنے والا بھی بزرگ اور جسے کر رہے ہیں وہ بھی بزرگ، بختیار کاکی نے استدلال کیا ہے کہ آدم کو بھی سجدہ ہوا تھا، اس کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے کہ امت کا اجماع ہے کہ سجدۂ تعظیمی حرام ہے، اس کا شمار زنا، چوری وغیرہ چیزوں میں ہے، لیکن بختیار کاکی کے متعلق کچھ نہیں لکھا، حالانکہ ان کا واقعہ انہوں نے ذکر کیا ہے، کاکی صاحب کا استدلال تو غلط ہے، کیونکہ اجماع کے خلاف ہے، لیکن ان کے استدلال کی نوعیت یہ تھی کہ یہ حکم قرآن کا نہیں، حدیث میں منع ہے، حدیث خبر واحد ہے، خبر واحد کا قرآن سے مقابلہ نہیں ہوسکتا۔

اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ امت کا اس پر اجماع ہے، اجماع کے بعد وہ مسئلہ قطعی ہو جاتا ہے، اس لئے ان کا استدلال درست نہیں، مگر ان پر اعتراض اس لئے نہیں کیا کہ وہ ان کا ایک استدلال تھا اور ممکن ہے کہ انہیں اجماع کا علم نہ ہو، عدم

---

[1] صحیح البخاري: باب کیف کان بدء الوحي إلی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم، رقم الحدیث (۱) صحیح مسلم: کتاب الإمارۃ، رقم الحدیث (۱۹۰۷)

علم کی بناء پر وہ معذور ہوگئے، جس شخص کو اجماع کا علم ہوجائے، وہ شخص تو معذور نہیں، ہر جگہ بختیار کاکی معذور ہیں نہ بابافرید معذور ہیں، اس لئے قرآن سے استدلال کیا، اجماع کا پتہ نہیں، خبر واحد کا رد کر دینا اس بناء پر کہ قرآن کے خلاف ہے، یہ شرک تو نہیں حرام ہی ہے، سجدۂ تعظیمی محرمات میں داخل ہے، محرمات میں جو چیزیں ہوتی ہیں، ان میں اجتہاد آجائے، تو بعض اوقات فقہاء کو غلطی معاف بھی ہوجاتی ہے، بابا فرید کو سجدۂ تعظیمی کرتے ہوئے دیکھنے والے بھی معذور ہیں، شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ جن کو پہنچ گیا، وہ اب معذور نہیں، ہمیں تو فتویٰ پہنچ گیا کہ امت کا اجماع ہے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ خبر واحد ہے، اس کا اعتبار نہیں، یہ وجہ تھی کہ شاہ عبدالعزیز نے ان پر فتویٰ کیوں نہیں لگایا، بختیار کاکی کے بارے میں اس لئے خاموش رہے کہ ان کے دماغ میں ان کی بزرگی تھی، ان کو غلطی ہوئی، غلطی بڑے بڑے ائمہ سے بھی ہوجاتی ہے، ان سے بھی ہوگئی ہے، انہیں اجماع کا پتہ نہیں تھا، ان پر کفر یا شرک کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا کہ کافر ہیں، بے ایمان ہیں، یہ ہم نہیں کہہ سکتے، غلط اور حرام تو انہوں نے کہہ دیا ہے۔

سجدۂ تبعی:

سجدۂ تبعی باقی رہ گیا، اس میں کچھ اختلاف ہوگیا، جس طرح کہ آج کل کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم تو قدم بوسی کرتے ہیں، سجدہ تو نہیں کرتے، مولوی سردار فیصل آباد کی قبر پر بیٹھا ہوا مجاور کہتا تھا کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا حرام ہے، نیچے جا کر خود کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ دراصل سجدہ نہیں، سجدہ تو ہوتا ہے باوضو قبلہ رخ ہو کر سبحان ربي الأعلىٰ کہے، یہ تو حماقت ہے، کیا ابوجہل بتوں کو اسی طرح سجدہ کرتا تھا کہ پہلے وضو کرتا تھا، پھر قبلہ رخ ہوتا تھا، پھر سجدہ کرتا تھا؟ وضو تو اسلام نے شروع کیا ہے۔

قبروں کو چومنا ٹھیک نہیں:

قبروں کو چومنا بھی ٹھیک نہیں، اگرچہ بعض بزرگ کہتے ہیں کہ احتراماً قبروں کو چومنا شرک نہیں اور بعض اسے حرام بھی نہیں کہتے، کہتے ہیں منبر رسول کو چومنا امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہے، حدیث میں آتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو دیکھ کر فرمایا تھا: "لولا أني رأيت رسول اللہ يقبلك ما قبلتك "[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منبر کو چومنا ثابت نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ چومنا نہیں چاہیے، کیونکہ اس کا چومنا ثابت نہیں، قرآن کے چومنے کے بارے میں امام احمد کا خیال ہے کہ جائز ہے، قرآن اور منبر وغیرہ کو اگر چومنا جائز ہے، تو پھر قبر بھی اس میں آجاتی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول بتاتا ہے کہ چومنا بھی نہیں چاہیے، جس چیز سے شرک کا وہم پڑتا ہو، اسے چومنا بھی نہیں چاہیے، قبروں پر تو وہم پڑ جاتا ہے، بلکہ تعظیماً ہاتھ لگانا بھی جائز نہیں۔

بتوں کو ہاتھ لگانا:

حدیث میں آتا ہے کہ کافروں نے آپ کو روک دیا تھا کہ آپ حجر اسود کو ہاتھ نہیں لگا سکتے، جب تک کہ آپ لات اور عزیٰ کو ہاتھ نہ لگائیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال پیدا ہوگیا کہ اگر میں لات اور عزیٰ کو ہاتھ لگاؤں گا، تو اس طرح تو نہیں لگاؤں گا جس طرح کفار لگاتے ہیں، میں تو ویسے ہی ہاتھ لگا دوں گا، اس سے مجھے حجر اسود کو ہاتھ لگانے کی اجازت ہوجائے گی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ نہیں کرنا، چنانچہ قرآن مجید میں بڑی دھمکی دی:

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الحج، باب ما ذكر في الحجر الأسود، رقم الحديث (١٥٢٠) صحيح مسلم: كتاب الحج، باب استحباب تقبيل الحجر الأسود في الطواف، رقم الحديث (١٢٧٠)

﴿ وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَ اِذًا لَّا تَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝ وَ لَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝ ﴾ [الإسراء: ٧٣، ٧٤، ٧٥]

''بے شک وہ قریب تھے کہ تجھے اس سے ضرور ہی بہکا دیں، جو ہم نے تیری طرف وحی کی، تاکہ تو ہم پر اس کے سوا جھوٹ باندھ دے اور اس وقت وہ ضرور تجھے دلی دوست بنا لیتے اور اگر یہ نہ ہوتا کہ ہم نے تجھے ثابت قدم رکھا، تو بلاشبہ یقیناً تو قریب تھا کہ کچھ تھوڑا سا ان کی طرف مائل ہوجاتا، اس وقت ہم ضرور تجھے زندگی کے دگنے اور موت کے دگنے (عذاب) کا مزہ چکھاتے، پھر تو اپنے لیے ہمارے خلاف کوئی مددگار نہ پاتا۔''

جامع البیان میں لکھا ہے کہ بتوں کو ہاتھ لگانے کے متعلق ہے، گویا ہاتھ بھی تعظیم کے لیے لگانا جائز نہیں، کجا کہ چومنا جائز ہو، کیونکہ لوگ قبروں کی عبادت کرتے ہیں، اس کا دوسرے عوامی ذہن کے لوگوں پر برا اثر پڑتا ہے، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ نے جو باتیں کی ہیں، وہ ان کے اپنے خیال کے مطابق ہوں گی، لیکن وہ جائز نہیں۔

سجدۂ تبعی کی تیسری صورت کو شرک نہیں کہہ سکتے اور ناجائز بھی نہیں کہہ سکتے، یہ الگ چیز ہے کہ لوگ اس طرح کرتے ہیں، اس سے بچنے کے لیے بہتر ہے کہ نہ کرے۔

قرآن مجید کو چومنا:

قرآن مجید کو چومنا نبی ﷺ سے کہیں ثابت نہیں، اس زمانے میں بھی قرآن لوگوں کے پاس مصحف کی شکل میں موجود تھے، نبی ﷺ کے گھر میں بھی تھا، قرآن کو اگر چومے، تو لوگ کہیں گے کہ اس کا ثبوت کیا ہے؟ نبی ﷺ سے تو چومنا ثابت نہیں، اپنی طرف سے ایک چیز اپنے گلے میں ڈال لو۔

اتنی طویل گفتگو صرف عبادت کا مفہوم ذہن نشین کرنے کے لیے ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عام علماء بھی عبادت کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے۔

عبادت کے بارے میں ایک مزید وضاحت:

عبادت کے بارے میں ایک چیز مزید وضاحت طلب ہے،وہ یہ کہ نماز میں قیام، رکوع، سجود وغیرہ ہی مقصود بالذات ہیں یا قلبی کیفیت وغیرہ اور کوئی چیز بھی مقصود ومطلوب ہے؟

شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں خود مقصود بن گئی ہیں، اگرچہ یہ چیزیں احترام اور تعظیم کے لیے ہیں، اب چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جناب سے پاس ہوگئی ہیں، اس لئے اب یہی مقصود بالذات ہوگئی ہیں، اب جو شخص یہی کام کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوگا، اس کے پیچھے جو احساس ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری کرنا ہے، وہ الگ چیز ہے، عبادت الگ چیز ہے۔

عبادت کی جو تعریف کی ہے یہی ہونی چاہیے، عبادت کا یہ معنی نہیں جیسا کہ مولانا مودودی صاحب نے سمجھا ہے کہ کسی قانون کی اطاعت کرنے کا نام عبادت ہے، یہ معنی غلط ہے، اطاعت کی تقسیم اس لئے کی ہے۔

اطاعت کی تین اقسام:

اطاعت کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ ایک عبادت ہے، جو ۲ کسی کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ کر کرتا ہے، قانون کی اس طرح اتباع کرنے والا مشرک ہوسکتا ہے، دنیا میں کوئی شخص اس طرح قانون کی اتباع نہیں کرتا، وہ قانون حکومتِ وقت کا ہے، وہاں وہ رہتا ہے، اس لیے اس کی پابندی اسے کرنی چاہیے، گویا ایک عبادت تو یہ ہوئی کہ مشکل کشا اور

حاجت روا سمجھ کر قانون وقت کی اطاعت کرے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے یا اسے حاکم سمجھ کر کرے کہ اسے شرعی حکم دینے کا اختیار ہے یا یہ سمجھے کہ حکم تکوینی اس میں ہے، تو اس کی نوعیت تو اس جیسی ہوگی، جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ﴾ [التوبہ:۳۱]

''انہوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انہیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں۔''

''لِيَعْبُدُوْٓا'' پیچھے آیا ہے، احبار و رہبان کو رب بنانے کا ذکر پہلے آیا ہے۔ رب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ کوئی چیز حرام کر دے تو اسے حرام سمجھے اور اگر حلال کر دے تو اسے حلال سمجھے، گویا اس کی اطاعت اس نظریہ سے کرے کہ اسے حلال و حرام کے اختیارات ہیں، گویا اس کی حیثیت ایک شارع کی تسلیم کرنے کے بعد اس کی اطاعت کرتا ہے، تو یہ عبادت ہو جائے گی۔

۲۔ اطاعت کی ایک صورت یہ ہے جیسا کہ کارخانے میں مزدور اور کارخانے والے کا باہمی معاہدہ ہوتا ہے، مالک کہتا ہے ہم تمہیں اتنے وقت کی کارکردگی پر اتنے پیسے دیں گے، مزدور اسے تسلیم کر لیتا ہے، یہ عوض معاوضہ کی صورت ہے، اسے عبادت نہیں کہہ سکتے ہیں۔

۳۔ اطاعت کی تیسری صورت یہ ہے کہ کسی بزرگ آدمی نے کسی سے کہا کہ مجھے پانی لا دو یا ماں باپ نے کہہ دیا کہ بازار سے فلاں چیز خرید لاؤ، احترام کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ تعمیل حکم کرتا ہے، یہ بھی عبادت میں شامل نہیں ہوگی، ہاں اگر کسی قانون مروجہ کی اطاعت اس نیت سے کرے کہ قانون مروجہ کا مقنن شارع ہے

یا یہ سمجھے کہ وہ مشکل کشا اور حاجت روا ہے، حکم تشریعی کے ساتھ حکم تکوینی بھی اس کا نافذ ہے، یہ صورت تو شرک ہے، مولانا مودودی صاحب نے تو معلوم ہوتا ہے کہ بات سمجھی ہی نہیں، بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا کہ اطاعت جو ہے اصل میں یہی عبادت ہے، قانون الٰہی کی اطاعت کرے گا، تو اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوگی، قانون انسانی کی کرے گا، تو گویا قانون انسانی کی عبادت ہوگی۔

قیام، رکوع اور سجود مقصود بالذات ہیں:

اصل بات یہ ہے کہ عبادت نام ہے عاجزی اور انکساری کا، رکوع، سجود، اور قیام وغیرہ میں عاجزی ہوتی ہے، اسی لئے یہ عبادت ہے، یہ عاجزی وانکساری کے افراد ہیں، جیسا کلّی کے افراد ہوتے ہیں، افراد ہی مقصود بالذات ہوتے ہیں، اس لئے یہ مقصود بالذات چیزیں ہیں، عاجزی اور تذلل وانکسار سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے، راضی ہوتا ہے۔

ارسطو کی منطق:

باقی یہ بات جو ارسطو نے کہی ہے کہ عبادت دراصل انسان کے معاشرتی امور کے لیے خادم ہوتی ہے، ارسطو کی اس منطق چھانٹنے کا منشا یہ ہے کہ انسان چونکہ مدنی الطبع ہے، مل جل کر اکٹھے رہنا اس کی فطرت اور جبلت کا تقاضا ہے، اس اجتماعی معاشرتی زندگی میں ہر آدمی تو سارے کام تنہا انجام نہیں دے سکتا، اس لئے کام تقسیم ہو جائیں گے، اس کام میں ایک دوسرے سے ردو بدل بھی ہوگا، باہمی لین دین، خرید فروخت شروع ہو جائے گی، اس ردو بدل کے پیش نظر خواہ مخواہ لوگوں کو ایک سکہ بنانا پڑے گا، اس لئے کہ یہ تو ناممکن سی بات ہے کہ ایک سر پر چارپائی اٹھائے پھرے کہ مجھے اس کے بدلے میں گندم درکار ہے یا دانے اٹھائے پھرے کہ مجھے ان کے عوض میں چارپائی دے دو، اس لئے ایک سکہ کا جاری کرنا ناگزیر ہے، تاکہ خرید و فروخت اور ضروریات زندگی کی فراہمی آسانی سے ہو سکے۔

معاشرے میں ایسے افراد بھی جنم لے لیتے ہیں، جولوٹ کھسوٹ کا گھناؤنا کاروبار کرنے لگتے ہیں، ایسے افراد کی اصلاح اور تادیب کے لیے پھر قانون کی بھی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ معاشرہ میں امن وسکون برقرار رہ سکے، جب قانون کی ضرورت ہوگی، تو قانون ایسے شخص کی جانب سے ہونا چاہیے، جو محترم ہو، اللہ تعالیٰ کی جناب سے اسے غیبی مدد پہنچتی ہو، وہ انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں، جب قانون اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، تو اللہ تعالیٰ کا شعور پیدا کرنے کے لیے عبادت ہے، اس طرح گویا ارسطو نے عبادت کو معاشرے کا خادم بنایا ہے۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تصریح:

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس کی تردید کی ہے کہ ان لوگوں نے جو مقصود بالذات چیز تھی، اس کو معاشرے کا خادم بنا دیا ہے، دوسرے جو لوگ اس قسم کے ہوں، ان کی تردید بھی ساتھ ہی ہوجاتی ہے۔

خواہش پرستی:

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ [الأحقاف:٥]

"اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے، جو اللہ کے سوا انہیں پکارتا ہے، جو قیامت کے دن تک اس کی دعا قبول نہیں کریں گے۔"

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ﴾ [الجاثیہ:٢٣]

"پھر کیا تو نے اس شخص کو دیکھا، جس نے اپنا معبود اپنی خواہش کو بنا لیا اور اللہ نے اسے علم کے باوجود گمراہ کر دیا۔"

ھوی کے معنی "مھوي" کے کرتے ہیں، یعنی جن لوگوں نے معبود بنا رکھے ہیں، انہوں نے اپنی خواہش کے مطابق بنا رکھے ہیں، حماسہ میں ایک شاعر کہتا ہے:

"ھواي مع الركب اليمانيين مصعد"

یہاں " ھواي "محبوب کے معنی میں آیا ہے، گویا یہ معبود انہوں نے اپنی خواہش کے مطابق بنا رکھے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت کا حکم نہیں دیا، یہ معنی زمخشری نے کیا ہے اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اپنی خواہش کی پیروی کرتے ہیں، گویا انہوں نے اپنی خواہشات کو معبود بنا رکھا ہے، اگر یہ معنی کیا جائے، تو اس صورت میں یہ اعتراض آئے گا کہ اس سے معتزلہ کا مذہب ثابت ہوتا ہے، یعنی جو معصیت ہے، وہ شرک ہے، پھر آدمی مخلد فی النار ہوگیا، اگر یہ معنی کیا جائے تو اس کے اعتبار سے خوارج کا معنی ثابت ہوجائے گا، خوارج یہی کہتے ہیں کہ ہر معصیت کفر ہے، پھر تو فرق ہی کوئی نہ ہوا، اگر یہ معنی کیا جائے، تو اسے مبالغہ پر محمول کیا جائے گا، اس معنی سے صحیح نہیں کہ اس کو ظاہری معنی پر محمول کیا جائے۔

نفس کی پیروی:

نفس کی پیروی نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے نفس کو نہ تو شارع سمجھتا ہے اور نہ اسے امر تکوینی پر فائز سمجھتا ہے، اسی واسطے میں نے کہا ہے کہ اس کا یہ معنی نہیں ہے، حالانکہ قرآن نے کہہ دیا ہے کہ اس نے اپنے نفس کو بھی الٰہ بنا لیا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے، اس کا مطلب " مھوي" والا ہوگا، دوسرا معنی اگر کیا جائے تو اسے مبالغہ پر محمول کیا جائے گا، جیسے کسی شئے کی تنقیح کے لیے بولا جاتا ہے، اس کا مطلب مقصود نہیں ہوتا، مبالغتاً گویا اسے شرک بنا دیا جاتا ہے، دوسرے لحاظ سے مودودی صاحب کا مطلب صحیح ہوجاتا ہے، وہ خارجی حضرات کا مذہب ہے، ان کا یہ مذہب صحیح

نہیں، کیونکہ خوارج کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان ہر معصیت کے ساتھ کافر ہو جاتا ہے، حالانکہ قرآن مجید نے کہیں نہیں کہا کہ ہر معصیت شرک ہے، اس سے معتزلہ کی بھی تائید ہوتی ہے، لیکن وہ کافر نہیں کہتے، ابدی جہنمی کہتے ہیں، یہ مسئلہ اہل سنت کا مابہ الامتیاز مسئلہ ہے کہ یہ عاصی کو کافر نہیں کہتے اور نہ مخلد فی النار کہتے ہیں، کچھ روز تک جہنم میں رہیں گے، ان کی شفاعت ہوگی اور آخرکار دوزخ سے رہائی پالیں گے۔

حضور کی تعلیمات:

" سألتك فهل يغدر، فذكرت أن لا " پھر ہرقل نے اس پر یہ ریمارکس قائم کئے کہ رسول غدر اور وعدہ خلافی نہیں کیا کرتے، پھر ہرقل نے پوچھا کہ وہ تمہیں کن باتوں کا حکم دیتا ہے؟ ابوسفیان نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ وہ ہمیں ان باتوں کا حکم دیتا ہے:

" أن تعبدوا الله، ولا تشركوا به شيئا، وينهىٰ عن عبادة الأصنام، ويأمر بالصلوة والصدق والعفاف"

ہرقل کا تبصرہ:

ہرقل نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: " فإن كان ما تقول حقا فسيملك موضع قدمي هاتين " جو کچھ تو کہہ رہا ہے، اگر وہ صحیح ہے، پھر وہ عنقریب اس جگہ کا، جہاں میں بیٹھا ہوا ہوں، مالک ہو جائے گا، یعنی اس کی حکومت ہوگی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلامی حکومت وہاں تک پہنچ گئی، پھر ہرقل نے کہا کہ مجھے علم تو ہو چکا تھا کہ وہ نبی پیدا ہو چکا ہے، لیکن یہ علم نہیں تھا کہ وہ تم میں سے ہے، اس کا خیال شائد یہ ہو کہ وہ نبی نصاریٰ میں سے ہوگا، کیونکہ ان کے خیال کے مطابق نصاریٰ آخری نبی کو ماننے والے ہیں، دوسرے لوگ ان سے افضل نہیں۔

یہ ہرقل کا اپنا احساس وخیال تھا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کی بعثت ساری دنیا کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نہیں، جب ہمیشہ کے لیے نہیں تو دوسرے لوگوں کے لیے نبی کی ضرورت تھی اور تکمیل دین وشریعت کی ضرورت باقی تھی۔

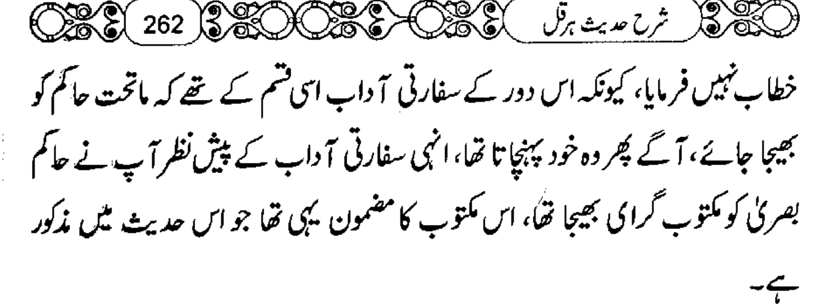
ہرقل کی تمنا:

اس تبصرہ کے بعد ہرقل نے اپنے مافی الضمیر کا اظہار ان الفاظ سے کیا:

" لو أني أعلم أني أخلص إليه " اگر مجھے یقین ہو کہ میں اس تک پہنچ جاؤں گا، تو میں ضرور آپ سے ملاقات کی یہ تکلیف گوارا کروں، یہ ہرقل نے اس بنا پر کہا تھا کہ وہ حالات دیکھ رہا تھا کہ وہ وہاں نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر میں وہاں جاؤں گا، تو یہ میرے درباری اور ہم مذہب لوگ مجھے نہیں چھوڑیں گے، اگر میں اس کے حضور حاضر ہوتا، تو اس کے پاؤں دھوتا، یعنی میں اس کی خدمت کرتا، یہ خدمت بھی کسی منصب اور عہدہ کے حصول کی نیت سے نہیں، بلکہ اس کے مقام و مرتبہ کے احترام کی خاطر کرتا۔

مکتوب نبوی:

اس کے بعد ہرقل نے "دعا بکتاب رسول اللّٰہ " آپ کا گرامی نامہ منگوایا، جسے دِحیہَ کلبی کی وساطتِ سفارت سے عظیم بصریٰ تک پہنچایا گیا، دِحیہَ کلبی کی شکل و صورت حضور گرامی قدر سے ملتی جلتی تھی، جبریل امین بھی ان کی صورت میں وحیَ الٰہی لے کر حاضر خدمت ہوا کرتے تھے، نہایت حسین وجمیل آدمی تھے، اس دور کا دستور تھا کہ سفارتی نمائندہ ایسے ہی لوگوں کو بنا کر بادشاہوں کے دربار میں بھیجتے تھے، جو شکل و صورت کے اعتبار سے وجیہ، پر رعب اور باوقار شخصیت کے مالک ہوتے تھے، حضور ﷺ نے بصریٰ کے حاکم کے پاس اپنے سفیر کو بھیجا تھا، براہ راست قیصر کو



خطاب نہیں فرمایا، کیونکہ اس دور کے سفارتی آداب اسی قسم کے تھے کہ ماتحت حاکم کو بھیجا جائے، آگے پھر وہ خود پہنچاتا تھا، انہی سفارتی آداب کے پیش نظر آپ نے حاکم بصریٰ کو مکتوب گرامی بھیجا تھا، اس مکتوب کا مضمون یہی تھا جو اس حدیث میں مذکور ہے۔

کفار کو خط کے شروع میں بسم اللہ لکھنا:

''بسم الله الرحمن الرحيم.'' مکتوب کے افتتاحیہ کلمات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کو خط لکھا جائے تو بسم اللہ لکھنی چاہیے، کیونکہ کسی نہ کسی رنگ میں اللہ تعالیٰ کو سبھی مانتے ہیں، قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا مکتوب بنام ملکہ سباء کا آغاز بھی ''بسم الله الرحمن الرحيم'' سے ہوتا ہے، جسے سورۂ نمل میں بیان کیا گیا ہے۔

خط لکھنے والا پہلے اپنا نام لکھے:

''بسم الله الرحمن الرحيم'' کے بعد ''من محمد عبدالله ورسوله'' لکھا، اس سے معلوم ہوا کہ مرسل کا نام پہلے ہونا چاہیے، اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اپنا نام لکھا، اس میں اختلاف ہے کہ پہلے مرسل الیہ کا نام بھی لکھا جا سکتا ہے؟ لیکن سنت طریقہ تو یہی ہے کہ بھیجنے والے کا نام پہلے ہونا چاہیے، کہتے ہیں کہ ہرقل کے بعض حواریوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسلوب مکتوب کو ناپسند کیا اور کہا کہ پہلے اپنا نام کیوں لکھا ہے؟ ہرقل نے جواب دیا کہ واقعی اگر وہ نبی ہے، تو پہلے اسے اپنا نام ہی لکھنا چاہیے۔

اللہ کا بندہ اور رسول:

اپنے اسم گرامی کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا بندہ اور رسول لکھا، اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا یہ تھا کہ میں اللہ رب کائنات کا فرستادہ بندہ ہوں، اس نے مجھے

نعمت رسالت سے سرفراز فرمایا ہے، تا کہ عیسائیوں کو اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنا دیا تھا، حضور ﷺ نے واضح فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہونا تو بہت بڑی بات ہے، میں اس قسم کا نہیں ہوں، میں تو بندۂ خدا اور اس کا بھیجا ہوا رسول ہوں، نبی ﷺ نے اپنے آپ کو بندۂ خدا لکھ کر توحید اور وحدت الٰہ کا سبق دیا، گویا خط کا آغاز اللہ رحمٰن و رحیم کے اسم مقدس سے شروع کیا اور لکھا کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی جانب سے ہرقل کی طرف خط۔

ایک غلطی کا ازالہ:

جامع لامع الدراری نے کہا ہے کہ مولوی رشید احمد گنگوہی نے ہرقل کو ''ہرقلۃ'' لکھا ہے، لغت میں تو کہیں نہیں، کہتا ہے کہ مولوی رشید احمد گنگوہی چونکہ بڑے عالم تھے، انہوں نے ہر جگہ ''ہرقلۃ'' ہی لکھا ہے، میں نے اسے تبدیل نہیں کیا، حالانکہ یہ اس کی اپنی غلطی ہے، آج کل عرب میں ''ل'' کو اس طرح ''لہ'' لکھتے ہیں اور ''ن'' کو اس طرح ''نہ'' لکھتے ہیں، انہوں نے اس طرح کے رسم الخط کو سمجھ لیا کہ ''ۃ'' کا اضافہ ہے، یعنی لکھا تو اس طرح ہرقلہ ہی تھا، اسے ہرقلۃ سمجھ لیا گیا اور جامع لامع الدراری کو پڑھنے میں غلطی ہوگئی۔

ہرقل سے خطاب:

آگے آنجناب کے مکتوب گرامی میں "عظیم الروم" ہے، آپ نے بادشاہ نہیں کہا، علماء اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کی بعثت کے بعد اب حکومتیں ختم ہو چکی ہیں، اب صرف آپ کی طرف سے کوئی حکومت حاصل کر سکتا ہے، "عظیم الروم" اس واسطے کہا کہ رومیوں میں اس کا بڑا مرتبہ اور مقام تھا، اس لئے اس کا احترام کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ایک ایک لفظ میں حکمت کو ملحوظ رکھا گیا

ہے، یہاں یہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ سب بعد کے علماء کی نکتہ آفرینیاں اور نکتہ سنجیاں ہیں، بلکہ حضور گرامی قدر نے ان سب باتوں کا لحاظ رکھا ہے، ورنہ آپ نے "عظیم الروم" کی جگہ "ملك الروم" کیوں نہ کہا؟ اسے آپ نے چھوڑ دیا ہے، ظاہر ہے چھوڑنے کی آخر کوئی معقول وجہ ہی ہوگی اور وہ وجہ وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔کسریٰ بھی اسی واسطے ناراض ہوگیا تھا کہ اس نے محمد عبداللہ و رسول اللہ اپنا نام لکھا ہے، طیش اور غصہ میں آ کر آنجناب کا مراسلہ پاش پاش کر دیا۔

غیر مسلم کو سلام:

" سلام علی من اتبع الهدیٰ " اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر غیر مسلم کو سلام کہنا ہو تو ان الفاظ سے کہنا چاہیے، السلام علیکم، یا سلام علیک نہیں کہنا چاہیے، آپ نے ایسا کرنے سے منع فرما دیا ہے: " لا تبدؤا اليهود والنصاریٰ بالسلام "[1] یہود اور نصاریٰ کو پہلے سلام نہ کرو۔

غیر مسلم کو بھی اخلاقاً سلام کہا جا سکتا ہے:

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے "السلام" کا لفظ نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں پہلے بھی سلام کہنا جائز ہے، جب کسی غیر مسلم سے کوئی کام ہو، کوئی ضرورت ہو تو ابتداءً بھی کہہ سکتا ہے، آگے باب باندھا ہے کہ یہود اور مسلمان ملے جلے ہوں، تو پہلے سلام کہہ سکتا ہے، لیکن ابن قیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہل بھی کر سکتا ہے کوئی ممانعت نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو پہلے کہا تھا: ﴿سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ﴾ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام رخصت ہونے لگے، اس وقت انہوں نے یہ جملہ فرمایا تھا، بعض کہتے ہیں کہ یہ سلام متارکہ ہے، سلام جدائی اور سلام مفارقت ہے، حالانکہ ایسا نہیں،

---

[1] سنن الترمذي: كتاب السير، باب ما جاء في التسليم على أهل الكتاب، رقم الحديث (١٦٠٢) وقال الترمذي: " هذا حديث حسن صحيح "

کیونکہ یہ سلام متارکہ ہوتا تو ﴿ساستغفر لك ربي﴾ نہ فرماتے، سلام متارکہ کا مفہوم تو یہ ہوتا ہے کہ جاؤ بھئی تمہیں سلام! یہ نوعیت ہی دوسری ہے، اس لیے ضرورتاً یا اخلاقی پہلو پیش نظر ہو، تو سلام کی ابتداء کر سکتا ہے، جیسا کہ ایک دفعہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک مجوسی کے ساتھ سفر کر رہے تھے، جب الگ ہوئے، تو انہوں نے السلام علیکم کہا، کسی نے کہا یہ تو مجوسی تھا، اسے سلام کیوں کر رہے ہو؟ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا یہ حق صحبت ہے، اتنی دیر تک مصاحبت سفر رہی ہے، السلام علیکم اس لئے بھی کہا کہ فرشتے وغیرہ بھی ساتھ ہوتے ہیں، آدمی ان کا ارادہ بھی کر لیتا ہے، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ کافر کو بھی اخلاقی طور پر یا ضرورت کے پیش نظر سلام کہہ دے، تو کوئی حرج نہیں، اس سے محبت ہی سمجھی جاتی ہے، یہ لفظ اشاعت محبت کے لیے ہے، یہ کہنے سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے، قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

﴿ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً ﴾

[آل عمران: ۲۸]

"ایمان والے مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بنائیں اور جو ایسا کرے گا، وہ اللہ کی طرف سے کسی چیز میں نہیں مگر یہ کہ تم ان سے بچو کسی طرح بچنا۔"

﴿ تَتَّقُوْا ﴾ سے اس طرف اشارہ ہے کہ اس قسم کی دوستی اور رواداری جائز ہے، اگر اس کے شر سے بچنا ہو اور السلام علیکم کہہ دے، تو کوئی حرج اور مضائقہ نہیں۔

ابن قیم کہتے ہیں: "إن سلمت فقد سلّم الصالحون، وإن تركت فقد ترك الصالحون"[1]

[1] زاد المعاد (۲/۳۸۸) یہ امام اوزاعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔

ابتداء میں سلام کرنے سے کیوں روکا؟

"لا تبدؤا الیھود و النصاریٰ بالسلام" کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس کا محمل خاص موقعہ ہے، جس وقت آپ بنی قریظہ پر فوج لے جا رہے تھے، اس وقت چونکہ یہودیوں سے لڑائی شروع تھی، اس لئے حضور ﷺ نے یہودیوں کو ابتداءً سلام کرنے سے منع فرما دیا تھا، کیونکہ سلام کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم تمہارے ساتھ لڑائی نہیں کرتے، اس حدیث کا پس منظر یہ ہے، یہ نہیں کہ کسی جگہ بھی سلام نہیں کرنا چاہیے۔ [1]

کفار کو کیسے مخاطب کیا جائے؟

حضور ﷺ نے " سلام علی من اتبع الھدی " جو فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ہدایت پر ہوگا، اس پر سلام ہوگا، ابن قیم رحمہ اللہ نے جو بحث کی ہے، وہ السلام علیکم کے متعلق ہے، یعنی السلام علیکم کہہ سکتا ہے، " سلام من اتبع الھدیٰ " میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں، اس طرح کا جملہ کہنے کو کوئی سلام نہیں کہتا، یہ تو اسی طرح کا جملہ ہے جیسے کہتے ہیں بڑے کو سلام ، صاحب کو سلام، صاحب سلامت، نیت مسلمانوں کو سلام کرنے کی ہوتی تھی، یہ تو ایک قسم کا توریہ ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے خطاب:

" سلام علی من اتبع الھدی" تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی کہا تھا، جب فرعون مصر کے پاس تشریف لے گئے تھے:

﴿ وَ السَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۞ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ

[1] حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے یہ توجیہ صیغۂ تمریض کے ساتھ کسی سے نقل کی ہے اور اپنی رائے "والظاھر أنه حکم عام " کے الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے، یعنی یہ حدیث بنو قریظہ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ اس کا حکم عام ہے کہ کہیں بھی یہود و نصاریٰ کو سلام کہنا درست نہیں۔ زاد المعاد (۲/ ۳۸۸)

عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى﴾ [طه: ٤٧، ٤٨]

''اور سلام اس پر جو ہدایت کے پیچھے چلے، بے شک ہم یقیناً ہماری طرف وحی کی گئی ہے کہ بے شک عذاب اس پر ہے ہے، جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔''

سلام ہدایت کی پیروی کرنے والوں پر اور عذاب مکذبین پر، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلام سلام تحیہ نہیں، ملاقات کے وقت انسان جو سلام کہتے ہیں، وہ اس قسم کی بات نہیں ہے، نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہودی سلام کریں تو "وعلیکم" کہہ دیا کرو، کیونکہ کبھی کبھی وہ شرارتاً "السام علیکم" [تم پر موت نازل ہو] کہہ دیتے تھے، اس کا جواب" وعلیکم" کافی ہے۔

أما بعد کی تشریح:

أما بعد: أما تو تفسیر کے لیے آتا ہے، پہلے مجمل طور پر کسی کا ذکر آجائے، تو اس کے بعد دو چیزیں ہوتی ہیں، یہاں صرف ایک ہی ہے، حافظ نے کہا کہ یہاں ذکر تو ایک چیز کا ہے،" أما الحمد فلله، أما الدعوة فإني أدعوك "" اس قسم کے الفاظ ہو سکتے ہیں،" أما بعد الحمد والصلوة ، فإني أدعوك بدعاية الإسلام " میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اسلام سے مراد ہے کہ میں جو دین لایا ہوں، اس کی طرف دعوت دیتا ہوں۔

اسلام کے احکام میں حالاتِ زمانہ کی رعایت:

اسلام اگرچہ سب انبیاء کا دین ہے، مگر جس وقت اللہ تعالیٰ کوئی پیغمبر بھیجتا ہے، اس میں کچھ خصوصی احکام ہوتے ہیں، اس لئے پہلا دین منسوخ ہوجاتا ہے، ادیان کی تعبیر لفظ اسلام سے نہیں ہوئی، اسلام وہی ہے جو نبیِٔ حاضر کا مسلک ہوگا۔

آج اسلام دیگر ادیانِ عالم یہودیت، نصرانیت، مجوسیت وغیرہ کے مقابلہ میں ہے، ویسے اسلام کا اطلاق ہر دور میں ہوتا تھا۔

اسلام قبول کرنے کے نتائج:

اس جگہ اسلام کا مطلب "أسلِم" مسلمان ہو جا کے مفہوم میں ہے، یعنی جو میں دعوت دے رہا ہوں، اسے قبول کر لے "تسلَم" بچ جائے گا، امن و سلامتی میں آ جائے گا، تیرا ملک تیرے پاس رہے گا اور آخرت میں جہنم سے بھی بچ جائے گا، "يؤتك الله" دوسرا جواب ہے "أسلِمْ" کا، پہلا جواب "تسلم" تھا، امر کے جواب میں سکون آ جاتا ہے، "إنْ" محذوف ہوتا ہے: "إنْ تسلم تیسلم، إن تسلم يؤتك الله أجرك مرتين" مسلمان ہو جاؤ گے، تو اللہ تعالیٰ دوہرا اجر دے گا، جیسا کہ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ جب اہل کتاب میں سے کوئی مسلمان ہو، اسے دوہرا اجر ملتا ہے، ایک سابقہ نبی پر ایمان لانے کا اور دوسرا نبیٔ حاضر پر ایمان لانے کا۔ [1]

دوہرے اجر کا مطلب:

"مرتین" کا بعض لوگ یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ ایک اجر اسے اس کے ایمان لانے کا اور دوسرا اجر اس طرح کہ اس کی وجہ سے جو دوسرے لوگ ایمان لائیں گے، ان کا بھی اسے اجر ملے گا، یہ گویا تسبب کی شکل ہوگی، سبب بنے گا تو دوہرا اجر ملے گا، کسی نیک عمل کی رسم ڈالے اور اس پر لوگ عمل پیرا ہوں گے، تو اس کا بھی اجر ملے گا۔

---

[1] صحيح البخاري: كتاب العلم، باب تعليم الرجل أمته وأهله، رقم الحديث (٩٧) صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب وجوب الإيمان برسالة نبينا محمد صلى الله عليه وسلم إلى جميع الناس، رقم الحديث (١٥٤)

انکار کا انجام:

"فإن تولیت " اگر تو پھر گیا اور روگردان ہوا، " فإن علیك إثم الأریسیین"، تو "أریسیین " کا گناہ بھی تجھ پر ہوگا، أریسیین بمعنی عتارین ، زراعین، کاشت کار لوگ یعنی ملک کے محنت پیشہ اور کھیتوں میں کام کرنے والوں کا گناہ بھی تمہاری گردن پر ہوگا، کیونکہ لوگ عام طور پر سربراہ ملک کے مسلک پر ہوتے ہیں، " الناس علی دین ملوکھم " لہٰذا تم اگر مسلمان ہوجاؤ گے، تو وہ بھی تمہیں دیکھ کر مسلمان ہوجائیں گے۔

" أریسیین" کی تحقیق:

"أریسیین" کا بعض لوگ یہ معنی کرتے ہیں کہ ان سے مراد مجوسی ہیں، کیونکہ ان میں سے زراعت پیشہ اور کاشت کار لوگ تھے، مجوسیوں کو بھی یہ لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، " إثم الأریسیین " کا پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اس میں جو گناہ ہوگا، وہ بھی تیرے ذمہ ہوگا، یہ تسبب کی شکل میں ہوگا، ورنہ مسئلہ تو قرآن کی رو سے یہ ہے: ﴿ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾ [الأنعام: ١٦٤] یہ مباشرت کے لیے ہے، یعنی اس شکل میں جو خود فعل کرتا ہے، وہ مباشر فعل ہے، اس کا اثر دوسرے پر نہیں پڑتا، تسبب کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے، گویا ایک کا کام دوسرے کا ذریعہ بن گیا: ﴿وَ لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ﴾ [العنکبوت: ١٣] تسبب کی وجہ سے دوسرے کا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔

" إثم الأریسیین " کا بعض یہ معنی کرتے ہیں کہ ریس ایک آدمی تھا، اس نے ایک نیا ہی مذہب ایجاد کرلیا تھا، عیسائی اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے، یہاں وہ لوگ مراد ہیں، بعض جگہ " ریسیین "بھی آتا ہے، یہاں پر تو " أریسیین" ہی آیا ہے، ایسے ہی ہے جیسے کسی قبیلے کا سردار اور بڑا آدمی ہوتا ہے۔

جیسے کعب اسے "کِعَاب" بھی کہہ دیتے ہیں، جمع کا صیغہ، اس سے سارے افراد مراد ہوتے ہیں، "أریسیین" کی صورت میں یہ معنی ہوجائے گا کہ جتنے کاشت کار ہیں، سب مراد ہیں۔

اہل کتاب کو دعوت:

پھر حضور ﷺ نے یہ آیات لکھیں، اس میں اختلاف ہوگیا کہ ۶ھ میں یہ آیتیں اتری تھیں یا نہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ آل عمران کے ابتداء سے یہاں تک آیات ۹ھ میں اس موقع پر نازل ہوئی تھیں، جب عیسائیوں کا وفد حضور اقدس کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اس لحاظ سے گویا اہل کتاب بھی اس میں داخل ہیں۔

﴿ قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ ﴾ [آل عمران: ٦٤]

اس واسطے نبی ﷺ نے یہ اپنی طرف سے لکھا ہے، گویا قرآن کی آیت نہیں، اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہی الفاظ میں آیات نازل فرما دیں، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو لفظ بولے تھے، وہی اللہ تعالیٰ نے نازل فرما دیئے، اگر بعینہ نہیں تھے، تو قریب قریب ملتے جلتے الفاظ تھے،[1] یہاں تو بالکل یہی الفاظ ہیں، اس لئے بعض کہتے ہیں کہ آیت پہلے اتری تھی، کیونکہ آگے جو الفاظ آرہے ہیں:

﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴾ [آل عمران: ٦٤]

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ ﴿ قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ ﴾ اللہ تعالیٰ کے الفاظ ہیں، ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا ﴾ [آل عمران: ٦٤] اگر وہ پھر جائیں، تو ﴿ فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا ﴾ [آل عمران: ٦٤] تم یہ کہو کہ گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري: أبواب القبلة، باب ما جاء في القبلة، رقم الحديث (٣٩٣) صحيح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر رضي الله عنه (٢٣٩٩)

کفار کو آیتِ قرآن لکھ کر بھیجنا:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن مجید کی آیت ہی ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی آگے کتاب التفسیر میں اس آیت کو لا کر استدلال کیا ہے کہ کفار کی طرف قرآن کی آیت لکھنا جائز ہے، پھر بوقت ضرورت قرآن کی آیت کو مس کرنا (چھونا) بھی جائز ہوگیا، بعض کہتے ہیں کہ تبلیغ کے لیے قرآن پڑھانا بھی جائز ہے، تاکہ اس سے متاثر ہو جائیں، بعض کہتے ہیں کہ قرآن کو صرف مسلمان ہی مس کر سکتے ہیں، اس لئے کفار اس کو مس نہیں کر سکتے: " لا یمس القرآن إلا طاھر "[1] اس لیے کافر کو قرآن نہیں دینا چاہیے اور پڑھانا بھی نہیں چاہیے، بعض کہتے ہیں کہ اگر اندازہ ہو کہ مسلمان ہو جائے، پھر تو اسے پڑھا دیا جائے اور اگر اندازہ اس کے برعکس ہو تو پھر نہیں پڑھانا چاہیے۔

بعض اوقات کفار محض مناظرہ کے لیے پڑھتے ہیں اور مسلمان سے مدد لیتے ہیں، پھر قرآن و شریعت میں کیڑے نکالنے شروع کر دیتے ہیں، ان کا مقصود تلاش حق نہیں ہوتا، یہ الگ بات ہے کہ ایک عالم دین اتنی وسعت علم اور وافر مطالعہ و معلومات رکھتا ہو اور مخالف کو قائل کر لے، تو ایسا آدمی کافر کو پڑھا سکتا ہے، جیسا کہ کہتے ہیں ایک عیسائی قسطنطنیہ میں ایک عالم کے پاس گیا، انہوں نے اسے پڑھانا شروع کر دیا اور وسعت علم اور عمیق مطالعہ کی بنا پر اس عیسائی کو قائل کر لیا، اس طرح کی صورت ہو تو کوئی حرج نہیں، یہ تو تبلیغ کی ایک صورت ہوگئی۔

دہلی کا ایک واقعہ:

دہلی میں ایک مدرسہ امینیہ ہے، اس کے سامنے ایک فوارہ ہے، وہاں اتنی وسیع جگہ تھی کہ جلسے وغیرہ منعقد ہوا کرتے تھے، وہاں ہر مذہب کا آدمی اپنے مذہب کی

---

[1] الموطأ (١/ ١٩٩) سنن الدارمي (٢/ ٢١٤) تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغلیل (١/ ١٥٨)

صداقت کے دلائل باری باری بیان کیا کرتا تھا، مثلاً ایک دن عیسائی آتے، ایک دن آریہ، ایک دن ہندو، ایک دن مسلمان، ایک دن مسلمانوں کی طرف سے ایک مولوی احمد سعید صاحب تقریر کر رہے تھے، مولوی موصوف خود بھی دہلی کے تھے، دہلی کے تمام حنفی علماء اس ایک آدمی کے علاوہ باہر سے آئے ہوئے تھے، وہ اس مسئلہ پر بحث کر رہے تھے کہ اسلام نے سود اور قمار کی حرمت بیان کی ہے، گویا وہ اسلام کی خوبیاں، اوصاف اور امتیازات بیان کر رہے تھے، ایک آریہ نے اعتراض کیا کہ یہ تو کاروباری چیز ہے، اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے، البتہ قمار ٹھیک نہیں، پھر بھی اگر کبھی اس کا ارتکاب کر لے تو یہ الگ چیز ہے، دیوالی کے موقعہ پر یہ لوگ قمار بازی کا دور چلا لیتے ہیں، شاید اس لئے کہ اسے ایسے موقع پر جائز سمجھتے ہیں۔

فقہ حنفی اور سود:

آریہ مزید کہنے لگا کہ جہاں تک سود کا تعلق ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس کے متعلق تو تمہاری کتابوں میں بھی لکھا ہے کہ کوئی حرج نہیں، یہ معترض آریہ وہاں کے ایک حافظ عبدالوہاب سے پڑھ کر آتا اور صبح کو اعتراض کرتا کہ تمہاری اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس میں کوئی قباحت نہیں:

" لا ربا بين المسلم والحربي "

دارالحرب میں مسلمان اور حربی کے درمیان کوئی سود نہیں۔

یعنی دارالحرب میں اگر مسلمان رہتا ہو تو حربی سے سود لے سکتا ہے، مولوی صاحب کہنے لگے کہ یہ فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے، کتاب وسنت میں کہیں نہیں ہے۔ "لا ربا بين المسلم والحربي " کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کے مابین سود بالکل ہے ہی نہیں، اس آریہ نے کہا کہ مولوی صاحب آپ عجیب معنی کرتے ہیں، آگے تو ذرا ملاحظہ فرمائیں:

" لأنه مال مباح، ويجوز عقده بأي طريق كان " [1]

حربی کا مال مباح ہے، جس طریقے سے لو جائز ہے۔

سود تو اس کا نام رکھا گیا ہے، ویسے تو حربی کا مال سمجھ کر لیا گیا ہے، اس واسطے سود نام رکھ لینا جائز ہے۔ ایسے آدمی کو تو نہیں پڑھانا چاہیے۔

﴿ فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا ﴾ سے اس آیت کے قرآنی آیت ہونے کا استدلال اس لئے کیا گیا ہے کہ خط میں " فإن تولوا " کے الفاظ ہیں، اگر یہ جملہ حضور ﷺ کا اپنا ہوتا، تو آپ " فإن تولوا " کے بجائے " فإن توليتم " فرماتے کہ اگر تم روگرداں ہو جاؤ اور آگے آپ " نقول بانا مسلمون " کہتے یا فرماتے " يقول اشهدوا " لیکن یہاں فرمایا گیا ہے: ﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا ﴾ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآنی آیت ہے۔

اہل کتاب کو خطاب:

﴿ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ ﴾

[آل عمران: ٦٤]

"اے اہل کتاب! آؤ ایسے کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مساوی ہے۔"

﴿ تَعَالَوْا ﴾ علوّ سے ہے، جس کا معنی اوپر آنا کے ہے، پھر مطلق آنا کے معنی ہوگئے ہیں۔

عیسائی بھی عقیدتاً توحید کے قائل ہیں:

"ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے" کا مطلب یہ ہے کہ عقیدتاً تم بھی

---

[1] البحر الرائق (١٤٧/٦) فتح القدير (٣٥٨/٥)

اسے تسلیم کرتے ہو اور ہم بھی اسے مانتے ہیں، عیسائی عقیدتاً توحید کے قائل ہیں، اگرچہ " لا إله إلا الله "کے الفاظ زبان سے نہیں کہتے، اس بات کو تو مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی معبود شریک نہیں، اگرچہ عملی طور پر مسیح کو خدا کہہ کر اس کا انکار کر دیتے ہیں اور زبان سے کہتے ہیں توحید فی التثلیث ، خدا کے جو تین حصے کرتے ہیں باپ، بیٹا اور روح القدس، اس میں گویا وہ تین نہیں کہتے، ان تین کو افراد نہیں مانتے اور اجزاء بھی نہیں مانتے بلکہ اقانیم کہتے ہیں، اقانیم اس اندیشہ کے پیش نظر کہ اس میں تین افراد کا وہم نہ پڑ جائے، کہتے ہیں باپ بھی قادر مطلق، بیٹا بھی قادر مطلق اور روح القدس بھی قادر مطلق لیکن تین قادر مطلق نہیں ایک قادر مطلق، بعد میں کہہ دیتے ہیں باپ بھی ازلی، بیٹا بھی ازلی اور روح القدس بھی ازلی، لیکن تین ازلی نہیں ایک ازلی، یہ ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے کہ عام آدمی کے ذہن میں اس کا مفہوم نہیں آتا۔

صوفیا کی توجیہ:

صوفیوں نے اس مسئلہ کو سمجھا دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ تین کا جو لفظ بولا جاتا ہے، وہ مراتب کے اعتبار سے بولا جاتا ہے، ایک کا لحاظ اصلیت کے اعتبار سے، اصل ایک ہی ہے، تین اس کے مراتب ہیں، ایک مرتبہ میں وہ لاہوت ہے، دوسرے مرتبہ میں جا کر اس کا نام بیٹا ہے اور ایک اس کی تجلی ہے، اس مرتبہ میں اس کا نام روح القدس ہے، گویا اس طرح صوفیا نے عیسائیوں کی مشکل آسان کر دی ہے!

عقیدۂ تثلیث:

مسلمان اعتراض کرتے ہیں کہ ایک میں تین اور تین میں ایک، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بیوقوف عیسائیوں کی سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی، پادری عبدالحق نے کہا ہے کہ ہم تین یا ایک یہ وحدت یا تثلیث عددی نہیں، ایسا احمق آدمی ہے، کہتا ہے یہ

وحدت عددی نہیں، یکے ماندہ از قید یکے پاک، گویا ایک عددی نہ ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ عدد کی تعریف میں اہل حساب میں اختلاف ہے، سوال یہ ہے کہ عدد آخر کسے کہتے ہیں؟ بعض ایسی تعریف کرتے ہیں جو واحد پر صادق نہیں آتی، وہ کہتے ہیں عدد وہ ہوتا ہے جو مجموعہ حاشیتین کا نصف ہو، ایک کے نیچے کوئی حاشیہ ہی نہیں، اس واسطے ایک کو عدد نہیں کہہ سکتے، عدد کا آغاز دو سے ہوگا، دو سے اوپر تین ہے اور تین کے نیچے ایک ہے، تین اور ایک "حاشیتین" کا مجموعہ یہ چار ہوئے اور دو مجموعہ "حاشیتین" چار کا نصف ہوا، یہ عدد ہوا۔

بعض کہتے ہیں کہ جو آحاد کی کمیت کے لیے موضوع ہو، اس کو عدد کہتے ہیں، اس صورت میں تو کم از کم تین ہونے چاہئیں، کیونکہ آحاد جمع ہے، لہٰذا اس کی تعریف کے مطابق دو کو عدد نہیں کہتے اور نہ ایک ہی کو عدد کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ کمیت کے لیے جو ہو اس کو عدد کہتے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ بس صرف کمیت کے لیے ہو، اس کے لیے تو ایک بھی ہے، ایک کی کمیت بیان کرنے کے لیے واحد کا لفظ ہے، پادری عبدالحق کہتا ہے کہ واحد میں عددی وحدت نہیں ہے اور تین جو تثلیث ہے، ہم کہتے ہیں یہ عددی نہیں، بڑا نادان اور احمق آدمی ہے۔

عدد تو ہر ایک چیز کو عارض ہوتا ہے، عدد کی یہ خصوصیت تو نہیں کہ مادیات کو عارض ہو، مادیات مجردات کوئی بھی چیز ہو، اس کو عدد عارض ہوسکتا ہے، کہتے ہیں خدا ایک ہے، دوسرے جو مجردات ارواح وغیرہ ہیں، ان کے متعلق کہتے ہیں کثیر ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ عدد سب کے لیے استعمال ہوتا ہے، عدد سے کوئی چیز خالی نہیں، وحدت بھی اسی طرح ہے، بہر حال ان کے ذہن میں اب تک یہ بات نہیں آئی کہ اس کا معنی کیا ہے؟ تین بھی مانتے ہیں، ایک بھی مانتے ہیں، ویسے کلمہ عقیدتاً تو

مشترک ہے کہ خدا ایک ہی ہے، لیکن ایسا ایک ہے جس میں کثرت ہے، ایسا کثیر ہے، جس میں وحدت ہے، گویا عیسائی وحدت محضہ نہیں سمجھتے، حالانکہ یہ بات بھی غلط ہے، وہ بھی وحدت محضہ کے قائل ہیں، وحدت محضہ لاہوت میں ہے، اس مرتبہ میں نہیں کہ مجموعہ بھی ہو اور وحدت محضہ بھی رہے۔

پادری عبدالحق سے مناظرہ:

مولانا ابراہیم سیالکوٹی کے ساتھ ایک دفعہ اس کا مناظرہ ہوا، شاید وہ اس وقت تھکے ہوئے تھے، کوئی لمبا مضمون پڑھا ہوگا، اسی اثناء میں پادری عبدالحق آ گیا، اس کا دماغ اس وقت ذرا تازہ اور حاضر تھا، کہنے لگا مولوی صاحب آپ نے سورۂ اخلاص پڑھ دی ہے، وہ تو چند سوالب کا مجموعہ ہے، اس میں آپ نے وحدت محضہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، بتایئے وحدت محضہ کیا ہے؟ آپ نے چند سوالب بیان کر دیے ہیں کہ اس کا باپ نہیں، بیٹا نہیں، کوئی ہمسر اور ساجھی نہیں، یہ کوئی تعریف ہے؟ میرے ہاتھ میں یہ قلم ہے، اس کے پیچھے گھوڑا نہیں، گاڑی نہیں، یہ کوئی تعریف ہے؟ اس طرح چرب لسانی سے مولوی صاحب پر غالب سا آ گیا، اس کے بعد میرے ساتھ بھی مناظرہ ہوا، میں نے اس کی اچھی خبر لی، کہنے لگا آپ میدان مناظرہ کے مردشاہ سوار ہیں، میں نے اس کی کتاب کا "إثبات التوحید" کے نام سے دندان شکن جواب دیا ہے، اس کا آج تک جواب نہیں دیا، کہتا ہے ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا، تیں سال کا طویل زمانہ گزر چکا ہے، پادری عبدالحق بھارت میں ہے، زندہ ہے، لیکن جواب ندارد، حافظ آباد میں بھی ایک مناظرہ ہوا تھا، مولوی ثناء اللہ صاحب بھی موجود تھے، کہنے لگے حافظ صاحب پہلے اسے یعنی پادری کو مہینہ وقف کر کے پڑھائیں، تاکہ انہیں کچھ سوجھ بوجھ ہو سکے۔

عقیدۂ تثلیث اور مسیح علیہ السلام:

﴿ تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ ﴾ [آل عمران: ٦٤] گویا عقیدتاً مشترک ہیں، مسئلۂ تثلیث کے متعلق عیسائیوں نے بھی سمجھا ہے کہ یہ مسیح علیہ السلام کی تعلیم معلوم نہیں ہوتی، انجیل میں اس کا کسی جگہ پر بھی ذکر نہیں، صرف ایک موقعہ پر حواریوں سے خطاب میں اتنا کہا تھا کہ جاؤ! باپ، بیٹا اور روح القدس کا بپتسمہ [1] دو، عیسائی محققین اس کے متعلق بھی کہتے ہیں کہ یہ الحاقی الفاظ ہیں، یعنی بعد کے الفاظ ہیں، کسی من چلے نے داخل کر دیئے ہیں۔

انجیل یوحنا کا ابتدائیہ:

عیسائی انجیل یوحنا کی ابتدا پر زیادہ زور دیتے ہیں، یوحنا کی ابتداء اس طرح ہے کہ ابتدا میں کلام تھا، کلام خدا کے ساتھ تھا، کلام خدا تھا، اس کلام کو بہت اونچے مرتبہ کا کلام سمجھتے ہیں، گویا کلام اور بیٹا ان کے نزدیک ایک ہیں۔ " كلمة الله "کلمہ بیٹا، یہ دو لفظ ان کے نزدیک گویا ایک ہی حقیقت کی خبر دیتے ہیں، ایک اقنوم کو مولود بھی کہہ دیتے ہیں، بیٹا بھی کہہ دیتے ہیں، اس کے متعلق ان کی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ کلمہ مولود ابتدا میں اس کا کلام تھا، کلام پھر خدا کے ساتھ تھا، اس سے اثنانیت ثابت ہوگئی، پھر کلام خدا تھا، عینیت ثابت ہوگئی، اس بنا پر محققین عیسائی خود کہتے ہیں کہ یہ بعد کا الحاقی کلام ہے، سابقہ کسی کتاب میں بھی وہ ثابت نہیں کر سکتے۔

﴿ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ ﴾ [آل عمران: ٦٤]

یہ بھی ہمارے اور تمہارے مابین مشترک ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، گویا یہ بات بھی مشترک ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک مانیں اعتقاداً بھی

---

[1] بپتسمہ اصطباغ کو کہتے ہیں، عربی میں اصطباغ ہے، اپنی زبان میں بپتسمہ کہتے ہیں، کچھ پانی کے چھینٹے مارتے ہیں، عیسائی بنانے کا نام بپتسمہ رکھا ہے۔ (مولف)

اور عملاً بھی اور صرف اسی کو اپنا معبود مانیں۔

عیسائی کہتے ہیں کہ مولود سے ہمارے ہاں مراد بیٹا ہے، اور روح القدس کو منبسط کہتے ہیں، صوفیوں نے، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، تین مراتب بیان کئے ہیں، اس طرح عیسائی برادری کے لیے سہولت اور آسانی کا راستہ کھول دینے کی کوشش کی ہے، یعنی ایک مرتبہ میں باپ، ایک مرتبہ میں بیٹا اور ایک مرتبہ میں روح القدس کہتے ہیں، صوفی دنیا لاہوت، ظاہر وجود اور تجلی اعظم، ان کے ہاں تینوں کا مفہوم اور مطلب ایک ہی ہے، لاہوت تو باپ ہے، وجود کا اقصٰی درجہ جو ہے وہ تمام چیزوں پر حاوی ہے، اس لحاظ سے اس کو باپ کہہ دیتے ہیں، بیٹا اس طرح ہے، جس طرح کسی پہ پرتو ہوتا ہے، اس لحاظ سے اس مرتبہ میں اس کا نام بیٹا ہے، ظاہر وجود بھی اسے کہتے ہیں، پھر ظاہر وجود پر اللہ تعالٰی کی جو تجلی ہے، اس کا نام تجلی اعظم ہے، اسی وجہ سے صوفی کہتے ہیں کہ اللہ تعالٰی خارج میں موجود ہے، ورنہ لاہوت اس وجود سے الگ ہے، اس سے اوپر ہے، ہم اسے موجود نہیں کر سکتے، ہم تو ظاہر وجود کو ہی وجود سمجھتے ہیں۔

ابن تیمیہ کی تفسیر:

ابن تیمیہ نے جو تفسیر کی ہے، اس میں سامنے تو عیسائی رکھے ہیں، لیکن زیادہ تر صوفیوں کا رد کیا ہے، یعنی وجودی صوفی، جو وجود ایک ہی مانتے ہیں، پھر ان کے حصے کر دیتے ہیں، جہاں میں جو شے بھی ہے، اس شے کی صورت ہے اور ایک اس میں قوت ہے، صورت تو ظاہر وجود ہے، جو قوت ہے یہ تجلیات میں سے ہے، گویا ان کے خیال میں ایک ہی وجود ہے۔

عیسائی اقانیم مانتے ہیں، مسلمان صفات مانتے ہیں، عیسائی مستقل چیزیں

مانتے ہیں، روح القدس کو بھی مستقل ہی مانتے ہیں، مسلمان روح القدس کی جگہ حیات مانتے ہیں، یہ صفت ہے، گویا روح القدس کو بھی مستقل ہی مانتے ہیں، مسلمان روح القدس کی جگہ حیات مانتے ہیں، یہ صفت ہے، گویا روح القدس کی جگہ "حي" ہوگیا، جو اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے، ظاہر وجود کی جگہ قیوم ہوگیا، صورتیں وصف قیومیت سے ہی بنتی ہیں، ہر چیز اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے، اس طرح مسلمان صفات کے قائل ہیں اور عیسائی اقانیم کے۔

لفظ اقنوم کی تحقیق:

اقنوم کے لغوی معنی حصہ کے ہیں، لیکن عیسائی یہ مفہوم نہیں لیتے، نہ وہ افراد مانتے ہیں، اگر افراد کہیں تو تین خدا ہوگئے، اجزا کہیں تو خدا مرکب ہوگیا، اس لئے نہ افراد ہوئے نہ اجزا، مراتب والی بات ان کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔

اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ اس کا پتہ صرف اسی وقت چلتا ہے، جب انسان کو شعور حاصل ہوجائے، پہلے پتہ نہیں چلتا، سابقہ انبیاء و رسل کی دعوت تو اس قسم کی نہیں، عیسائیوں کے پاس سابقہ آسمانی کتب، جس بھی شکل میں ہیں، موجود ہیں، ان میں سے کسی کا حوالہ پیش نہیں کرسکتے کہ کسی میں یہ لکھا ہو کہ ایک میں تین اور تین میں ایک ہے۔

انبیاء کی بعثت کا مقصد:

پیغمبر تو آئے ہی اس لئے ہیں کہ گم گردہ راہ انسانیت کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی معرفت کا درس دیں اور صراط مستقیم کی روشنی سے روشناس کرائیں، اس تعلیم کے علاوہ کسی پیغمبر نے اور کوئی تعلیم نہیں دی، مسیح علیہ السلام کی جو انجیل ہے، اس میں بھی اس قسم کی کوئی تعلیم نہیں، یہ دو جملے، جو یوحنا کی انجیل کے ابتدا میں آئے ہیں، محقق عیسائی ان کے بارے میں الحاقی ہونے کے قائل ہیں، ویسے ان کا مفہوم بھی واضح اور

ظاہر نہیں ہے، کیونکہ کلام تو صفت ہے، اب یہ بات کہ صفت عین ذات ہے یا الگ ہے؟ اس میں اختلاف ہے، معتزلہ کہتے ہیں عین ذات ہے، دوسرے کہتے ہیں قائم بالذات ہے، اس طرح باپ، بیٹا اور روح القدس میں بیٹا سے مراد مسیح نہیں، یہ محض عیسائیوں کی اپنی بنائی ہوئی بات ہے، جب تک انہیں اچھی طرح سمجھایا نہ جائے، اس وقت تک ان تعبیرات کا صحیح مطلب نہیں سمجھ سکتے۔

عیسائیوں کی بے تکی باتیں:

﴿أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ﴾ [آل عمران: ٦٤] یہ کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، آج کل عیسائی کہتے ہیں کہ لاہوت کا نام اللہ رکھ دیتے ہیں، مسیح کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہہ دیتے ہیں، یہ لوگ مسیح کو بیٹا اس معنی سے نہیں کہتے کہ وہ خدا کی اقنوم ہے، بیٹا اقنوم، مسیح یہ دونوں مل کر ایک حقیقت بن گئی، اس کا نام یسوع ہے، گویا مسیح کی ایک انسانی روح ہے اور ایک اللہ تعالیٰ کی اقنوم بیٹا، بیٹا اقنوم مسیح کے ساتھ مل کر متحد ہوگئی، اس طرح یہ ایک ہوگئی۔

اس پر مسلمان اعتراض کرتے ہیں کہ دو چیزیں مل کر ایک ہوجائیں، یہ ناممکن ہے، اگر دو چیزیں مل کر ایک ہوجائیں، تو ان دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہوگی کہ یا تو ایک دوسرے میں حال محال ہیں، دونوں قائم ہیں، اس صورت میں اتحاد کیسے ہوا؟ جب دونوں اپنی اپنی جگہ قائم ہیں، اس کا وجود اپنا، اس کا اپنا، یا دوسری صورت یہ ہو کہ ایک فنا ہوجائے، پھر بھی اتحاد نہ ہوا، کیونکہ ایک تو ختم ہوگئی اور اس کا وجود ہی باقی نہ رہا، اس لئے حلول بھی محال اللہ تعالیٰ کی ذات کا اور اتحاد بھی محال، بہر حال یہ ایک مستقل مسئلہ ہے۔

پادری عبدالحق نے ایک دفعہ تقریر کی، تقریر کا انداز بالکل اسی طرح تھا جس

طرح آج کل کے بریلوی حضرات کرتے ہیں، جذباتی طور پر کہنے لگا اس کی تجلی پتھر کے مکان میں ہو سکتی ہے، وہاں کہتے ہو اللہ کی تجلیات ہوتی ہیں، یہودیوں کے نزدیک خیمے میں تجلی ہوتی ہے، جب ان حجرات و خشتیات میں تجلی ہو سکتی ہے، تو انسان جو اشرف المخلوقات ہے، انسان کامل میں تجلی کیوں نہیں ہو سکتی؟ قرآن مجید میں ثابت ہے کہ آگ میں اللہ تعالیٰ کی تجلی ہوئی، آگ میں تجلی ہو سکتی ہے، تو انسان میں کیوں نہیں ہو سکتی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دور سے آگ دیکھی، وہاں سے آواز آئی: ﴿ إِنِّيٓ أَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [القصص: ۳۰]

"بے شک میں ہی اللہ ہوں، جو سارے جہانوں کا رب ہے۔"

﴿ أَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ [النمل:۸]

"کہ برکت دی گئی ہے، اسے جو آگ میں ہے اور جو اس کے ارگرد ہے۔"

ایک دفعہ مناظرہ ہوا، اس نے یہ آیت پیش کی، مولوی ابراہیم کہنے لگے یہاں " بورك " ہے " تبارك " نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آگ میں جو کچھ ہے اس پر برکت کی گئی ہے، وہ خدا نہیں ہو سکتا، کوئی فرشتہ یا اور کوئی چیز ہوگی، خدا تو " متبارك " ہونا چاہیے تھا، وہاں " بورك " ہے، لوگ اس طرح کی بے تکی تقریر کرتے ہیں، تاکہ سادہ لوح عوام ان کے دام فریب کا شکار ہو جائیں، اگر وہاں کوئی بریلوی پھنس جائے تو معاملہ ٹھیک ہو جائے۔

تجلیات کی اقسام:

لوگوں نے اس طرح کے مسئلے بنا رکھے ہیں کہ تجلی ہوتی ہے، حالانکہ عالم شہادت میں کوئی تجلی نہیں ہوتی، جیسا کہ صوفی تجلیات کے چار مراتب بیان کرتے ہیں،

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، مجردات، تجلیات مثالیہ، تجلیات صوریہ اور تجلیات معنویہ، بعض صوفی شہادی تجلی بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر یہ بات ثابت کی جائے، پھر تو عیسائیوں کی بات ٹھیک ہوگئی، تجلی شہادی کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آگ کی شکل میں ظاہر ہوا، یہ تو ہندوؤں کا مذہب ہے، پھر آگے یوں بھی کہتے ہیں کہ آگ کی شکل میں آ سکتا ہے، تو انسان کی شکل میں کیوں نہیں آ سکتا؟ عیسائیوں کا مذہب ٹھیک ہوگیا کہ مسیح خدا ہے، اس لئے تجلی شہادی کا نظریہ تو بالکل غلط ہے۔

درختِ طور کی آگ:

آگ کی نوعیت وہاں یہ تھی کہ وہاں فرشتے تھے، ان کی روشنی تھی، کیونکہ فرشتے نوری ہیں، نور اور نار کا بہت زیادہ بڑا فرق نہیں ہے، حضرت موسیٰ جس نظریہ کے پیش نظر وہاں تشریف لے گئے تھے، وہ بھی یہی تھا کہ وہاں آگ ہوگی، اسی کے پیش نظر وہ کسی چیز کا گٹھا سا آگ جلانے کی غرض سے آگے کرتے تو آگ پیچھے ہٹ جاتی، جب پیچھے ہٹتے تو آگ آگے آجاتی، اس صورت حال سے حضرت موسیٰ علیہ السلام عجیب مخمصے میں پڑ گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ آگ دراصل درخت میں تھی، جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

﴿ نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ﴾

[القصص: ۳۰]

”تو اسے بابرکت قطعہ میں وادی کے دائیں کنارے سے ایک درخت سے آواز دی گئی۔“

شجرہ تو نہیں کہہ رہا ﴿ اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [القصص: ۳۰] بلکہ شجرہ کی جانب سے آواز آ رہی ہے، اس موقع کی حقیقت سمجھے بغیر بعض صوفی کہہ دیتے ہیں کہ جب درخت ﴿ اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ ﴾ کہہ سکتا ہے، تو انسان کیوں نہیں کہہ سکتا؟

حالانکہ وہاں درخت سے آواز آنے کی نوعیت بعینہ ریڈیو کی ہے، پیچھے خطیب و مقرر کی آواز ہوتی ہے، ورنہ لوہا نہیں بول رہا ہوتا، اسی طرح درخت کی طرف سے جو آواز آرہی ہے، وہ آواز اللہ تعالیٰ کی ہے، ورنہ یہ مطلب نہیں ہے کہ درخت کہہ رہا ہے ﴿ اَنَا اللّٰهُ ﴾ کہ میں اللہ ہوں، اگر درخت ﴿ اَنَا اللّٰهُ ﴾ کہہ رہا ہے، تو پھر فرعون نے ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی ﴾ [النزعت: ٢٤] کہا، وہ بالکل درست ہوا، گویا ان کے نزدیک فرعون بڑا موحد ہوا، یہی مثال مولوی اسماعیل نے دے کر غلطی کی ہے، حالانکہ صوفی سارے اس پر متفق ہیں کہ شہادی تجلی نہیں، تجلی مجرد ہے یا صوری، مثالی ہے یا معنوی، ان لوگوں نے نیا ہی راستہ نکالا ہے۔

تثلیث اور الوہیتِ مسیح:

﴿ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا ﴾ [آل عمران:٦٤] اس کے ساتھ کسی شئے کو شریک بھی نہ ٹھہرائیں۔

تثلیث کا مسلک الگ اور الوہیت مسیح کا مسئلہ الگ اور مسیح کا ابن اللہ ہونا الگ ہے، بیٹا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مسیح کو اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنا لیا ہے، عیسائی یہ تو نہیں کہتے کہ مسیح اقنوم جو بیٹا ہے وہ ہے، ویسے اس اقنوم کے ساتھ مسیح کے اتحاد کا تعلق تو مانتے ہیں، اس معنی سے تو ایک ہوگیا، جو الوہیت کے قائل ہوتے ہیں، وہ تو الوہیت ہی کے قائل ہیں، بیٹا کو متبنٰی کے معنی میں لیتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنا لیا ہے۔

عیسائیوں اور مسلمان صوفیوں کی ایک جیسی باتیں:

عیسائی اور مسلمان صوفی جب اس مقام پر پہنچتے ہیں، تو اس قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں کہ جب انسان اعلیٰ مقام و مرتبہ میں ہوتا ہے، تو الوہیت اس کو ہر طرف سے

گھیر لیتی ہے، جب وہ ہر طرف سے الوہیت کے گھیراؤ میں آجاتا ہے، تو اس کے احکام خدا والے ہوجاتے ہیں، پھر وہ بندے کے احکام نہیں رہتے، خدا کے ہی ہوجاتے ہیں، جیسا کہ لوہے کو آگ میں داخل کیا جائے، تو آگ اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے، تو لوہا گرم ہوجاتا ہے، یہ گرمی اصل میں لوہے کی نہیں ہوتی ہے، بلکہ آگ کی ہوتی ہے، کیونکہ آگ اس میں داخل ہوگئی ہے، اس لوہے کو جس چیز پر لگاؤ گے اسے گرمی پہنچے گی، یہ مثال دے کر صوفی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان میں بھی الوہیت اسی طرح سرایت کر جاتی ہے، گویا انسان نے الوہیت کا جامہ اوڑھ لیا ہے، عیسائی کہتے ہیں خدا نے بشریت کا جامہ اوڑھ لیا ہے، بریلوی حضرات بھی یہی کہتے ہیں کہ خدا نے بشریت کا لبادہ اوڑھ لیا ہے، گویا عیسائی دنیا کا مذہب یہ ہوا: " تدرع اللاھوت بالناسوت " لاہوت نے ناسوتی لبادہ اوڑھ لیا ہے، صوفی کہتے ہیں: " تدرع الناسوت باللاھوت " ناسوت نے خدائی جامہ اوڑھ لیا ہے، خدا گویا اس کے گرد محیط ہوگیا، یہ نہیں کہتے کہ خدا بن گیا ہے، بہر صورت فرق کرتے ہیں۔

<u>عقیدۂ تثلیث کا آغاز:</u>

﴿ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾
[آل عمران:٦٤]

مقدر سوال کا جواب ہے، یعنی سارے پیغمبر مسیح علیہ السلام سمیت توحید کی تعلیم دیتے رہے ہیں، پھر عیسائیوں نے یہ مسئلہ کیسے گھڑ لیا کہ مسیح اور ان کی والدہ محترمہ کو خدا کہنے لگے اور اس طرح خدا کے تین حصے کر دیئے؟

اس کا جواب دیا ہے کہ یہ پادریوں نے بنایا ہے، ملاؤں کی غلطی ہے، صوفیوں

اور احبار و رہبان کی پیدوار ہے:

﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾

[المائدہ: ۷۷]

''اے اہل کتاب ! اپنے دین میں ناحق حد سے نہ بڑھو اور اس قوم کی خواہشوں کے پیچھے مت چلو، جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے اور انہوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔''

ان لوگوں نے یہ بات بنائی، کیونکہ عوام عام طور پر ایسے لوگوں کے پیروکار اور معتقد ہوتے ہیں، کسی کو صوفی سمجھ کر کسی کو فقیر تصور کر کے لوگ ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں، یہ لوگ بڑے بڑے کمالات کے مالک سمجھے جاتے ہیں، ان کے کمالات اور شعبدہ بازی دیکھ کر لوگ قائل ہو جاتے ہیں کہ واقعی بڑے صاحب کمال لوگ ہیں، جو فرمائیں گے ٹھیک ہی فرمائیں گے، اللہ والے جو ہوئے:

گفتہ او گفتہ اللہ بود　　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود [1]

ان کو حلال و حرام کے کلی اختیارات ہیں۔

عیسائیت میں حلال و حرام کا اختیار:

عیسائیوں نے کہا کہ ہمارے پادری اور پوپ صاحبان کسی چیز کو اگر حلال قرار دے دیں، تو وہ حلال ہے اور اگر کسی چیز کو حرام کر دیں تو وہ حرام ہے اور بڑے پوپ کو تو گناہ معاف کرنے کا بھی کلی اختیار ہے، اس لئے کرسمس ڈے کے موقع پر بڑے پوپ کی خدمت میں حاضر ہوکر اعتراف گناہ کر کے معافی کی استدعا کرتے ہیں،

[1] اس کی کہی ہوئی بات دراصل اللہ ہی کی کہی ہوئی ہے، اگرچہ کسی اللہ کے بندے کے گلے سے نکلی ہے۔

پوپ صاحب فرما دیتے ہیں چلو جاؤ معاف! بس اتنی حرکتِ زبان سے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور گناہ گار بھی شاداں وفرحاں واپس آجاتے ہیں۔

عیسائیت میں پوپ کا مقام:

کہتے ہیں اندلس میں عیسائیوں نے مسلمانوں سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ مسلمانوں کے بچوں کو جبراً عیسائی نہیں بنایا جائے گا، ایک وقت آیا کہ وہاں کے ایک بادشاہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان کو عیسائی بنا لیا جائے، تو بڑی نیکی کا کام ہے، جہنم سے بچ جائیں گے، ساتھ ہی اسے یہ خیال بھی آیا کہ ان سے معاہدہ ہے، ایسا نہ ہو کہ معاہدہ کی خلاف ورزی ہو اور گناہ گار ہو جاؤں، بڑے پادری صاحب کو اپنے عندیہ سے مطلع کیا کہ میں نے مسلمانوں سے معاہدہ کیا ہوا ہے، ورنہ میں مسیحیت کی بڑی خدمت کرنا چاہتا ہوں، یہ معاہدہ سدّ راہ ہے، لہٰذا آپ عہد شکنی کا میرا گناہ معاف کر دیں، تو میں یہ کارِ خیر کر گزروں، پادری صاحب فراخ دل تھے، فوراً معاف کر دیا، اتنا بڑا جرم، جو اقوامِ عالم کے منشور میں بھی سنگین جرم ہے اور تمام شریعتوں میں گھناؤنا فعل ہے، چشم زدن میں معاف ہو گیا، یہ مقام ومرتبہ ہے عیسائیوں کے نزدیک پادری اور پوپ صاحب کا!!

اسلام میں حلال وحرام کا اختیار:

اسلام میں یہ مقام حلت وحرمت صرف اللہ کو حاصل ہے اور گناہ معاف کرنے کے کلی اختیارات محض اللہ تعالیٰ کو حاصل ہیں، ارشاد باری ہے:

﴿مَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [آل عمران: ۱۳۵]

''اللہ تعالیٰ کے ماسوا کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا۔''

اخبارات میں یہ خبر پڑھی تھی کہ عیسائیوں نے چندہ جمع کرنے کے لیے عورتیں بھیجیں، ان عورتوں نے پوپ صاحب کو لکھا کہ لوگ چندہ دینے سے پہلے بوسہ لینے کا

تقاضا کرتے ہیں، ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ پوپ صاحب نے ایک دو کی اجازت دے دی، یہ لوگ ایسے ایسے کام کرواتے ہیں کہ گناہ گار کو معافی دے دی اور اجنبی سے بوس و کنار کی اجازت مرحمت فرما دی!

عیسائیوں میں شرک:

﴿ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ [آل عمران:٦٤] اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے ان کو رب بنا لیا تھا، اللہ تعالیٰ کی ذات کے ماسوا کوئی کارساز اور رب نہیں اور نبی کی ذات کے سوا کوئی معصوم در اجتہاد نہیں، بعد میں لوگوں نے جو باتیں کہی ہیں، ہوسکتا ہے غلط ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صحیح ہوں، اس لئے ان لوگوں کا یہ کہنا کہ قطعاً صحیح ہیں غلط ہے۔

سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر بود ز راہ و رسم منزلہا

پیر اگر تمہیں کہے کہ سجادہ رنگ لو کوئی حرج نہیں، کیونکہ سالک منزل کے راستوں سے بے خبر ہوتا ہے۔ اس طرح کے خیالات مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گئے ہیں۔

تقلید شخصی اور صاحب تفسیر مظہری کی صراحت:

﴿ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾[آل عمران:٦٤] رب نہ بنا لو، رب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں حلال و حرام کا اختیار ہے، قاضی ثناء پانی پتی نے اس مقام پر لکھا ہے کہ اگر کسی امام کا قول حدیث کے خلاف آجائے تو اسے چھوڑ دینا چاہیے، ورنہ اس آیت کے تحت آجائیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب اصول میں تو مقلد تھے، فروع میں نہیں، خاص کر آج کل کے حنفیوں کی طرح نہیں تھے، محقق حنفی تھے، حدیث سے اچھی خاصی واقفیت رکھتے تھے، اچھے صوفی انسان تھے، شاہ ولی اللہ نے

انہیں بیہقی وقت کہا ہے، شاہ صاحب کے ہم عصر ہیں، ان کے شاگرد ہیں، مرزا مظہر جان جاناں ان کے پیرو مرشد ہیں، مجددی طریقہ کے پیرو ہیں، ان کی کتاب کا نام تفسیر مظہری ہے، اپنے مرشد کے نام پر مظہری نام رکھا تھا، قیم طریقہ احمدیہ کہتے ہیں کہ میں دیر تک بزرگوں کی خدمت میں رہا، خود میں نے بھی بڑا مجاہدہ کیا، اب مجھے معلوم ہوا کہ اب میں مرگیا ہوں، یعنی نفس اب مرا ہے، اب مجھے کوئی سلام کہے تو میں کہتا ہوں کہ میں مرگیا ہوں، اب مجھے سلام کیوں کرتے ہو؟ اس حالت تک پہنچ گئے، کہتے ہیں ان کا پیر مرگیا، مراقبہ میں بیٹھ گیا، کسی نے کہا مرنے کے بعد تم استفادہ نہیں کرسکتے، کسی اور کے پاس جاؤ زندہ سے استفادہ ہونا چاہیے۔

اہل دربار کا ردِعمل:

پھر ہرقل نے نبی ﷺ کا سارا مکتوب گرامی پڑھا، خط کے پڑھنے سے فارغ ہوا تو اس کے پاس شور وغل زیادہ ہوگیا، ابوسفیان کے ساتھی اس شور کو نہ سمجھ سکے کہ کیا ہے؟ کیونکہ وہ رومی زبان میں شور تھا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان رومیوں نے سمجھا کہ ہرقل سب باتوں کا ذکر کررہا ہے، کہیں مسلمان ہی نہ ہوگیا ہو، ہرقل غالباً یہ باتیں اس لئے سنا رہا تھا کہ ان کو تسلی ہوجائے یا یہ مقصد ہو کہ ان کا ردعمل دیکھا جائے کہ کس قسم کا مظاہرہ کرتے تھے؟ ابوسفیان کہتا ہے کہ پھر ہمیں دربار سے باہر نکال دیا گیا۔ ابوسفیان کہتا ہے:

”قد أمِر أمر ابن أبي كبشة“ ابن ابی کبشہ کا معاملہ تو بڑا عظیم ہوگیا، بادشاہ تک اس سے ہراساں اور خوف زدہ ہیں، ابوسفیان نے یہ تعجب کیا۔

حضور ﷺ کو ابن ابی کبشہ کیوں کہا؟

ابن ابی کبشہ اس لئے کہا کہ حضور ﷺ کی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ کے چچا کا نام ابوکبشہ تھا، اس نے اس کی طرف نسبت کردی، بعض کہتے ہیں کہ آپ ﷺ

کے ننھیال میں غیر معروف ابو کبشہ نامی لوگ گزرے ہیں، جب کسی کی مذمت کرنی ہو تو غامض آدمی کی طرف نسبت کر دیتے ہیں، یہ بھی کہتے ہیں کہ ابو کبشہ ایک آدمی تھا، جس نے شعریٰ کی عبادت شروع کی تھی، اس نے یہ سمجھا کہ بت کیا ہیں؟ شعریٰ بڑا روشن اور منور ہے، اس کی عبادت کرنی چاہیے، گویا وہ بت پرستی کی مخالفت کر کے لوگوں سے الگ ہوگیا، یہ شخص (محمد ﷺ) بھی اس کی طرح بت پرستی کی مذمت کرتا ہے، ایک خدا کی پوجا بتاتا ہے، اس طرح گویا یہ ابو کبشہ کا بیٹا ہے، اس کے نقش قدم پر چلتا ہے، جو روش بتوں کے بارے میں اس نے اختیار کی تھی، وہی یہ کر رہا ہے۔

ابوسفیان کا بیان:

" إنه يخافه ملك بني الأصفر" تحقیق شان یہ ہے کہ اس سے بنی اصفر کے بادشاہ خوف کھاتے ہیں۔

" إنه " میں ضمیر شان بھی ہوسکتی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مرجع نبی ﷺ ہوں، " فما زلت موقنا به " میں ہمیشہ سے یقین کرنے والا تھا، اس بات کا کہ عنقریب یہ غالب آجائیں گے۔

ابوسفیان کہتے ہیں: مجھے خیال پیدا ہوا کہ آج ان سے روم کے عظیم بادشاہ خوف زدہ ہیں، تو ان کا غلبہ ایک نہ ایک دن ضرور ہوگا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام میرے دل میں داخل کر دیا۔

قریش کی عہد شکنی اور ابوسفیان کا تجدید عہد:

صلح حدیبیہ کے بعد قریش نے عہد شکنی کر دی، عہد شکنی کے بعد انہیں خیال آیا کہ ایسا نہ ہو مسلمان حملہ کر دیں، اس لئے تجدید معاہدہ کے لیے ابوسفیان خود مدینہ گیا

اور پہلے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ملا، اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے استہزاء کیا کہ تم کو نیا معاہدہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم امیر آدمی ہو، کہہ دو میں نے عہد کر لیا اور چلے جاؤ، یہ لفظ بول کر وہ چلا گیا، واپس جا کر شیخی بگھارنے لگا کہ میں نے تمہارا عہد کر دیا، کافر کہنے لگے بیوقوف، علی نے تمہیں استہزاء کیا ہے، تم نہ ہمارے پاس جنگ لائے ہو اور نہ صلح ![1]

ابوسفیان کا قبول اسلام:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تیاری شروع کر دی اور تیاری اتنی خفیہ تھی کہ اہل مکہ کو اس کی خبر نہ پہنچے، لوگوں کے کہنے پر ابوسفیان دوبارہ نکلا، حکیم بن حزام ان کے ساتھ تھا، راستے میں پکڑے گئے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے انہیں تحفظ دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے، حضور نے فرمایا: " لا إله إلا الله " کا یقین ہے یا نہیں؟ کچھ تأمل کرنے لگا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: عمر رضی اللہ عنہ پیچھے ہے، جلدی سے کلمہ پڑھ لو، ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے، اس موقع پر انہوں نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گئے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "محمد رسول الله" بھی کہو، اس میں کچھ تردد کا اظہار کیا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ پشت پر کھڑا ہے، دیر نہ کرو، اس نے " محمد رسول الله" بھی پڑھ لیا، اس طرح زبردستی مسلمان ہوا، پھر آہستہ آہستہ اسلام اس کے قلب و ضمیر میں داخل ہو گیا۔[2]

ابوسفیان کی عزت افزائی:

ابوسفیان کی حوصلہ افزائی اور عزت افزائی کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا

---

[1] تاريخ الطبري (٢/ ١٥٤) السيرة لابن حبان (ص: ٣١٥)

[2] تاريخ الطبري (٢/ ١٥٧) شرح معاني الآثار (٣/ ٣١٩) السلسلة الصحيحة (٣٣٤١)

کہ جو ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے، اسے امن ہے، [1] ایک مرتبہ ابو سفیان بیٹھا کہہ رہا تھا، میں نے یہ کام ویسے ہی کر لیا، لوگوں کو جمع کر کے لڑائی کرنی چاہیے، نبی ﷺ پاس سے گزرے فرمایا: " إذا يخزيك الله " اللہ تجھے رسوا کرے گا اگر ایسا کرو گے، اس کے دل میں آ گیا کہ یہ بات بھی اس نے معلوم کر لی، پھر اسلام زیادہ اس کے دل میں جاگزیں ہو گیا، [2] پھر حکومت ہی ان کے خاندان میں آ گئی، شاہ عبدالعزیز نے لکھا ہے کہ جنگ احد میں کفار کو جو فتح ہوئی تھی، وہ اصل میں اسلام کی فتح تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ حکومت ابو سفیان کے گھر میں جانی ہے۔

ہرقل کے سوالات کی نوعیت:

جو حدیث گزری ہے، اس کے متعلق دو تین باتیں قابل ذکر ہیں:

۱۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ حافظ نے مازنی کا قول نقل کیا ہے کہ جن چیزوں کے متعلق ہرقل نے سوالات کیے تھے، ان تمام چیزوں کا ایک آدمی میں جمع ہو جانا، اس بات کی قطعی دلیل نہیں کہ وہ قطعی نبی ہے، [3] ہرقل نے ایسے سوالات آخر اٹھائے کیوں؟ اس نے یہ سوالات اس لئے کئے کہ اس خاص آنے والے نبی میں یہ یہ علامات اور نشانیاں ہوں گی، ایک خاص آنے والے نبی کے متعلق خاص امتیازی علامات کا اسے بذات خود علم تھا، اس وجہ سے اس نے سوالات کئے، تاکہ دوسروں کے سامنے بھی ان علامات کا اظہار ہو اور یہ لوگ بھی غور کریں یا اس لئے سوالات کئے کہ ایک سچے نبی کے لیے ان امتیازات و ممیزات کا ہونا لازمی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس میں یہ علامات ہوں وہ

---

[1] صحیح مسلم: كتاب الجهاد والسير، باب فتح مكة، رقم الحديث (١٧٨٠)

[2] تاريخ دمشق (٢٣/ ٤٥٨) الإصابة لابن حجر (٣/ ٤١٣)

[3] فتح الباري (١/ ٣٧)

نبی ہو، نبی کا سچا ہونا تو لازمی ہے، صادق العہد ہو، لیکن صادق العہد ہونے سے نبی نہیں بن جاتا۔

۲۔ دوسری چیز اس حدیث کا باب سے تعلق ہے، اس کے لیے چار چیزیں بیان کی گئی تھیں، پہلی چیز تو یہ کہ رسول کریم ﷺ مفتری نہیں، گویا یہ کلام نفسی نہیں اور نہ ان پر کوئی شیطان مسلط ہے، یہ واقعہ ان سب کی طرف اشارہ کرتا ہے، سابقہ سب پیشین گوئیاں حضور کریم علیہ السلام کے مفتری نہ ہونے پر منطبق ہوتی ہیں اور ہرقل خود بھی ان پیشین گوئیوں کے متعلق کہہ رہا ہے، کلام نفسی اس لئے نہیں کہ یہ مجنون آدمیوں کی بڑ ہوتی ہے، اس میں ایسا اثر کہاں کہ بادشاہ بھی لرزہ براندام ہوں اور خوف کھانے لگیں، کلام نفسی کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ان لوگوں کی پیروی کرنے والے بھی تقریباً فاتر العقل ہی ہوتے ہیں یا آریہ قسم کے لوگ، دانشمند اور عقلمند آدمی ان کا معتقد نہیں ہوسکتا۔

۳۔ اسی طرح شیطانی تسلط کا نہ ہونا بھی ظاہر ہے، شیطان کے تسلط سے دنیا پر اس قسم کا اثر مرتب نہیں ہوتا اور نہ پہلی پیشین گوئیوں کا اس پر انطباق ہوتا ہے، آپ نے جو مکتوب ارسال فرمایا تھا، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ کو یقین تھا کہ میں خالق کائنات مالک دو جہاں کا رسول ہوں، عام آدمی کو خط لکھنا کوئی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہوتا، بادشاہ کو خط ارسال کرنا نہایت ہی معنی خیز ہے۔

آپ کی بعثت، بعثت عامہ تھی:

اس زمانے میں دو ہی بڑے بادشاہ تھے، جس طرح آج دو سپر اور بڑی طاقتیں روس اور امریکہ ہیں، اسی طرح اس دور میں ایران اور روم کی سلطنتیں عظیم اور بڑی تھیں، ایرانی فرمانروا ''کسریٰ'' کے لقب سے مشہور تھا اور روم کا بادشاہ ''قیصر'' کہلاتا تھا، ان دونوں بڑی حکومتوں کے سربراہوں کو حضور ﷺ نے بڑے سخت الفاظ

میں مکتوب ارسال فرمائے: "أسلم تسلم" مسلمان ہو جاؤ، بچ جاؤ گے، ورنہ راہ نجات کی دوسری اور کوئی سبیل نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ کی بعثت عام تھی، مخصوص قوم، خاص علاقے اور متعین زمانے کے لیے نہیں تھی، صرف عرب قوم کے لیے نہیں تھی، بلکہ تمام دنیا کے تمام انسانوں کے لیے تھی، گویا آپ کی دعوت عالمگیر، ہمہ گیر اور جامع تھی۔

بعض لوگ بعض آیات سے استدلال کر کے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضور ﷺ کی بعثت صرف عرب قوم کے لیے اور ایک مخصوص دور کے لیے تھی، یہودی بھی یہ کہتے ہیں کہ آپ امیوں کے نبی ہیں، حالانکہ نہ یہ استدلال درست ہے اور نہ یہود کی بات صحیح ہے، یہودی آپ کی نبوت کا اقرار کرتے تھے، لیکن آخر میں یہ کہہ دیتے تھے کہ امیوں کے لیے ہے، ابن صیاد نے بھی جب آپ نے اس سے پوچھا تھا کہ تو مانتا ہے کہ میں نبی ہوں؟ اس نے "أنت نبي الأميين" کہا تھا،[1] اس کا مطلب یہ تھا کہ اہل کتاب کے لیے نہیں، ابن صیاد یہودی تھا۔

یہودی انبیاء کے حالات اچھی طرح جانتے تھے، اسی بنا پر انہیں علم تھا کہ آپ نبی ہیں، بخت نصر نے جب یہودیوں کا قلع قمع کیا تو بچے کھچے کچھ یہودی مدینے کے گرد و نواح میں آ کر آباد ہوگئے تھے، یہاں آ کر انہوں نے مالی لحاظ سے اپنی چودھراہٹ قائم کر لی تھی اور یہاں تک دعویٰ کرنے لگے تھے کہ ہم جدی پشتی یہاں آباد ہیں، ریشہ دوانیوں کی وجہ سے بااثر لوگ بن گئے تھے۔

قرآن مجید کی بے شمار آیات سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت عام تھی، ارشاد باری ہے:

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الجنائز، باب إذا أسلم الصبي......، رقم الحديث (١٢٨٩)
صحيح مسلم: كتاب الفتن وأشراط الساعة، باب ذكر ابن صياد، رقم الحديث (٢٩٣٠)

﴿ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ﴾ [آل عمران: ٢٠]

''اور ان لوگوں سے جنھیں کتاب دی گئی ہے اور ان پڑھ لوگوں سے کہہ دے کیا تم تابع ہوگئے، پس اگر وہ تابع ہو جائیں تو بے شک ہدایت پا گئے۔''

آل عمران میں نصاریٰ کو خطاب ہے:

﴿ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ ﴾ [آل عمران: ٣١، ٣٢]

''اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھیں تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے، کہہ دے اللہ اور رسول کا حکم مانو، پھر اگر وہ منہ پھیر لیں، تو بے شک اللہ کافروں سے محبت نہیں رکھتا۔''

مسیح علیہ السلام کے متعلق خاص طور پر مباہلہ رکھوا دیا تھا:

﴿ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِیْنَ ﴾ [آل عمران: ٦١]

''آؤ! ہم اپنے بیٹوں اور تمھارے بیٹوں کو بلا لیں اور اپنی عورتوں اور تمھاری عورتوں کو بھی اور اپنے آپ کو اور تمھیں بھی، پھر گڑ گڑا کر دعا کریں، پس جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔''

یہ اور اس طرح کی دوسری آیات سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت اور دعوت عام تھی، محض عربوں کے لیے نہیں تھی:

﴿ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ﴾ [هود: ١٧]

جو گروہ (خواہ کوئی ہو) انکار (کسی قسم کا انکار ہو) کرے گا، جہنم میں جائے گا۔

لفظ ''صاحب'' کی تشریح:

امام زہری نے یہ حدیث ابن ناطور سے نقل کی ہے، سند پہلی ہی ہے، معلق نہیں، ناطور اسے کہتے ہیں، جو زراعت پر نگران اور محافظ ہو، یہ صاحب محکمہ زراعت کے نگران تھے۔

''صاحب ایلیاء''، ایلیاء کا گورنر، یہ ہرقل کا بھی صاحب تھا، گویا صاحب کے لفظ کا استعمال دو معنی میں ہوا، ایک والی کے معنی میں، جیسا کہ صاحب ایلیا کی طرف نسبت ہوئی، دوسرا دوست کے معنی میں، حنفیہ کے خیال میں امام شافعی کا قول ہے کہ ایک لفظ کا استعمال دو معنوں میں جائز ہے، بعض اسے جائز نہیں سمجھتے، صاحب کا لفظ مشترک معنوی ہے، صاحب کے معنی ''والا'' کریں، تو معنی یہ ہوا: ایلیا، ہرقل والا، لیکن ''والا'' کے معنی نہیں، والی کے معنی زیادہ موزوں اور مناسب ہیں، اس صورت کے لحاظ سے ایلیا کی طرف نسبت ہے، دوست اور صدیق کے معنی کے لحاظ سے نسبت ہرقل کی طرف زیادہ موزوں اور انسب ہے۔

الفاظ حدیث سے لغوی استدلال:

بعض نے ایک اور جواب دیا ہے، انہوں نے کہا ہے ان احادیث سے لغوی طور پر استدلال کرنا درست نہیں یا اصول فقہ کے قواعد پر استدلال کرنا درست نہیں، اس واسطے کہ روایت بالمعنی عام ہے، ہوسکتا ہے کہ کسی راوی نے یہ کہہ دیا ہو، حالانکہ نبی ﷺ کا تو پہلے ہی قول نہیں ہے، یہ وہم پڑ گیا ہے کہ شاید یہ حدیث ہے، حالانکہ زہری تو خود کہہ رہے ہیں کہ یہ ابن ناطور کا قول ہے، روایت سے جو استدلال کرتے ہیں، وہ تو نبی ﷺ کے الفاظ کے متعلق قصہ ہے، ابن مالک وغیرہ کا خیال یہی ہے کہ

حدیث کے الفاظ نبی ﷺ کے ہیں، ان سے قواعد نحو پر استدلال کرنا درست ہے، اگر آپ کے الفاظ نہ ہوں پھر تو یہ ہوسکتا ہے، زہری کے الفاظ ہوں، زہری کبار تابعین میں سے ہیں، ان کا قول تو کسی کے نزدیک دلیل اور حجت نہیں ہوسکتا۔

ابن ناطور مذہبی لحاظ سے اسقف اور بڑا پادری تھا اور سیاسی لحاظ سے ایلیا کا گورنر تھا۔

ابن ناطور کی روایت:

وہ مسلمان ہونے کے بعد حدیث سنا رہا ہے یعنی ابن ناطور، اس سے عبدالملک کے زمانۂ خلافت میں زہری کی ملاقات ہوئی، وہ اس حدیث کو بیان کرتا ہے کہ ہرقل جب ایلیا میں آیا تھا، صبح سویرے اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا، خبیث النفس معلوم ہوتا تھا، دل پریشان اور اڑا ہوا تھا، اس کے گرد اس کے وزراء اور بطارقہ تھے، ان میں سے کسی نے اس سے پوچھا کیا معاملہ ہے؟ آپ کی حالت آج کچھ غیر اور اوپری معلوم ہو رہی ہے، ابن ناطور کا خیال ہے کہ ہرقل کاہن تھا، اس کی کہانت کا تعلق ہوسکتا ہے کہ نجوم کی کہانت سے ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شیطانوں کی کہانت سے ہو، نجوم میں تو یہ خود بڑا ماہر تھا، اس وجہ سے نجومی کہانت کا تو لازمی اثر تھا، کیونکہ اس کا اپنا بیان ہے کہ اس نے نجوم میں نظر کی اور دیکھا کہ ختنہ کا بادشاہ ظہور پذیر ہو چکا ہے، اس وقت صبح نمودار ہو چکی تھی، ادھر خیبر پر اسلامی لشکر فتح پا چکا تھا، ادھر اس کو حضور ﷺ کا مکتوب گرامی ملا، حدیبیہ کی صلح ذی قعدہ میں ہوئی تھی، اس کے بعد آپ نے یہ خط لکھا تھا، محرم میں خیبر فتح ہوگیا تھا۔

علم نجوم کی شرعی حیثیت:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی تحقیق بھی کی ہے کہ علم نجوم میں کیا چیز تھی، جس

کی وجہ سے ہرقل نے یہ کہا؟ علم نجوم کے بارے میں علماء کا خیال تو یہ ہے کہ نجومیوں کی باتیں فضول ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں، شاہ ولی اللہ کا خیال ہے کہ اس کی کچھ حقیقت ہے، مگر شریعت اسلامیہ نے اس سے روک دیا ہے، اس لئے کچھ فائدہ نہیں، سوائے تضییع اوقات کے کچھ حاصل نہیں، ابن تیمیہ اور ابن قیم دونوں کا خیال ہے کہ بے معنی، بے حقیقت اور فضول باتیں ہیں، ابن قیم نے علم نجوم کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی ہے، جس میں بطلیموس سے لے کر اپنے زمانے تک کے نجومیوں کی پیشین گوئیوں پر بحث کی ہے، ان میں سے اکثر جھوٹی ثابت ہوئی ہیں، اتفاقاً کچھ سچی بھی ہوگئی ہیں۔

ایک کاہن کا واقعہ یوں ہے کہ ایک کاہن آیا، اس وقت نجومیوں کو بلایا گیا، نجومی آگئے، ان سے کہا گیا کہ ہم نے قاہرہ کی بنیاد رکھنی ہے، تم دیکھو کہ کوئی ستارہ ایسا ہے کہ بنیاد رکھنا مناسب ہو، انہوں نے کہا ہاں ایسا ستارہ ہے بنیاد رکھ دیں، کافی مدت تک اس میں کسی قسم کا تغیر نہ آیا، لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ نجومیوں نے ٹھیک کہا تھا، اس کے بعد اس عمارت میں تغیر بھی آ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی باتیں ایسی ہی ہوتی ہیں، بعض لوگ بیت اللہ کے متعلق بھی اس طرح کی باتیں کرتے ہیں کہ اس وقت کوئی ستارا اوج پر ہوگا، قران ہوگا، اس وقت اس کی بنیاد رکھی گئی ہوگی۔

ستاروں کی تاثیر:

ستاروں کا سعادت اور نحوست کے ساتھ تو کوئی تعلق نہیں، بس اس طرح کا تعلق ضرور ہے، جس طرح سورج کا تعلق لیل و نہار کے ساتھ ہے، یا شتا و صیف (گرمی و سردی) کے ساتھ ہے، یعنی موسم گرما آجاتا ہے، اور موسم سرما آجاتا ہے، یا جیسے چاند کا تعلق سمندر کے مدو جزر اور جوار بھاٹے سے ہے، اسی بناء پر طبیب حضرات

کہتے ہیں کہ فلاں وقت فصد کرنا چاہیے اور فلاں وقت نہیں کرنا چاہیے، حدیثوں میں بھی بعض جگہ آیا ہے اس قسم کے اثرات تو ہیں، لیکن " من غرس في نجم كذا كان كذا " قسم کے سعادت ونحوست کے اثرات نہیں ہیں۔

" ما من نجم إلا ولد فيه الطويل والقصير واللميم وحسن الصورة " یہ سب باتیں لایعنی اور لغو ہیں۔

اگر یہ بات تسلیم کی جائے تو اس کا کیا جواب ہے کہ ایک ہی متعین وقت میں بے شمار انسان اس دنیائے فانی میں جنم لیتے ہیں، ان کے حالات وکیفیات طبائع ایک دوسرے سے نہیں ملتے، اگر نجوم کا مسئلہ صحیح ہو تو پھر ایک ہی وقت میں پیدا ہونے والوں کے حالات یکساں ہونے چاہئیں، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں ایسا نہیں ہے۔

فارابی کی تحقیق:

فارابی علم نجوم میں بڑا ماہر ہے، وہ بھی کہتا ہے کہ ان کے جو حروف حارہ اور باردہ ہیں، اگر حروف باردہ کو حارہ اور حارہ کو باردہ بنا دیا جائے، تو نتیجہ وہی برآمد ہوگا، جو ردو بدل نہ کرنے کی صورت میں نکلنا تھا، یعنی کبھی غلط اور کبھی صحیح، نجومی خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم سے جو غلطی ہو جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے حساب پورا نہیں لگایا ہوتا، اس سے بجز اس کے کیا نتیجہ نکالیں کہ ان کی باتیں بے حقیقت ہوتی ہیں۔

امام بخاری کا مقصد:

امام بخاری کا اس حدیث کو لانے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ہرقل کاہن تھا، کاہنوں کا تعلق شیاطین کے ساتھ ہوتا ہے، شیاطین اس وقت رک گئے، جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی، وہ تو ایک نفس الامری بات تھی۔

دوسری کہانتِ نجوم، جو ہرقل کہہ رہا ہے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر محق ومبطل کی طرف سے آنحضرت ﷺ کی نبوت کا اعلان ہوا ہے، یہ بیان کرنا نہیں چاہتے کہ حق ہے یا باطل ہے، محقین ومبطلین سب لوگوں کو یقین ہوگیا کہ آپ واقعی نبی ہیں، امام بخاری اس کے قائل ہیں کہ نجوم کی باتیں صحیح نہیں، اور نہ یہ رسول کریم ﷺ کا فرمان ہی ہے، وہ تو ابن ناطور الگ ایک واقعہ بیان کر رہا کہ کہانت اور نجوم کے دیکھنے سے بھی اسے یہ بات معلوم ہوئی، یہ تو ابن ناطور کا ایک مقصد بیان کر رہا ہے۔

منجمین کے حساب کے ساتھ جس چیز کی اس کو اطلاع ہوئی تھی وہ یہ ہے، نجومی تو اٹکل پچو باتیں کہتے ہیں:

"إنهم زعموا أن المولد النبوي كان بقران العلويين ببرج العقرب "[1]

برج عقرب میں جب دونوں علویین (زحل اور مریخ) اکٹھے ہوگئے، تو آپ پیدا ہوئے، چونکہ وہ مائی برج ہے، اس میں دونوں کا جمع ہونا، عربوں کی مختون قوم کی طرف اشارہ ہے، یہ بھی کہتے ہیں: " وهما يقترنان في كل عشرين سنة " بیس سال بعد ان کا باہمی اقتران ہوتا ہے، " إلى أن تستوفى المثلثة بروجها في ستين سنة " تمام برجوں میں ساٹھ سال لگ جاتے ہیں، ابتداء عشرین جو اول تھا اس قران میں آپ کی ولادت ہوئی، جب دوسری عشرین پوری ہوئی، تو جبریل وحی لے کر آئے، دوسری کے اختتام پر گویا چالیس سال پورے ہوگئے اور جب تیسری ختم ہوئی تو اس وقت خیبر فتح ہوا، عمرہ قضا ہوا، جو فتح مکہ کو کھینچ کر لایا:

" وفي تلك الأيام رأى هرقل ما رأى ومن جملة ما ذكروه أيضا أن برج العقرب مائي وهو دليل ملك القوم الذين يختنون "

---

[1] فتح الباري (١/ ٤١)

حافظ نے ذکر کیا ہے:

"فكان ذلك دليلا على انتقال الملك الى العرب، وأما اليهود فليسوا مرادا هنا، لأن هذا لمن ينقل إليه الملك لا لمن انقضیٰ ملكه"

ان کا ملک تو ختم ہو چکا تھا، حافظ صاحب مزید لکھتے ہیں:

"فإن قيل: كيف ساغ للبخاري إيراد هذ الخبر المشعر بتقوية أم المنجمين؟"

بخاری نے اسے ذکر کیوں کیا ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منجمین کی باتیں ٹھیک ہیں۔

" فالجواب أنه لم يقصد ذلك، بل قصد أن الإشارات بالنبي ﷺ جاء ت من كل طريق، وعلى لسان كل فريق ، من كاهن أو منجم، محق أو مبطل ، إنسي أو جني، وهذا من أبدع ما يشير إليه عالم أو يجنح إليه محتج "[1]

شاہ ولی اللہ کی تصریح:

پہلے بتایا گیا ہے کہ شاہ ولی اللہ کا خیال اس طرف ہے کہ اس کی کچھ حقیقت ہے، شریعت نے اس واسطے منع نہیں کیا کہ اس کی حقیقت کچھ نہیں ہے، بلکہ شریعت نے مصلحت کے پیش نظر روکا ہے، جیسا کہ مثلاً ایک شخص سے نبی ﷺ نے فرمایا تھا کہ کاہن کچھ نہیں ہے، اس شخص نے کہا حضور والا! جو بات کرتے ہیں وہ ٹھیک ہوتی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی وہ ملائکہ سے وہ بات اخذ کر لیتے ہیں، جو بات ملائکہ سے اخذ کی ہوتی ہے، صرف اتنی صحیح ہوتی ہے، اس میں سو

---

[1] فتح الباري (١/ ٤١)

جھوٹ اپنی جانب سے ساتھ ملا دیتے ہیں،[1] گویا سو میں سے ان کی ایک بات صحیح بھی ہوتی ہے، شیاطین ملائکہ سے کچھ سن گن کر لیتے ہیں، کیونکہ ان کی جنس ایک ہی ہے، ملائکہ کے دماغ کو شیاطین پڑھ لیتے ہیں، کیونکہ یہ بھی لطیف ہوتے ہیں، یہ جنات تو ہمارے دماغ بھی پڑھ لیتے ہیں، صوفی بھی دماغ پڑھ لیتے ہیں، ان کا دل صاف ہوتا ہے، وہ چیز دل میں منعکس ہوجاتی ہے، جنوں کے پڑھنے کا طریقہ اور ہوگا، ویسے وہ بھی دماغی باتیں پڑھ لیتے ہیں، اسی طرح فرشتوں سے بھی کچھ نہ کچھ لطیف ہونے کی وجہ سے اخذ کر لیتے ہیں، جنوں پر زیادہ تر ہندو ہی اعتماد رکھتے ہیں، لیکن صحیح بات وہی ہے جو ابن تیمیہ اور ابن قیم نے کہی ہے کہ بالکل لغو اور فضول بات ہے، ان کی حقیقت کچھ نہیں "المنجم كاهن والكاهن، ساحر، والساحر كافر" حدیث میں تو یہ آیا ہے۔

سحر کی حقیقت:

سحر کی حقیقت تو ہے، سحر کے ساتھ کسی کو قتل بھی کر دیتے ہیں، اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ ساحر سے قصاص لیا جائے گا یا نہیں؟ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر وہ شخص یہ کہے کہ میرا سحر عام طور پر قتل کر دیتا ہے، تو ایسے شخص سے قصاص لینا چاہیے، کبھی مر جاتا ہے اور کبھی نہیں مرتا، تو اس صورت میں وہ قتل شبہ عمد کی صورت ہوجائے گی، اس صورت میں اس سے دیت لی جائے گی۔

قرآن نے اس کی حقیقت کے باوجود کہہ دیا ہے:

﴿ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ [البقرہ: ١٠٢]

''اور اس کے ساتھ ہرگز کسی کو نقصان پہنچانے والے نہ تھے، مگر اللہ کے

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الأدب، باب قول الرجل ليس بشيء وهو ينوي أنه ليس بحق، رقم الحديث (٥٨٥٩) صحيح مسلم: كتاب السلام، باب تحريم الكهانة وإتيان الكهان، رقم الحديث (٢٢٢٨)

اذن کے ساتھ۔"

بعض وقت ایک چیز کی حقیقت ہوتی ہے، مگر شریعت اسے فضول سمجھ کر روک دیتی ہے، کیونکہ اس کا برا اثر پڑتا ہے، جیسا کہ آج کل علماء وعظ کرتے ہیں، بہت سی چیزوں کا انکار کر دیتے ہیں، تا کہ لوگوں کے عقائد نہ بگڑ جائیں۔

ملک ختان کا ظہور:

ہرقل نے کہا کہ ملک ختان ظاہر ہو چکا ہے، ہرقل نے دریافت کیا کہ اس زمانے میں ختنہ کون کرتا ہے؟ اس نے کہا یہودی کرتے ہیں اور تو کوئی نہیں کرتا، اس نے کہا کہ یہودی ہمارے ہاں قلیل تعداد میں ہیں، فرمان جاری کر دو کہ ملک میں جہاں کہیں یہودی نظر آئے، قتل کر دیا جائے، اس طرح باہمی مشورے کر رہے تھے کہ ہرقل کے سامنے ایک آدمی لایا گیا، جسے ملک غسان نے بھیجا تھا، جو رسول اللہ ﷺ کے متعلق خبر دیتا تھا، یہ واقعہ آپ کے مکتوب گرامی کے پہنچنے سے پہلے کا ہے، جب اس نے خبر دی تو درباریوں سے کہا کہ جاؤ دیکھو مختون ہے یا نہیں؟ انہوں نے جا کر دیکھا تو مختون پایا، اس سے پوچھا کہ کیا عرب ختنہ کرتے ہیں؟ اس نے کہا ہاں کرتے ہیں، اب ہرقل کو یقین ہوگیا کہ اس امت کا بادشاہ یہی ہے، یعنی اب نبی ﷺ کی حکومت ہوگی۔

اس کے بعد ہرقل نے رومیہ میں اپنے ایک ساتھی کو لکھا، یہ شخص علم و معرفت میں ہرقل کا ہم پلہ تھا، ہرقل یہ خط لکھ کر حمص چلا گیا، زہری نے یہاں نبی ﷺ کے خط کا ذکر چھوڑ دیا ہے، کیونکہ پہلے ابوسفیان کے واقعہ میں اس کا ذکر آچکا ہے، ہرقل حمص کی طرف شائد اس لئے چلا گیا کہ اس کا ارادہ آگے قسطنطنیہ وغیرہ کی طرف جانے کا ہوگا، وہ اس انتظار میں رہا کہ اس کے دوست کا جوابی خط موصول ہو جائے، بعض نے

اس کے دوست کا نام ضغاطر بتایا ہے، جب اس کے پاس ہرقل کا خط پہنچا تو اس نے کہا کہ واقعی وہ نبی ہے، اس نے عیسائیوں کا لباس اتار دیا اور دوسرے کپڑے زیب تن کر لیے اور کلمہ شہادت " أشهد أن لا إله إلا الله، وأشهد أن محمدا رسول الله " پڑھ لیا، رومیوں کو جب اس کے مسلمان ہونے کا علم ہوا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور قتل کی وجہ یہ بتائی کہ اس نے اپنا مذہب چھوڑ دیا ہے اور واجب القتل ہو گیا، قتل ہونے سے پہلے اس نے ہرقل کے خط کا جواب بھیج دیا تھا، جب عمل کا وقت آیا، تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

بعض کا خیال ہے کہ ایلیا ہی میں ہرقل کو اس کے قتل کی خبر پہنچ گئی تھی، ایک اور شخص رومیہ میں قیام پذیر تھا، اسے بھی ہرقل نے خط لکھا تھا، اس کا جواب حمص میں موصول ہوا، ضغاطر جو مذہبی پیشوا تھا، بڑا اثر و رسوخ والا تھا، اس کے قتل سے ہرقل نے اندازہ لگایا کہ جب ایسے بااثر مذہبی پیشوا کو قتل کرنے میں ذرا تاویل اور پس و پیش نہیں کیا گیا، تو میری حیثیت ہی کیا ہے؟ اگر میں نے ایسا اقدام کیا، تو مجھے بھی فوراً قتل کر دیا جائے گا۔

ہرقل کا خطاب:

ہرقل کے صاحب کی جانب سے خط موصول ہوا، اس کا جواب ہرقل کی رائے کے موافق تھا، اس میں لکھا تھا کہ نبی ﷺ پیدا ہو چکے ہیں یا یہ لکھا تھا کہ آپ نبی ہیں، حمص میں انہوں نے ایک اسپیشل ہال بنایا ہوا تھا، اس میں ہرقل نے عظمائے روم کو مدعو کیا، یہ لوگ آ گئے اور ہرقل کی اجازت سے ہال میں داخل ہوئے اور حکم دے دیا کہ تمام دروازے بند کر دیئے جائیں، تعمیل حکم میں سب دروازے بند کر دیئے گئے اور ہرقل خود اوپر کی گیلری میں چڑھ گیا، جو محفوظ مکان تما تھی، وہیں سے اس نے نیچے

جھانک کر یہ الفاظ کہے، شاید اسے بھی قتل کا اندیشہ اور ڈر رہا ہے:

اے جماعت روم! کیا تمہارے لیے فلاح اور بھلائی ہے؟ یعنی کامیاب و کامران ہونا چاہتے ہو، اگر تمہیں اس نعمت کی ضرورت ہے، تو اس نبی کی اطاعت کرو، اگر اپنی اور اپنے ملک اور اپنے ابناء ملک و قوم کی رشد و ہدایت اور فلاح و بہبود مطلوب ہے، تو اس نبی کی وقت ضائع کئے بغیر بیعت کرلو۔

ہرقل کی یہ بات سن کو سب لوگ وحشی گدھوں کی طرح متنفر ہو کر دروازوں کی جانب بھاگے، دروازے احتیاطی مصلحت کے پیش نظر پہلے ہی بند کر دیئے گئے تھے، اگر دروازے کھلے ہوتے تو ضرور بغاوت رونما ہو جاتی، لیکن راہ فرار مسدود پا کر واپس ہال میں آنے پر مجبور ہوگئے، یہ ہرقل کی حکمت عملی تھی، ورنہ مخالفت اور بغاوت کا طوفان کھڑا ہو جاتا۔

ہرقل نے جب ان کی نفرت کی اس قدر شدت دیکھی، تو ان کے ایمان سے مایوس ہوگیا پھر اس نے حکم دیا کہ انہیں واپس لاؤ، وہ واپس ہال میں جمع ہوگئے، تو ہرقل نے اس طرح خطاب کیا:

میں نے تمہارے ایمان کا امتحان لیا تھا کہ تم لوگ اپنے ایمان میں کتنے پکے ہو اور تمہارے ایمان میں کتنی پختگی ہے؟ جب ہرقل نے یہ بات کہی تو ان کا ہیجان اور جوش ذرا سرد پڑ گیا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ تو ہمارے موافق ہی ہے، لہٰذا پھر اس کے تابع ہوگئے، یہاں " سجدوا " کا لفظ آیا ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ تابع فرمان ہوگئے، ورنہ اصطلاحی معنی میں تو سجدہ کرنا منع ہے، اس لئے یہاں اصطلاحی معنی مراد نہیں ہیں، تورات میں بھی اس کی ممانعت ہے۔

شیطان اور حضرت عیسیٰ میں مکالمہ:

انجیل میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ شیطان حضرت مسیح علیہ السلام کو بہت اونچے پہاڑ پر

لے گیا اور کہنے لگا دیکھو سارا جہاں کیسا خوش منظر نظر آ رہا ہے، تم مجھے سجدہ کرو سارا جہاں تمہارے حوالے کر دوں گا، مسیح علیہ السلام نے کہا تم شیطان معلوم ہوتے ہو، کیونکہ تورات میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ مت کرو، پھر شیطان کہنے لگا اچھا وہاں لکھا ہے کہ میں اپنے بندے کی حفاظت کروں گا، یہاں سے ذرا نیچے گر کر دیکھو، خدا تمہاری حفاظت کس طرح کرتا ہے اور کرتا بھی ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا وہاں یہ بھی تو لکھا ہے کہ خدا کا امتحان مت لے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ سے اتباع مراد ہوگا، اگر ہرقل انجیل پر عامل تھا اور اگر وہ مسیح علیہ السلام کو خدا ہی سمجھتا تھا، جیسا کہ عیسائی مسیح علیہ السلام کو سمجھتے ہیں اور خدا کو سجدہ جائز ہے، لہٰذا مسیح علیہ السلام کو سجدہ جائز ہے، حالانکہ ایک شخص مسیح علیہ السلام کے پاس آیا تھا، اس نے ان کو سجدہ کیا، مسیح علیہ السلام نے کہا تم مجھے سجدہ کیوں کرتے ہو؟ سجدہ تو صرف ایک اللہ تعالیٰ کو کرنا جائز ہے۔

ایک دفعہ عیسائیوں سے مناظرہ ہوا، پادری عبدالحق نے اس سجدہ کا جواب یہ دیا کہ مسیح نے اس شخص کو یہ کہا تھا کہ تم جب مجھے خدا نہیں مانتے تو سجدہ کیوں کرتے ہو؟ پہلے خدا مانو پھر سجدہ کرو، یہ تو احمقانہ تاویل ہے، تاویل تو ہر چیز کی ہوسکتی ہے۔

" فسجدوا له " پھر انہوں نے سجدہ کیا اور راضی بھی ہوگئے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہرقل صحیح طور پر نہ مانتا ہو، جیسا کہ بادشاہ ہوتے ہیں اور سجدہ کرواتے ہیں، کئی مسلمان بادشاہ بھی ایسے گزرے ہیں، جو سجدہ کرواتے تھے۔

ہرقل کا انجام:

" فکان ذلك آخر شأن هرقل " کہتا ہے کہ یہ ہرقل کا آخری حال تھا، یعنی ملک پر طمع کر لیا اور مسلمان نہ ہوا، بعض کہتے ہیں کہ مسلمان ہوگیا تھا، اگر اسلام کی حقیقت صرف قلبی تصدیق ہی ہے، پھر تو اسے مسلمان ہونا چاہیے، پھر اقرار بھی ساتھ

ہے، آپ کا وہ احترام بھی کرتا ہے، زبان سے بھی "إنه نبيٌ" کہہ رہا ہے اور یہ بھی کہہ رہا ہے کہ اس امت کا بادشاہ ظاہر ہوگیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آپ کو نبی بھی مانتا ہے، دل میں تصدیق اور طبیعت میں احترام بھی ہے، مگر حکومت اور ملک کے لالچ اور طمع کی خاطر اسلام میں داخل نہیں ہوا، گویا اسلام میں داخل ہونا الگ چیز ہے، اسلام کو صحیح سمجھنا اور اس کی صحت کا اقرار کرنا ان دونوں سے اسلام میں داخل نہیں ہوتا، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ آج کل ایک تحریک چل رہی ہے، ایک آدمی زبان سے کہتا ہے کہ یہ تحریک بالکل صحیح ہے، دل سے مانتا بھی ہے کہ تحریک صحیح ہے، مگر اتنا ماننے اور اتنا کہنے سے تحریک میں داخل تو نہیں ہوجاتا اور نہ کوئی اسے تحریک کا فرد تسلیم کرتا ہے، تحریک میں داخل ہونے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت ہے اور وہ ہے کہ اس تحریک کے منشور، طریق کار کو صحیح سمجھ کر عملاً اس میں حصہ لے اور ان خطوط پر حصہ لے جو قائدین تحریک یا ان کا نمائندہ جس طرح بتائے، بصورت اول تحریک کا رکن متصور نہیں ہوگا۔

اسلام کی امتیازی علامت:

اسلام و ایمان کی امتیازی علامت کے تعین میں اختلاف پڑ گیا ہے، محدثین کہتے ہیں، وہ عمل ہے، متابعت ہے، اس لئے عمل و متابعت ناگزیر ہے، اس کے بغیر مسلمان نہیں ہوسکتا، ورنہ ہرقل کو مسلمان ہوجانا چاہیے تھا، اسی طرح ابو طالب بھی مانتا ہے کہ یہ دین تمام ادیان سے بہتر ہے، کہتا ہے:

لولا الملامة أو حذار مسبة
لوجدتني سمحا بذاك مبينا

پھر تو ابو طالب بھی مسلمان متصور ہونا چاہیے!

حافظ نے لکھا ہے کہ جنگ تبوک میں بھی یہی ہرقل تھا، جو حضور ﷺ کے مقابلے میں فوجیں لے کر آیا تھا، آپ نے اسے لکھا کہ مسلمان ہو جاؤ، اس نے کہا میں

مسلمان ہوں، آپ نے فرمایا جھوٹ بولتا ہے، نصرانیت پر ہے، اس کا سفیر رسالت مآب کی جناب میں آیا تھا، آپ نے فرمایا تھا کہ جو خط میں نے لکھا ہے اگر وہ تمہارے پاس رہے گا، تو تمہارے ساتھ کوئی لڑائی نہ کر سکے گا، دوسری اقوام پر تمہارا غلبہ ہوگا۔

آپ کے مکتوب سے محدثین کے کام کی اہمیت واضح ہوتی ہے:

اب اس مکتوب گرامی کی نقل شائع ہوچکی ہے، اس کے الفاظ بخاری سے ملتے جلتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محدثین نے حدیث کی خاطر کتنی کوشش کی ہے، سند کے ذریعہ سے جو باتیں انہوں نے نقل کی ہیں، خط میں بعینہ وہی پائی گئی ہیں۔

دو یہودیوں کا قصہ:

دو یہودیوں کا قصہ بھی اسی طرح ہے کہ وہ آپ کے پاس آئے اور انہوں نے آیات بینات کے متعلق سوال کیا، آپ نے اس کا جواب دیا۔ انہوں نے کہا: "نشهد أنك نبيّ" آپ نے فرمایا: "فما يمنعكما أن تسلما" [1] پھر مسلمان ہونے میں کیا رکاوٹ کیا ہے؟ محض اقرار سے ان کو مسلمان قرار نہیں دیا، یہ اقرار تو اور یہودی بھی کرتے ہیں، ان کی معرفت کا قرآن نے ذکر کیا ہے:

﴿ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ ﴾ اس کے باوصف اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔

﴿ فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾
[البقره : ٨٩]

کفر بھی ہے اور معرفت بھی ہے۔

حدیث کی مناسبت:

ہرقل کی حدیث گویا برزخی حدیث ہے، مطلب یہ ہے اس کا تعلق کتاب

[1] سنن الترمذي: كتاب التفسير، باب من سورة بني إسرائيل (٣١٤٤)

الایمان سے بھی ہے اور وحی کے ساتھ بھی اور "آخر ما" کا لفظ لاکر بخاری نے اشارہ بھی کر دیا بدأ الوحی کو یہاں عقلاً شامل ہے۔

عمل ہی اصل مقصود ہے:

بہر حال معلوم یہ ہوا کہ اصل چیز عمل ہے، جس سے مسلمان ہونے کا واضح ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ تحریک کی مثال سے واضح کیا گیا ہے، ایک دوسری مثال سے بھی اس کی وضاحت ہوجاتی ہے، مثلاً ایک شخص کہتا ہے، بنفشہ بڑا ملین ہے، محض اتنا کہنے سے تو تلیین نہیں ہوجاتی، جب تک اسے استعمال نہیں کرے گا، اسی لئے محدثین نے عمل کو اصل چیز قرار دیا ہے اور دوسرے لوگوں نے التزام کہا ہے، امام احمد بن حنبل نے "انقیاد للمتابعة" کا نام ایمان رکھا ہے، انقیاد اصل میں عمل ہی کا نام ہے، عمل ہوگا تو انقیاد ہوگا، ورنہ انقیاد کے کیا معنی؟

ایمان کی بحث:

آج کل اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کا جملہ زبان زد عام ہے، امام ابو حنیفہ کا مذہب معروف تھا، لوگوں میں عام طور پر اسی کا چرچا ہے، اسی لیے عوام یہ کہہ دیتے ہیں، چھوٹی چھوٹی سی کتابیں جو لکھی جاتی ہیں، یہ سب ان کی ترجمانی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اہل سنت کی ترجمانی کس طرح ہوتی ہے؟ ائمہ اہل سنت بہت ہیں، مثلاً امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل، امام مالک اور سفیان ثوری رحمہم اللہ وغیرہ، ان کا مذہب یہ ہے کہ قول و عمل کا نام ایمان ہے، جیسا کہ امام بخاری کہتے ہیں، اسی لیے ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ لوگوں نے امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی ہے، اس مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے صحابہ، تابعین کے متفقہ مسئلہ میں ایک نئی بات کہی ہے کہ ایمان دراصل تصدیق بالقلب یا تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان

دونوں کا نام ہے، ان کے دو قول ہیں، جو محققین ہیں وہ کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کا قول صرف تصدیق بالقلب ہے، امام ابو حنیفہ کا مشہور مذہب یہی ہے اقرار کو تصدیق کی طرح نہیں سمجھتے۔ کبھی کبھی اکراہ کی شکل میں ساقط بھی ہو جاتا ہے، اصل تصدیق ہی باقی رہ جاتی ہے، خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ تصدیق کے ہوتے ہوئے بھی انسان مسلمان نہیں ہوتا، جب تک اس مذہب میں داخل نہ ہو، داخلہ بھی ضروری ہے۔

زیر طبع کتب:

التعليقات

على

المشكاة

للإمام المحدث الحافظ محمد الكوندلوى

مقالات وفتاویٰ

تالیف

محدث العصر حضرت حافظ گوندلوی رحمہ اللہ

دفاع صحیح بخاری

(صحیح بخاری کے دفاع میں لکھے گئے سات رسائل کا مجموعہ)

تالیف

شیخ الاسلام مولانا ابو القاسم سیف بنارسی رحمہ اللہ

مجموعہ رسائل

تالیف

حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ

إقامة الحجة

على

من أوجب الزيارة مثل الحجة

تاليف

محدث العصر مولانا بشير احمد سہسوانی رحمہ اللہ